حضرت مولانا محمد الیاسؒ
اور ان کی
دینی دعوت
مصنف
مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ
www.besturdubooks.wordpress.com

حضرت مولانا الیاس رحمہ اللہ

اور ان کی

دینی دعوت

مفکر اسلام

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ

طیب پبلشرز

5۔ یوسف مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

فون 042-7241778 - 0333-4394686

کتاب: حضرت مولانا الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت

مصنف: مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

اشاعت: 2009ء

طبع: حاجی حنیف اینڈ سنز

اہتمام: محبوب الرحمٰن انور

برائے: طیب پبلشرز 12- یوسف مارکیٹ

غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور

قیمت: 180/- روپے

فہرست عنوانات

پیغامبر قوم اور اس کے اصول دعوت

(از حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ)

زیر نظر کتاب (مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت) کا جب دوسرا ایڈیشن چھپ کر تیار ہوا تو اس پر مقدمہ لکھنے کے لئے حضرت سید صاحبؒ سے درخواست کی گئی۔ ذیل کا مقالہ اسی درخواست پر کتاب ھذا کے مقدمہ ہی کے طور پر لکھا گیا ہے جو افادیت کے اعتبار سے مستقل مقالہ کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ ہمارے ناظرین بالخصوص دین کی دعوت و تبلیغ کا کام کرنے والے اگر غور سے پڑھیں گے تو نہایت مفید اور بصیرت افروز ہدایت انہیں اس سے ملے گی

محمد منظور نعمانی عفی اللہ عنہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسلام ایک پیغام الٰہی اور اس پیغام کی حامل امت مسلمہ ہے، یہ وہ حقیقت ہے جس کی طرف سے نہ صرف عام مسلمانوں بلکہ مسلمان علماء و مشائخ تک نے اس سے اعراض اور تغافل برتا، اور اس حقیقت کو بالکل بھلا دیا ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ مسلمان اپنے کو انہیں معنوں میں قوم سمجھنے لگے جن معنی میں دنیا کی قومیں اپنے کو قوم سمجھتی ہیں، ان میں سے کوئی تو وطنیت کے سہارے اپنی قومیت کی دیوار کھڑی کرتا ہے، کسی نے نسل کو قومیت کا معیار سمجھا، اور ان میں سے جو کچھ سمجھتے ہیں وہ زیادہ سے زیادہ یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمان قوم، قومیت اور نسل سے نہیں، بلکہ مذہب کی بنیاد پر قوم ہے، حالانکہ حقیقت حال اس سے بھی آگے ہے، اور وہ یہ کہ مسلمان وہ جماعت ہے، جو اللہ کی طرف سے ایک خاص پیغام لے کر دنیا میں آئی ہے، اس پیغام کو قائم رکھنا اور اس کو پھیلانا اور اس کی طرف لوگوں کو دعوت دینا اس کی زندگی کا تنہا فریضہ ہے، اس پیغام کے ماننے والوں کی ایک

برادری ہے، جس کے حقوق ہیں، یہی ان کی قومیت ہے۔

اس حقیقت کے ظاہر ہونے کے بعد مسلمان قوم کا سب سے بڑا فرض اس پیغام الٰہی کی معرفت اس کی بجا آوری، اس کی تعلیم، اس کی دعوت اور اس کی اشاعت، اور اس کے حلقہ بگوشوں کی ایک پوری برادری کا قیام اور اس کے حقوق کو بجالانا ہے۔

لیکن افسوس ہے کہ مسلمانوں نے ایک صدی کے اندر اندر اپنے اس فرض کو بھلا دیا، ہمارے سلاطین اور بادشاہوں نے ملک گیری اور کشور کشائی پر قناعت کی اور عیش و آرام اور جاگیر و خرات کی دولت کو اپنی زندگی کا ماحصل قرار دیا، علماء نے درس و تدریس اور فتووں سے عزلت نشینی کی زندگی پر کفایت کی، درویشوں اور صوفیوں نے تسبیح و سجادہ کی آرائش پر بس کی، اور زندگی کے کاروبار سے اپنے کو الگ کر لیا، نتیجہ یہ ہے امت رہبری اور رہنمائی کے بغیر اپنے حال سے غافل ہو گئی، اور امت مسلمہ کی زندگی کی غرض و غایت اس کے سارے طبقوں سے گم ہو گئی۔

امت مسلمہ کا فریضہ:

قرآن پاک اور احادیث صحیحہ کے نصوص سے یہ ثابت ہے کہ امت مسلمہ اپنے نبی کی جانشین میں امم عالم کی طرف مبعوث ہے، اس امت کو باہر اسی لئے لایا گیا ہے اور وہ دعوت و تبلیغ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرض کو انجام دے، جیسا کہ یہ آیت پاک کھلے لفظوں میں ظاہر کر رہی ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ (آل عمران رکوع ۱۱)	تم اے مسلمانو! بہترین امت ہو جو لوگوں کے لئے ظاہر کی گئی ہے، اچھے کاموں کو بتاتے ہو اور برے کاموں سے روکتے ہو

اس آیت نے بتایا کہ امت مسلمہ کی دوسری امتوں کے لیے باہر لائی گئی ہے، اس کی پیدائش کی غرض بھی یہی ہے کہ وہ امم عالم کی خدمت کرے، اور ان میں خیر کی دعوت اور معروف کی اشاعت اور منکر کی ممانعت کرے، ایسی حالت میں اگر یہ امت اپنے اس فرض سے غفلت برتے تو وہ اپنی زندگی کے مقصود کو پورا کرنے سے عاری ہے، اس آیت سے چند آیتیں اوپر یہ تصریح ہے کہ ہر زمانے میں امت مسلمہ پر یہ فرض کفایہ ہے کہ اس کی کچھ جماعت اس کام میں لگی رہے، اور اگر اس سے مسلمانوں نے پہلوتہی کی تو ساری امت مسلمہ گنہگار ٹھہرے گی، اور اگر کچھ جماعتوں نے اس

فرض کو انجام دیا، تو یہ فرض پوری امت کی طرف سے ادا ہو جائے گا۔ ارشاد ہے:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَ يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ

(آل عمران ۱۱)

اور چاہیے کہ تم میں ایک جماعت ایسی رہے جو لوگوں کو نیک کی دعوت کرتی رہے اور اچھے کاموں کی تعلیم دیتی رہے اور بری باتوں سے روکتی رہے، اور یہی وہ لوگ ہیں جو فلاح پانے والے ہیں

پوری امت کی صلاح وفلاح اور دوا و معالجہ کے لئے یہی جماعت ذمہ دار ٹھہرائی گئی، اس کے تین فرض قرار دیے گئے، پوری امت بلکہ ساری انسانیت کو خیر کی دعوت، معروف کی اشاعت اور منکر کی ممانعت۔ جب تک اور جس نسبت سے امت کے اندر اس جماعت کے افراد رہے یہ فریضہ پورا ہوتا رہا، اور حدیث خیر القرون کے مطابق جماعت صحابہؓ جماعت تابعین، جماعت تبع تابعین کے بعد جماعت گھٹ کر افراد رہ گئے۔

دولت وسلطنت مقصود اول نہیں:

اس راہ میں سب سے بڑی ضلالت دولت وسلطنت کے بجائے مقصود سمجھنے سے آئی، اور حضور انور ﷺ کا یہ خیال ہے کہ:

"إِنِّيْ لَا أَخَافُ عَلَيْكُمُ الْفَقْرَ وَلٰكِنْ أَخَافُ أَنْ تُبْسَطَ عَلَيْكُمُ الدُّنْيَا"

بالکل درست نکلا، دنیا نے جب اپنی وسعتوں، عیش پرستیوں اور دولت مندیوں کے ساتھ مسلمانوں پر سایہ ڈالا، تو وہ صرف کشورستانی، ملک گیری اور باج خراج کو امت مسلمہ کی زندگی کا حاصل سمجھے اور دولت اسلام کے بجائے مسلمانوں کی سلطنت پر قانع ہو گئے، یعنی ایسی سلطنت کو اپنا مقصد سمجھ بیٹھے، جس کا حاکم کوئی مسلمان نام ہو، حالانکہ مقصد یہ تھا کہ اسلام کی شریعت اور اسلام کی سیاست عادلہ کی حکومت قائم کی جائے اور یہ سلطنت وحکومت اس نظام وعدل کے قیام کا سب سے بڑا اور سب سے قوی ذریعہ ہو۔ جیسا کہ اس آیت پاک کا منشا ہے:

اَلَّذِيْنَ إِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْأَرْضِ۔ وَ أَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وامروا بالمعروف و نهوا عن المنكر ولله عاقبة الامور

وہ لوگ جن کو ہم زمین میں طاقت بخشیں، تو نماز کھڑی کریں، اور زکوۃ دیں اور اچھی بات کا حکم

کریں، اور ہر نئی بات سے دور رہیں، اور اللہ تعالیٰ کے لئے ہے کاموں کا انجام۔

اُمت مسلمہ جانشین نبی ﷺ ہے:

امت مسلمہ فرائض نبوت میں سے دعوت خیر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں نبی ﷺ کی جانشین ہے، اس لئے رسول کریم ﷺ کو کار نبوت کے جو تین فرض عطا ہوئے ہیں: تلاوت احکام، تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیہ یہ تینوں فرض اُمت مسلمہ پر بھی بطور کفایہ عائد ہیں، چنانچہ قرناً بعد قرن اکابر ائمہ اُمت نے ان تینوں فریضوں کی ادائیگی میں پوری توجہ اور کوشش مبذول فرمائی۔ ان ہی کے مجاہدات کا نور ہے جس سے کاشانہ اسلام میں روشنی ہے، نبوت کے یہ تینوں فرض اس آیت میں یکجا ہیں:

رسولاً منهم يتلوا عليهم ايته و يزكيهم و يعلمهم الكتاب و الحكمة	ایک رسول ان ہی میں سے جو ان کو اس کی آیتوں کو پڑھ کر سناتا اور ان کو پاک صاف کرتا اور کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے

تعلیم اور تزکیہ کی یکجائی:

رسول کریم ﷺ نے ان تینوں فرائض کو بحسن خوبی انجام دیا، اور لوگوں کو احکام الٰہی اور آیات ربانی پڑھ کر سنائے اور ان کو کتاب الٰہی اور حکمت ربانی کی باتیں سکھائیں اور اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ اپنی صحبت، فیض تاثیر اور طریق تدبیر سے پاک وصاف بھی کیا، نفوس کا تزکیہ فرمایا، قلوب کے امراض کا علاج کیا، اور برائیوں اور بدیوں کے زنگ اور میل کو دور کر کے اخلاق انسانی کو نکھارا اور سنوارا، یہ دونوں ظاہری باطنی فرض یکساں اہمیت سے ادا ہوتے رہے، چنانچہ صحابہؓ اور ان کے بعد تابعین اور پھر تبع تابعین کے تین قرنوں تک یہ دونوں ظاہری و باطنی کام اسی طرح توام رہے، جو استاد تھے وہ شیخ تھے اور جو شیخ تھے وہ استاد تھے، وہ جو مسند درس کا جلوہ دیتے تھے، وہ خلوت کے شب زندہ دار اور اپنے ہم نشینوں کے تزکیہ و تصفیہ کے بھی ذمہ دار تھے۔ ان تینوں صفتوں میں استاد اور شیخ کی تفریق نظر نہیں آتی۔

تعلیم اور تزکیہ میں تفریق:

اس کے بعد وہ دور آ شروع ہوا جس میں مسند ظاہر کے درس کو باطن کے نور سے، اور باطن کے روشن دل ظاہر سے عاری ہونے لگے اور عہد بہ عہد ظاہر و باطن کی یہ خلیج بڑھتی ہی چلی گئی۔ تا آنکہ

علوم ظاہر کیلئے مدارس کی چہاردیواری اور تعلیم وتزکیہ باطن کے لئے خانقاہوں اور رباطوں کی تعمیر عمل میں آئی اور وہ مسجد نبویؐ جس میں یہ دونوں جلوے یکجا تھے، اس کی تجلیات مدرسوں اور خانقاہوں کے دو حصوں میں تقسیم ہو گئیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مدارس سے علماء دین کی جگہ علماء دنیا نکلنے لگے اور باطن کے مدعی علم شریعت کے اسرار و کمالات سے جاہل ہو کر رہ گئے۔

فلاح دونوں کی یکجائی میں ہے:

تاہم اس دور کے بعد بھی ایسی مستثنیٰ ہستیاں پیدا ہوتی رہیں جن میں نور نبوت کے یہ دونوں رنگ بھرے تھے اور غور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اسلام میں جن بزرگوں سے فیوض پہنچے اور پھیلے، وہ وہی تھے جو ان دونوں کے جامع تھے۔ امام غزالیؒ جن سے علوم معقول و منقول نے جلوہ پایا، علم حقیقت نے بھی انہیں کے ذریعہ ظہور پایا، حضرت شیخ ابو النجیب سہروردیؒ ایک طرف شیخ طریقت ہیں تو دوسری طرف مدرسہ نظامیہ کے مدرس، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ امام وقت اور شیخ طریقت دونوں ہیں، یہاں تک وہ لوگ جن کو علمائے ظاہر کہا جاتا تھا جیسے حضرات محدثین امام بخاریؒ، ابن حنبلؒ سفیان ثوریؒ وغیرہ، وہ بھی اس جامعیت سے سرفراز تھے، متوسطین میں علامہ ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم رحمہم اللہ تعالیٰ کو نا واقف باطن سے خالی سمجھتے ہیں، حالانکہ ان کے احوال و سوانح ان برکات باطنی سے لبریز ہیں۔ ابن قیمؒ کی "مدارک السالکین" وغیرہ کتابیں پڑھئے تو اندازہ ہوگا کہ وہ آرائش ظاہر اور جمال باطن دونوں سے آراستہ تھے۔

ہندوستان میں جن بزرگوں کے دم قدم سے اسلام کی روشنی پھیلی، وہ حقیقت میں وہی تھے جن کی ذات میں مدرسہ اور خانقاہ کی جامعیت تھی کہ وہ اسوۂ نبوت کے قریب تر تھے، اس لئے ان کا فیض بعید سے بعید تر حصہ تک پھیلتا چلا گیا، آسمانی دلی کے مہر و ماہ اور تارے شاہ عبدالرحیم صاحب سے لے کر شاہ اسماعیل تک کو آپ ایک ایک کر کے دیکھیں تو ظاہر و باطن کے علوم والوں کی یکجائی کا نظارہ آپ کو ہوگا، اور اس سے ان کے علمی و روحانی برکات کی وسعت کی حقیقت آشکارا ہو جائے گی۔ وہ علوم کی تدریس یعلمھم الکتاب و الحکمۃ کا جلوہ دکھاتے تھے اور حجروں میں بیٹھ کر "یزکیھم" کی جلوہ ریزی فرماتے تھے۔

پھر ان کے بعد ان کے فیوض و برکات کے جو حامل ہوئے جن کی زندگی چہرہ ان ضروری تھیں کہ "سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود" ان سے دنیا کو فیض پہنچا اور دین کی اشاعت و تبلیغ اور قلوب و نفوس کے تزکیہ اور تصفیہ کا جو کام انجام پایا وہ بھی ظاہر و باطن کی اسی

جامعیت کے آئینہ دار تھے، اور آئندہ بھی جن انہی کے مطابق دین کا فیض پہنچے گا، وہ وہی ہوں گے جن سے مدرسیت اور خانقاہیت کی دو ندیاں ایک چشمہ میں جمع ہوں گی۔

آنکھوں کا نور شب بیداری سے بڑھتا اور زبان کی تاثیر ذکر کی کثرت سے چمکتی ہے، دعوت کے داعی ہی اسلام میں دین کے سپاہی ثابت ہوئے ہیں۔ سوانح اور تراجم کا یہ مجموعہ صد سالہ تجربہ اس بات کا شاہد ہے کہ زبان کی روانی اور قلم کی جولانی دل کی تابانی کے بغیر سراب کی نمود سے زیادہ نہیں، خواہ وہ اس وقت کتنا ہی تابناک نظر آتا ہو مگر وہ مستقبل اور مستقبل بعید سے محروم ہے۔

مزاج نبوت توام ملت ہے:

اس کی ایک خاص وجہ ہے، اور وہ یہ کہ ہر قوم اور ہر ملت کا ایک مزاج ہوتا ہے، جب تک کوئی تحریک اصلاح و تجدید کا کام قوم و ملت کے مزاج کے مطابق نہ ہوگا، اس کو کامیابی و سرسبزی حاصل نہ ہو گی۔ اس وقت ملت اسلامیہ کی اصلاح و تجدید کے مدعی مختلف گروہ ہیں، ایک گروہ نے تو اس کی ضرورت سمجھی کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت و رسالت کا عہد پرانا ہو چکا، اب ایک نئی نبوت و رسالت کی ضرورت ہے، چنانچہ اس نے اس کی دعوت دی اور نیا نام دیا، اور امت محمدیہ سے ان کا رشتہ کٹ گیا، دوسرے گروہ نے نبوت و رسالت محمدی کو تو قائم رکھا، مگر دین محمدی کی تعبیر کی تغیر و تبدیلی کی ضرورت سمجھی، احادیث نبوی سے انکار کیا، قرآن پاک کی تعبیر کے لئے اپنے عقلی قیاسات و زمانہ حال کی تحقیقات کو معیار قرار دیا، گویا ایک نئے قرآن کا طالب ہے، اس جماعت کا رشتہ بھی امت محمدیہ سے کمزور پڑ گیا، اور اب ان کا نام "حسبنا کتاب اللہ" کہہ کر کتاب اللہ کی نئی تعبیر کرنا، نئی نماز، نیا روزہ، نیا طریق حج اور نئی شریعت نکالنا ہے، تیسری جماعت کتاب اللہ اور حدیث رسول ﷺ کو یاد کرتی ہے، مگر ہر آیت و حدیث کو اپنی عقل کے معیار پر پرکھنا چاہتی ہے، اور اسی لئے معجزات کی منکر، جنت و دوزخ کی حقیقت سے منحرف، ربا کے جواز کی قائل اور بہت سے ان مسائل کو جن کا زندگی سے تعلق ہے، دین شریعت کے بجائے عقل و "اصول فطرت" سے طے کرنا چاہتی ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا شمار دین محمدی کے مؤولین میں ہوا، مومنین و مخلصین میں نہیں۔

ایک نیا گروہ ہے جو نئی نبوت نہیں چاہتا، نیا قرآن نہیں، نئی نماز اور نئے روزے کا قائل نہیں، لیکن وہ ایک امامت کا خواستگار ہے، جو اسلام کا نیا نظام مرتب کرے، کفر و ایمان، نفاق اور اطاعت امیر کے نئے نقشے ابھرے، اور یورپ کی "ازم" والی تحریکوں کی طرح مسلمانوں میں ایک

نئی تحریک کا آغاز کرے، اور اس "اسلامزم" کو اسی "ازم" والے عزم و جوش وخروش سے نوجوانوں میں پھیلائے اور مسائل کلامی وفقہی کا فیصلہ ایک نئے مجتہدانہ انداز سے کرے، ممکن ہے کہ یہ گروہ اس موجودہ انقلابی دور میں نوجوانوں کے لئے تسلی وتشفی کا پیغام ثابت ہو، اور اقتصادی راہ سے ایجاد کا جو سیلاب آرہا ہے، اس کے روکنے کا کام کرے، لیکن اس کا طریق فکر اور طریق کار امت کے جمیع طبقات کے مطابق نہیں۔ و لعل اللہ یحدث بعد ذلک امراً۔

حاصل یہ ہے کہ امت محمدیہ کے مزاج کے مطابق یہ ضروری ہے کہ داعی اور دعوت اور طریق دعوت تینوں چیزیں ٹھیک ٹھیک طریق نبوت اور اسوہ نبوت کے مطابق ہوں، داعی خود بھی قلباً اور قالباً داعی اول محمد رسول اللہ ﷺ سے نسبت رکھتا ہو، جس حد تک یہ نسبت قوی ہوگی، دعوت میں تاثیر اور کشش پیدا ہوگی، پھر ضرور ہے کہ دعوت وہی ہو، یعنی خالص اسلام اور ایمان وعمل صالح کی دعوت ہو، پھر دعوت کا طریق بھی وہی اختیار کیا جائے جو داعی اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اختیار فرمایا تھا۔ جس حد تک ان تینوں امور میں عہد رسالت ونبوت کے ساتھ قرب ومناسبت جتنی زیادہ ہوگی، اتنی ہی زیادہ دعوت کی قوت میں تاثیر اور دعوت کے دائرہ میں وسعت پیدا ہوگی، اور راہ کی ضلالت سے حفاظت اور صراط مستقیم کی طرف رہبری میں اضافہ ہوگا، گزشتہ صدی کے جن داعیان امت کے تجدیدی کارناموں کو امت نے تسلیم کیا ہے، ان کی تاریخ سے بھی ان اصولوں کی سچائی ثابت ہوتی ہے۔

الغرض ضرورت یہ ہے کہ داعی اپنے علم وعمل، فکر ونظر طریق دعوت اور ذوق وحال میں انبیاء علیہم السلام اور خصوصاً محمد رسول اللہ ﷺ سے ایک خاص مناسبت رکھتا ہو۔ صحت ایمان اور ظاہری عمل صالح کے ساتھ اس کے باطنی اعمال بھی منہاج نبوت پر ہوں۔ محبت الٰہی خشیۃ الٰہی اخلاق اللہ تعلق مع اللہ کی کیفیت ہو، اخلاق وعادات وشمائل میں اتباع سنن نبوی کی کیفیت ہو، حب للہ، بغض للہ، رافت ورحمت بالمسلمین اور شفقت علی الخلق اس کی دعوت کا محرک ہو، اور انبیاء علیہم السلام کے بار بار دہرائے ہوئے اصول کے مطابق سوائے اجر الٰہی کی طلب کے کوئی مقصود نہ ہو ان اجری الا علی اللہ اور اس کی طلب کی ایسی دھن ہو، کہ جاہ ومنصب، مال ودولت، عزت وشہرت اور نام ونمود اور ذاتی آرام وآسائش کا کوئی خیال راہ میں مانع نہ ہو، اس کا بیٹھنا، بولنا چالنا غرض اس کی زندگی کی ہر جنبش وحرکت اسی سمت میں سمٹ کر رہ جائے۔ ان صلوتی و نسکی و محیای و مماتی للہ رب العلمین۔

صاحب سوانحؒ اس صحیفہ سے:

آئندہ اوراق میں جس داعیٔ حق اور دعوت حق کی تصویر کھینچی گئی ہے، میری آنکھوں نے اس کی چہرے کے خدوخال کا مشاہدہ کیا تھا۔ اس کے ظاہر و غائب کے حالات دیکھا اور ساتھ رہا، اور جن کو یہ سعادت حاصل نہیں ہوئی ان کو اوراق کے پڑھنے سے اس کی کیفیت معلوم ہو جائے گی، اور اسی ضمن میں اس کے اصول دعوت اور خود حقیقت دعوت کے سارے حالات واضح ہو جائیں گے۔

سلسلۂ ولی اللّٰہی:

ہندوستان کے آخری عہد میں اللہ تعالیٰ نے خاندان ولی اللّٰہی کو اس ملک کی تعلیمیت مرحمت فرمائی تھی، چنانچہ ہندوستان میں آل تیمور کی غلط سیاست سے دین اسلام کو جو نقصان پہنچے، ان کے تدارک اور اصلاح کی خدمت اور اس خانوادے کے علماء اور ان کے متعلقین کے سپرد ہوئی اور اس وقت آج تک یہ سلسلہ قائم ہے، اس دعوت کے مورث اول بھی اسی سلسلۃ الذہب سے مربوط ہیں۔

صاحب سوانحؒ کا سلسلۂ نسب:

صاحب سوانحؒ کے پرنانا مولانا مظفر حسین صاحبؒ حضرت شاہ محمد اسحق دہلویؒ کے عزیز شاگرد اور حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب دہلویؒ کے مجاز تھے اور مولانا مظفر حسین صاحب کے حقیقی چچا مفتی الٰہی بخشؒ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے ممتاز شاگرد اور مرید باخلاص تھے، اور پھر اپنے شیخ کے خلیفہ حضرت سید احمد شہید بریلویؒ سے بیعت ہوئے، یہ دونوں بزرگوار اپنے وقت کے نامور صاحب تدریس وفتویٰ اور صاحب زہد وتقویٰ تھے، جن کے برکات اس خاندان کے اکثر افراد میں پھیلے جس کی تفصیل اصل کتاب سے معلوم ہوگی۔

صاحب سوانحؒ کے والد اور دو بھائی صاحب زہد وورع اور صاحب ارشاد تھے، مولانا کے والد پہلے شخص ہیں جن سے اہل میوات کو خصوصی اور محبت پیدا ہوا اور پھر ان کی وفات پر ان کے بڑے بھائی مولانا محمد صاحبؒ فقر و فاقہ اور زہد و توکل کے ساتھ اس مسند ارشاد پر بیٹھے اور صاحب سوانحؒ مولانا محمد الیاس صاحبؒ اس سلسلے کے تیسرے بزرگ تھے۔

اس عہد میں تبلیغی ناکامی کے وجوہ:

1921ء کی بات ہے کہ ہندوستان میں آریوں کی کوشش سے جاہل نومسلم دیہاتی علاقوں میں ارتداد کی آگ پھیلی، اس آگ کے بجھانے کے لئے ہر چہار طرف مسلمان کھڑے ہوئے، بہت سی تبلیغی انجمنیں بنیں، ہزاروں روپے کے چندے ہوئے، مبلغین نوکر رکھے گئے، جگہ جگہ پھیلائے

گئے، مناظرین اسلام نے بحث ومناظرہ کے میدان گرم کئے اور کئی سال تک بڑے دھوم دھام سے یہ کام ہوتا۔ آخر آہستہ آہستہ جوش وخروش کم ہوتا گیا۔ ایک ایک انجمن ٹوٹتی گئی، چندوں کی کمی سے مبلغین برطرف ہوتے گئے، مناظرین کے بلاوے بھی گھٹنے لگے، اور بالآخر سمندر میں بالکل سکون ہوگیا۔

اس ناکامی کے وجوہ کیا تھے، یہ سارا تماشا کام کرنے والوں کی دلی لگن کا نتیجہ نہ تھا، اور نہ مبلغین و مناظرین وداعیان کے دلوں میں دین کی دھن تھی، بلکہ جو کچھ تھا وہ داد وستد کا مبادلہ اور نفع عاجل کی حرص وطمع تھی، اور دینی دعوت اور باطنی ارشاد وتبلیغ بازار کی قیمت سے خریدی نہیں جاتی۔

انبیاء کے اصول دعوت:

1- انبیاء علیہم السلام کے اصول دعوت کی بنیادی چیز یہی ہے کہ وہ اپنے کام کی اجرت اور مزدوری کسی مخلوق سے نہیں چاہتے۔ وما اسئلکم علیه من اجران اجری الا علی رب العلمین۔

ان کا متحدہ ومتفقہ فیصلہ ہے، انتہا یہ ہے کہ اپنے کام کی کسی بندے سے تحسین وآفرین بھی نہیں چاہتے ان کی دعوت کی کشش اور تاثیر دو قوتوں کا نتیجہ ہوتی ہے، مخلوق کے ہر اجر سے استغنا وبے نیازی اور ان کی ذاتی پاکیزہ زندگی۔ "سورہ یٰسین" میں چند داعیان حق کا ذکر ہے جس میں ایک کی تکذیب کے بعد دوسرے رسول کی آمد اور اس کی تائید کا بیان ہے، بالآخر اقصائے شہر سے ایک سعید ہستی آتی ہے اور اپنے ہم قوموں سے خطاب کر کے کہتی ہے۔

یٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِیْنَ اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا یَسْئَلُكُمْ اَجْرًا وَّ هُمْ مُّهْتَدُوْنَ	اے میرے لوگو! ان پیغمبروں کی پیروی کرو ان کی پیروی کرو جو تم سے مزدوری نہیں چاہتے، جو راہ ہدایت پائے ہوئے ہیں۔

معلوم ہوا کہ مبلغ کے لئے پاکیزگی اور خلق سے بے نیازی اور اخلاص وللہیت اس کی تاثیر کا اصل سرچشمہ ہے۔

2- ان کی تبلیغ ودعوت کا دوسرا محرک بندگان الٰہی پر رحمت وشفقت اور خیر خواہی کا جذبہ ہے۔ بندوں کی اس تباہ حالت کو دیکھ کر ان کا دل جلتا ہے، اور خیر خواہی سے ان کا دل چاہتا ہے کہ کسی طرح ان کی حالت سدھر جائے۔ ٹھیک اس طرح جس طرح باپ بیٹے کی اصلاح اور رشد وہدایت کا طالب محض پدرانہ شفقت اور خیر خواہی کی بناء پر ہوتا ہے، اسی طرح مبلغ اور داعی کے اندر بھی

امت کے غم میں یہ حال تھا کہ حضور ﷺ کو جینا بھی دوبھر معلوم ہوتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے تسلی دی اور فرمایا

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (شعراء)	کیا اس بات پر آپ اپنی جان کھو ڈالیں گے کہ یہ ایمان نہیں لاتے

یہی مضمون سورہ کہف کی ایک آیت میں بھی ہے:

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا (کہف)	تو کیا ان کے پیچھے اگر وہ ایمان نہ لائیں اس بات پر افسوس کر کے کھو ڈالیں گے

امتی محبت و رحمت کا تقاضا تھا کہ حضور اکرم ﷺ پر مسلمانوں کی ہر تکلیف شاق گزرتی تھی اور چاہتے تھے کہ ہر بھلائی اور خیر کا دروازہ ان پر کھل جائے۔ ارشاد ہوا

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (توبہ)	تمہارے پاس تمہیں میں سے ایک رسول آیا جس پر تمہاری تکلیف میں پڑنا شاق ہوتا ہے۔ تمہاری بھلائی کا حریص ہے اور ایمان والوں پر مہربان اور رحیم ہے

3- دعوت و تبلیغ کا تیسرا اصول یہ ہے کہ نرمی، سہولت، آہستگی، دانش مندی اور اچھے اسلوب سے گفتگو کی جائے کہ جس سے مخاطب پر داعی کے خلوص و محبت اور شفقت کا اثر پڑے، اور بات مخاطب کے دل میں اتر جائے۔ فرعون جیسے خدائی کے مدعی کافر کے پاس حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے اولوالعزم نبی بھیجے جاتے ہیں تو ان سے کہا جاتا ہے

فقولا له قولا لينا (طٰہٰ)	دونوں (حضرت موسیٰ و ہارون) فرعون سے نرم گفتگو کرنا

منافقین نے اسلام کو نقصان پہنچانا چاہا اور جس طرح اسلام کی دعوت اور محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت کو ناکام کرنا چاہا وہ بالکل ظاہر ہے، مگر ان کے بارے میں بھی آپ کو یہی حکم دیا جاتا ہے:

فاعرض عنهم وعظهم وقل لهم في انفسهم قولا بليغا

تو آپ ان سے درگزر کیجئے اور ان سے ان کے معاملہ میں ایسی بات کہیئے جو ان کے دل میں

اتر جائے

اس سے اندازہ ہوگا کہ جب اس قدر اہم عبادت اور دین میں تفریق کرنے والی بات کا طریق منافقوں سے برتنے کا حکم ہوتا ہے تو عام دین مسلمانوں کو بتانے اور سمجھانے کا کیا طریقہ ہونا چاہیے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے دعوت کے اس اصول کو آیت ذیل میں تفصیل سے ظاہر فرمایا ہے۔ ارشاد ہے:

ادع الی سبیل ربك بالحكمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتي هي احسن (نحل)	آپ اپنے پروردگار کی طرف لوگوں کو دانش مندی اور اچھی نصیحت کے ذریعہ سے بلائیے اور بحث مباحثہ کریں تو وہ بھی خوبی سے

آپ ﷺ نے جب یمن کی سمت دو صحابیوں کو اسلام کا داعی بنا کر بھیجا تو ان کو چلتے وقت یہ نصیحت فرمائی۔

يسروا ولا تعسروا وبشروا ولا تنفروا (صحيح بخاری)	تم لوگوں کو آسانی کی راہ بتانا، ان کو دقت میں نہ ڈالنا، انہیں خوشخبری سنانا اور نفرت نہ دلانا

دیکھنے میں تو یہ ارشاد نبویؐ دو دو لفظ کے دو فقرے ہیں مگر ان میں طریق تبلیغ کا ایک دفتر بند ہے۔ داعی اور مبلغ کو چاہیے جس جماعت کو دعوت دے اس میں آسان سے آسان طریقے سے دین کو پیش کرے، اور شروع ہی میں سختی نہ کرے، ان کو خوشخبری اور اعمال کی بشارت اور رحمت و مغفرت الٰہی کی وسعت کا تذکرہ کرے، ان کو دین کا حوصلہ دلائے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ عقائد اور فرائض میں مداہنت کی جائے، یہ تو کسی حال میں جائز نہیں۔ بلکہ یہ مقصد ہے کہ طریق کار میں سہولت بھی اور نرمی بھی برتی جائے۔ فرائض کے علاوہ دوسرے اعمال میں جو فرض کفایہ یا مستحبات ہوں یا جن کے سبب سے دین میں فتنہ پیدا ہونے کا اندیشہ ہو ان میں زیادہ سخت گیری نہ کی جائے، یا جن امور میں فقہاء و مجتہدین کی مختلف رائیں اختیاری ہیں ان میں سے کسی ایک ہی رائے کے قبول میں شدت نہ کی جائے، یا مسائل کے بیان میں جس حد تک اللہ تعالیٰ نے وسعت پیدا کر رکھی ہے اس میں عزم و تقویٰ کے لئے تنگی نہ کی جائے۔

ان امور کی مثالیں سیرت و سنن نبوی میں بکثرت ملتی ہیں چنانچہ عقائد و فرائض میں مداہنت

کرنے کی ممانعت قرآن پاک کی کئی آیتوں میں ہے، کفار اسلام کے عقائد میں کچھ نرمی چاہتے ہیں۔

ودوا لو تدھن فیدھنون (قلم)	کفار چاہتے ہیں کہ آپ کچھ نرمی کریں، تو وہ بھی نرمی کریں

مگر اس کی اجازت نہیں دی گئی۔

4۔ اس اصول کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ دعوت وتبلیغ اسلام میں الاہم فالاہم کی ترتیب مدنظر رہے آپ ﷺ نے تبلیغ شروع فرمائی تو سب سے پہلا زور صرف توحید اور رسالت پر صرف فرمایا۔ قریش پوچھتے ہیں کہ آپ ہم سے کیا چاہتے ہیں؟ فرمایا فقط ایک کلمہ (بات) اگر تم اس کو مان لو گے تو سارا عرب وعجم تمہارا زیر فرمان ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور رسول کی رسالت حقیقت میں وہ تخم ہے جس کے اندر سے سارے احکام کا برگ وبار نکلتا ہے، سب سے پہلے اسی کی تخم ریزی چاہیے۔ اس کے بعد احکام کا دور آتا ہے۔

قرآن پاک کا طریقہ نزول خود اس طریق دعوت کو صحیح مثال ہے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ قرآن میں پہلے دلوں کو نرم کرنے والی آیتیں نازل ہوئیں جن میں جنت و دوزخ کا ذکر ہے یعنی جن میں ترغیب وترہیب ہے، پھر جب لوگ اسلام کی طرف مائل ہوئے تو حلال وحرام کی آیتیں نازل ہوئیں، اور اگر پہلے یہی اترتا کہ شراب مت پیو، تو کون مانتا، اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قرآن پاک کے نزول میں بھی یہ تبلیغی ترتیب ملحوظ رہی ہے۔

طائف کا وفد جب بارہ گاہ نبویؐ میں حاضر ہوا تو اس نے اپنے اسلام لانے کی یہ شرط پیش کی کہ ان سے نماز معاف کر دی جائے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

جس دین میں اللہ کے سامنے جھکنا نہ ہو وہ کس کام کا (لا خیر فی دین لا رکوع فیہ) پھر انہوں نے یہ شرط پیش کی کہ ان سے عشر وصول نہ کیا جائے اور نہ مجاہدین کی فوج میں ان کو بھرتی کیا جائے، آپ ﷺ نے یہ دونوں شرطیں قبول کر لیں اور ارشاد فرمایا کہ: جب یہ مسلمان ہو جائیں گے تو عشر بھی دیں گے اور جہاد میں بھی شریک ہوں گے۔ محدثین لکھتے ہیں کہ نماز چونکہ فوراً واجب ہوتی ہے،...... اس لئے اس میں نرمی نہیں برتی گئی، اور جہاد کی شرکت چونکہ فرض کفایہ ہے اور کسی وقت خاص پر فرض ہوتی ہے اور زکوٰۃ اور عشر کے وجوب کے لئے چونکہ ایک سال کی مدت کی وسعت تھی اور بعد کو بھی وہ ادا ہو سکتی ہے اس لئے ان دونوں باتوں میں نرمی ظاہر فرمائی۔

اس سے تبلیغ کے حکیمانہ اصول پر پوری روشنی پڑتی ہے۔ آپ ﷺ نے جب حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن بھیجا تو ارشاد فرمایا:

"تم ایسے لوگوں میں جا رہے ہو جہاں اہل کتاب بھی ہیں، جب تم وہاں پہنچو تو ان کو سب سے پہلے یہ بتاؤ کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور یہ کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، جب وہ یہ مان لیں تو انہیں بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر دن میں پانچ وقت کی نمازیں فرض کی ہیں، جب وہ تمہاری یہ بات مان لیں تو انہیں بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر زکوٰۃ بھی فرض کی ہے جو دولت مندوں سے لی جائے اور غریبوں کو دی جائے، اور جب وہ اس کو مان لیں تو زکوٰۃ میں چن چن کر ان کے اچھے مال چھانٹ کر نہ لو، اور مظلوم کی بددعا سے بچنا کہ اس کے اور اللہ کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں۔"

اس حدیث سے بھی دعوت کی حکیمانہ ترتیب کا اظہار ہوتا ہے۔

5- تبلیغ و دعوت کے ان اصولوں میں سے جو آنحضرت ﷺ کی سیرت میں نمایاں معلوم ہوتے ہیں، ایک غرض ہے، یعنی حضور انور ﷺ اس کا انتظار نہیں فرماتے تھے کہ لوگ آپ ﷺ کی خدمت میں خود حاضر ہوں، بلکہ آپ اور آپ کے داعی لوگوں تک خود پہنچتے تھے اور حق کی دعوت دیتے تھے، یہاں تک کہ کبھی کبھی لوگوں کے گھروں تک خود پہنچ جاتے تھے، اور کلمہ حق کی دعوت پیش فرماتے تھے۔ مکہ معظمہ سے سفر کر کے طائف تشریف لے گئے اور وہاں عبد یالیل رئیسوں کے گھروں پر جا کر تبلیغ کا فرض ادا فرمایا۔ حج کے موسم میں ایک ایک قبیلہ کے پاس تشریف لے جاتے اور ان کو حق کا پیغام پہنچاتے، اور ان کے تمسخر و تند جوابوں کی پروانہ فرماتے تھے، اسی تلاش میں یثرب کے وہ سعادت مند ملے جن کے ہاتھوں سے ایمان و اسلام کی دولت مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ کو منتقل ہوئی۔

صلح حدیبیہ کے بعد جب ملک میں امن و امان اور اطمینان ہوا تو اسلام کے سفیر مصر و ایران و حبش کے بادشاہوں اور عمان و بحرین اور یمن حدود شام کے رئیسوں کے پاس اسلام کا پیغام لے کر پہنچے اور مختلف صحابہؓ نے عرب کے مختلف صوبوں اور قبیلوں میں جا کر اسلام کی تبلیغ کی، حضرت مصعب بن عمیرؓ مدینہ منورہ گئے، حضرت علیؓ اور معاذ بن جبلؓ نے یمن کا رخ کیا، یہی عمل ہر دور کے علمائے حق اور داعیان دین کا رہا۔

اس سے معلوم ہوا کہ داعی و مبلغ کا خود فرض ہے کہ وہ لوگوں تک پہنچے اور حق کا پیغام پہنچائے۔

بعض صحبوں کو خانقاہ نشینوں کے موجودہ طرز سے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ ان خاصان حق کا ہمیشہ سے یہی طریقہ رہا ہے، حالانکہ یہ سراسر غلط ہے، ان بزرگوں کی سیرتوں اور تذکروں کو کھول کر پڑھیں تو معلوم ہوگا کہ یہ کہاں کے رہنے والے تھے، فیض کہاں پایا، اور جو پایا اس کو کہاں کہاں پہنچایا اور کہاں جا کر زیر زمین آرام کیا، اور یہ اس وقت کیا جب دنیا ریلوں، لاریوں، موٹروں اور سفر کے دوسرے سامان راحت سے محروم تھی، معین الدین چشتیؒ سیستان میں پیدا ہوئے، چشت واقع افغانستان میں دولت پائی اور راجپوتانہ کے کفرستان میں آکر حق کی روشنی پھیلائی، فرید شکر گنج سندھ کے کناروں سے دہلی تک اور دہلی سے پنجاب تک آئے گئے اور ان کے مریدوں در مریدوں میں حضرت نظام الدین سلطان الاولیاءؒ اور پھر ان کے خلفاء کے احوال اور ان کے سفر کے مقامات اور مزارات کی جانچ تو کیجئے کہ وہ کہاں کہاں ہیں، کوئی دکن میں، کوئی مالوہ میں ہے، کوئی بنگال میں ہے، کوئی صوبجات متحدہ میں ہے۔

۵۔ اسلامی دعوت و تبلیغ کا ایک بڑا اصول نفیر ہے، یعنی دین کی طلب اور تبلیغ کے لئے ترک وطن کر کے ایسے مقامات پر جانا جہاں دین حاصل ہو سکے اور پھر وہاں سے لوٹ کر اپنے وطن میں آکر اپنے قبیلوں اور ہم قوموں کو اس فیض سے مستفید کرنا، سورہ نساء کی حسب ذیل آیت اگرچہ اپنے شان نزول کے لحاظ سے جنگ کے موقع کی ہے۔ مگر الفاظ کے عموم کی بنا پر اس نفیر کو شامل ہے جو کسی کار خیر کے لئے کیا جائے جیسے کہ قاضی بیضاوی نے بھی اپنی تفسیر میں اسی طرف اشارہ کیا ہے۔

يا ايها الذين امنوا خذوا حذركم فانفروا ثبات او انفروا جميعا (نساء)

اے ایمان والو! اپنا بچاؤ کرو اور الگ الگ یا اکٹھا ہو کر گھروں سے نکلو

ایک دوسری آیت میں اسی مفہوم کی صراحت کی گئی ہے۔

وما كان المومنون لينفروا كافة فلولا نفر من كل فرقة منهم ليتفقهوا في الدين ولينذروا قومهم يحذرون (براءة)

یہ تو نہیں ہو سکتا کہ سارے مسلمان گھروں سے نکلیں، تو کیوں ہر گروہ سے کچھ لوگ اس غرض سے اپنے گھروں سے نہیں نکلتے کہ وہ دین کا علم حاصل کریں اور جب وہ اپنے گھر لوٹ کر آئیں تو اپنے لوگوں کو اللہ سے ڈرائیں، تاکہ وہ بھی برائیوں سے بچتے رہیں۔

عہد نبوی ﷺ میں اسی طرح وفود بن بن کر الگ الگ قبیلوں سے لوگ مدینہ منورہ آتے، اور رفتہ

مقدمہ

(از محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ)

۵ ذیقعدہ ۱۳۵۸ھ (دسمبر ۱۹۳۹ء) کا ذکر ہے کہ تین دوست اپنی اپنی جگہ سے چل کر سہارنپور میں جمع ہوئے تاکہ چند دینی مرکزوں کو دیکھیں، اور وہاں جو کچھ دینی اصلاح کا کام ہو رہا ہے، اس کو دیکھ کر خود اپنے متعلق بھی فیصلہ کریں۔

ان مرکزوں کی مختصر سی فہرست میں ایک نظام الدین کا تبلیغی مرکز بھی تھا جس کو اس سفر کے آخر میں رکھا گیا تھا۔

دوستوں کے اس مختصر سے قافلے میں (جس کو شاید ’’دینی طلب‘‘ کہنا بے محل ہوگا) یہ راقم حروف اس مرکز کے روح رواں حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ سے سب سے زیادہ واقفیت رکھتا تھا، اور یاد آتا ہے کہ رفقاء میں مولانا کی اس سیرت کے مولف (مولانا سید ابوالحسن علی صاحب) کو اس مرکز میں حاضر ہونے اور مولانا سے ملنے کا ہم سب سے زیادہ اشتیاق تھا۔

میری واقفیت کی بنیاد تو یہ تھی کہ اجمالی طور پر اس سلسلے کے تمام اکابر سے میں واقفیت رکھتا ہوں، دیوبند میں طالب علمانہ قیام ہی کے زمانے سے اس جماعت کے ساتھ جو ذہنی و فکری رابطہ اور عقیدت و محبت کی جو دولت مجھے نصیب رہی اس کی بنیاد پر اس حلقہ کی کوئی ممتاز شخصیت میرے لئے بیگانہ نہ تھی، اس کے علاوہ دیوبند کے ایک ’’تبلیغی جلسہ‘‘ میں مجھے شرکت اور حاضری کا اتفاق بھی ہو چکا تھا جس میں حضرت مولانا مرحوم بھی تشریف رکھتے تھے۔

لیکن مجھے اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ میری واقفیت مولاناؒ سے بالکل سطحی اور سرسری تھی، میں ان کو بس ایک مخلص بزرگ اور متقی عالم سمجھتا تھا، جو خلوص کے ساتھ تبلیغ کا کام کر رہے ہیں اور تبلیغ کا خاکہ میرے ذہن میں بس یہ تھا کہ وہ جاہل و غافل دیہاتی مسلمانوں کو کلمہ سکھاتے اور نماز روزہ پر لگاتے ہیں۔ جزاہ اللہ خیراً۔

میرا اب خیال ہوتا ہے کہ ایسی ادھوری اور سطحی واقفیت اکثر استفادہ سے مانع اور اچھے خاص

حجاب ثابت ہوتی ہے۔ آدمی سمجھتا ہے کہ میں تو واقف ہوں، لیکن اس ادھوری واقفیت اور اس سے پیدا شدہ تصور کی وجہ سے اس کے دل میں وہ اشتیاق اور طلب کا وہ جوش پیدا نہیں ہوتا جو اس ناواقف کے دل میں ہوتا ہے جو تحقیق و تلاش کے لئے نکلا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اپنے زمانہ کے اکابر اور اپنے شہر کی عظیم المرتبت ہستیوں سے اکثر قریب کے لوگوں کی محرومی کا سبب شاید زیادہ تر یہی رہا ہے۔

ہمارے دوست (مولف سوانح) مولاناؒ سے صرف اس تقریب سے واقف تھے کہ ان کے والد کے دوست (منشی محمد خلیل صاحب) نے ایک آدھ بار ان کے سامنے مولانا کا تذکرہ کیا تھا، اور کہا کہ اپنے ایک سفر میں (جو مولانا سید سلیمان صاحب ندوی کی ہمراہی میں ہوا تھا) ایک مجلس میں ایک واقف کار نے مولاناؒ کی تبلیغی سرگرمیوں کا ذکر کیا تھا، اس کے بعد انہوں نے مولانا کی دینی دعوت کے متعلق سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کا ایک مضمون پڑھا تھا جو موصوف نے میوات کے ایک مختصر سے سفر سے متاثر ہو کر "ایک اہم دینی تحریک" کے عنوان سے اپنے رسالہ "ترجمان القرآن" (بابت ماہ شعبان 58ھ) میں لکھا تھا۔

وہ مجھ سے مولاناؒ کے متعلق پوچھتے تھے اور میں جتنا کچھ جانتا تھا بتلاتا تھا۔ وہ اس خیال سے کہ پہلے وہ کوئی ایسا تصور قائم نہ کرلیں جس کو نہ پاکر انہیں مایوسی ہو، میں یہ ضرور کہتا تھا کہ مولانا کی زبان میں ایک طرح کی لکنت ہے اور وہ بعض اوقات اپنا مدعا بھی پورے طور پر ظاہر نہیں کر پاتے۔

اللہ کا کرنا کہ دہلی پہنچ کر یہ عاجز ایک شدید ضرورت اور عجلت کی بناء پر ان دونوں رفیقوں کو چھوڑ کر بریلی آگیا، اور مولف کتاب اور ان کے بھانجے سعد اور میرے بھانجے اسعد دوست مولوی عبدالواحد صاحب ایم اے نظام الدین اور وہاں سے میوات گئے اور وہاں سے واپسی پر مولانا کی ملاقات سے مشرف ہوئے، جس کی مفصل روئداد مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کے قلم سے ذی الحجہ 1358ھ کے الفرقان میں "ایک ہفتہ چند دینی مرکزوں میں" کے عنوان سے شائع ہو چکی ہے۔

اس کے بعد مولانا سید ابوالحسن صاحب کے خطوط سے معلوم ہوتا رہا کہ وہ مولانا کے پاس جاتے رہتے ہیں اور ان کا تاثر مولانا کی دینی دعوت سے اور ان کی مناسبت مولانا کے ارشادات سے بڑھ رہی ہے، یہاں تک کہ مجھے بھی ان کی معیت میں مولانا کی خدمت میں حاضر ہونے کے مواقع حاصل ہوئے۔ اس سلسلہ کے واقعات و تاثرات وقتاً فوقتاً "الفرقان" میں شائع ہوتے رہے

ہیں، اور اس وقت ان کی تفصیل مقصود نہیں۔

یہاں صرف یہ کہنا کہ مولانا کے یہاں جب بار بار حاضری ہوئی اور بعض سفروں میں یکسوئی کے ساتھ حاضر خدمت رہنے اور ان کے ارشادات کو تفصیل سے سننے کا موقع ملا تو قلب و دماغ پر دو اثر ہوئے۔

ایک تو یہ کہ مولانا کی دعوت بڑی عمیق اور اصولی دعوت ہے اور جو محض غلبہ حال کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت و توفیق کے ساتھ اصول دین میں بہت گہرے غور و تدبر، قرآن و حدیث کے عمیق مطالعہ و تفکر، دین کے مزاج و طبیعت سے واقفیت اور صحابہ کرامؓ اور قرن اول کے طرز زندگی کے وسیع اور گہرے علم پر مبنی ہے اور وہ چند منتشر اور غیر مربوط اجزاء کا نام نہیں ہے۔ بلکہ مولانا کے ذہن میں اس کا ایک مرتب خاکہ ہے، البتہ اس کے لئے ان کے نزدیک ترتیب و تدریج بہت ضروری ہے۔

اس حقیقت کے انکشاف کے بعد قلب میں شدت کے ساتھ اس کا تقاضا پیدا ہوا کہ یہ چیزیں کاغذ پر بھی مرتب شکل میں آجائیں اور اس دعوت کے اصول و مبادی اور طریق کار اور اس کی ذہنی اساس اور دینی بنیاد اہل علم کے لئے اس زمانہ کی زبان اور علمی پیرایہ بیان میں سامنے آجائے۔

رجب ۶۲ھ میں مولانا لکھنؤ تشریف لے گئے اور خاکسار راقم کو بھی آپ کی معیت میں کئی روز رہنے کی سعادت، اور کبھی کبھی ترجمانی کی عزت بھی حاصل ہوئی۔ ہمارے دوست مولف کتاب نے ایک مجلس میں مولانا کی ترجمانی کا فرض ادا کیا اور آپ کی اس دینی دعوت کے جن نہایت عمیق اور طاقتور پہلوؤں کو سرسری نظر سے دیکھنے والے نہیں سمجھ سکتے، مولانا ابوالحسن علی نے اپنی اس تقریر میں ان کو ایسی مفکرانہ ترتیب کے ساتھ اس قدر دل نشین انداز میں اس وقت پیش کیا کہ خود راقم سطور کے لئے بھی اس تحریک کے متعلق علم کا ایک نیا دروازہ کھل گیا۔ چنانچہ خاکسار نے اسی وقت بہ اصرار ان سے کہا کہ آپ تمام کام چھوڑ کر اس تقریر کو قلمبند کر لیں، یا اس کو تحریری شکل میں از سر نو مرتب کریں، یہ آپ پر اس دعوت کا سب سے بڑا حق اور بڑی ذمہ داری ہے۔ مولانا نے بھی میری فرمائش کی تائید کی، اور غالباً اسی سے متاثر ہو کر مولف نے وہ رسالہ مرتب کیا جو ایک ''اہم دینی دعوت یا مسلمانوں کی عمومی تعلیم و تربیت کا نظام'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

اس کے بعد راقم الحروف نے حضرت مولانا کی علالت کے زمانہ میں ہی حضرت ہی کے ارشادات سے اخذ کر کے ''بصیرت دین و اصلاح مسلمین کی ایک کوشش'' کے عنوان سے ایک مقالہ

مرتب کیا اور اس میں ایک خاص عنوان سے اس دعوت کی ترجمانی اور توضیح کی کوشش کی، اس طرح جہاں تک دعوت کے اصول و اساس کا تعلق ہے اگرچہ کوئی تحریر کسی انسان کی قائم مقام نہیں ہو سکتی، مگر اس سلسلہ میں دل پر اب اتنا بوجھ نہیں رہا، اور کسی حد تک اس کا اطمینان ہو گیا کہ دل و دماغ کی امانت کاغذ کے سپرد کر دی گئی ہے اور اگرچہ کاغذ بہت ضعیف ہے مگر اس کے امین ہونے میں شک نہیں۔

قلب پر دوسرا اثر مولانا کی شخصیت کا تھا، ہماری آمد و رفت، سفر و حضر کی رفاقت اور ذاتی واقفیت جتنی بڑھتی گئی، مولانا کی شخصیت کا اثر بھی ہمارے اوپر بڑھتا گیا، ہم اور ہمارے بعض دوسرے صاحب بصیرت احباب اس بارے میں ہم خیال و یک زبان تھے، کہ اس زمانے میں ایسی شخصیت اللہ تعالیٰ کی قدرت کی ایک نشانی اور رسول اللہ ﷺ کا ایک معجزہ ہے۔ جس کو دین کے موثر اور زندہ جاوید ہونے کے ثبوت کے طور پر اور صحابہ کرام کے عشق اور خیر القرون کے دینی جنون و بیقراری اور اس دور کی خصوصیات کا ایک اندازہ کرنے کے لئے اس زمانہ میں ظاہر کیا گیا ہے۔

انسان کی فطرت ہے کہ جب وہ اس طرح کی کسی غیر معمولی شخصیت کو دیکھتا اور اس سے متاثر ہوتا ہے تو چاہتا ہے کہ اس کے دوست احباب بھی دیکھیں اور نعمت و سعادت میں اپنا اپنا حصہ لیں، اس لئے طبعی طور پر ہمارا بھی جی چاہتا تھا کہ ہمارے احباب اور معاصر اس ہستی کو دیکھیں جو قرون اولیٰ کے خزانہ عامرہ کا ایک بچا کچھا موتی ہے، لیکن کسی کو کسی پر اختیار نہیں، بہت سے احباب جو بآسانی پہنچ سکتے تھے اور جن کی نظر دور رس اور حقیقت شناس تھی، اور جو اپنی مناسبت اور صلاحیتوں کی بناء پر یا کسی دوسری وجہ سے ان کی زندگی میں نہ آسکے اور ان کو ان کی خصوصیات و امتیازات کے ادراک اور ان کی دعوت کو اچھی طرح سمجھ سکنے کا موقع نہ مل سکا۔

ہم آپس میں اکثر تذکرہ کرتے تھے کہ اگر ہم مولانا کے حالات کسی کے سامنے بیان کریں، تو وہ مبالغہ پر محمول کرے گا اور دیکھنے والا ہمارے بیان کی تقصیر اور کوتاہی سمجھے گا، واقعہ یہ ہے کہ الفاظ کی بڑی سے بڑی مقدار ذاتی مطالعہ اور عینی مشاہدہ کے قائم مقام نہیں ہو سکتی، الفاظ یا تو آگے بڑھ جاتے ہیں یا پیچھے رہ جاتے ہیں، کاغذی لباس جو بھی تیار کیا جائے گا وہ جسم پر پورے طور پر راست نہیں آئے گا، یا ڈھیلا رہے گا یا تنگ، اگر کوئی چیز کسی کا کچھ صحیح تصور قائم کرا سکتی ہے اور اس کو کسی حد تک اس کی صحیح شکل میں پیش کر سکتی ہے، تو وہ صرف واقعات یا اس کی اپنی تحریریں (خصوصاً خطوط) اور اس کی روزمرہ بے تکلف گفتگو ہے۔

مولانا کے ساتھ رہنے اور ان کو قریب سے دیکھنے سے ہم پر ایک علمی نکتہ یہ منکشف ہوا کہ بزرگان دین اور اکابر سلف کے جو حالات کتابوں میں جمع کئے گئے ہیں ان میں خواہ کتنے ہی استقصاء سے کام لیا گیا ہو، وہ ان کی شخصیت اور ان کے اصلی کمالات سے کوئی نسبت نہیں رکھتے، اور واقعات کا بھی وہ بہت تھوڑا سا حصہ ہوتے ہیں جن میں مولف وسوانح نگار کی نظر انتخاب اور اس کے ذوق کو بڑا دخل ہوتا ہے، اور بعض مرتبہ تو جس شخص کی وہ سیرت ہوتی ہے اس سے زائد خود سوانح نگار کی اپنی سوانح اور اس کا ذہنی مرقع ہوتی ہے۔

پھر کیفیات وجذبات اور شیوں اداکیں ہیں، قلم سے جن کی تصویر کشی محال ہے، شاعر نے سچ کہا ہے۔

گر مصور صورت اں دلستاں خواہد کشید
حیرتے دارم کہ نازش راچساں خواہد کشید

اور غریب سوانح نگار کرے بھی کیا، بہت سی کیفیات وحقائق کے لئے شاعری کی لطیف اور بلیغ زبان میں بھی لفظ نہیں۔

بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

ہمیں بعض زندہ ہستیوں کے ساتھ رہنے ہی سے معلوم ہوا کہ اگرچہ محدثین کرام اور اہل سیرت سے زیادہ کسی نے امانت نقل اور استقصاء سے کام نہیں لیا، لیکن وہ بہر حال اتنا ہی بیان کر سکے جتنا الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

پھر بھی کوئی شبہ نہیں کہ تاریخ اور کتب سوانح نے جو کچھ محفوظ کر دیا، اور ہم تک پہنچا دیا، حافظہ اور زبانی نقل وروایت کے سلسلے اس کا ایک حصہ بھی پہنچا سکتے، اور جن لوگوں کے لئے اس کا کوئی اہتمام نہیں ہوا، اکثر ان کے نام کے سوا دنیا میں کچھ باقی نہیں۔

مولانا کی سیرت وسوانح کے سلسلے میں ہم عرصے تک متامل رہے، مولانا اس کی ہمیشہ تاکید فرماتے رہے کہ ان کی دعوت کو ان کی شخصیت کے ساتھ وابستہ نہ کیا جائے، وہ کسی طرح اس کے روادار نہ تھے کہ ان کی شخصیت کی طرف دعوت دی جائے اور آخر میں اس کو بھی پسند نہیں کرتے تھے کہ دعوت کے تعارف کے سلسلے میں ان کا نام بھی لیا جائے، یہ احتیاط، تواضع، بے نفسی اور اخلاص کے علاوہ اہم دینی مصالح پرمبنی تھی، لیکن اس کام کے داعیوں اور کارکنوں کو (جن میں مولف کتاب وحقدمہ نگار بھی ہیں) اس کا اقرار ہے کہ اس میں کامیابی نہ ہو سکی۔ اکثر دعوت کے

مصالح کا اقتضاء ہوتا تھا کہ اس کے داعی اول کا ذکر کیا جائے، جو کہ ان لوگوں میں جو ان کی شخصیت، اخلاص اور للہیت سے واقف ہیں، اس دعوت کی طرف سے اعتماد اور حسن ظن پیدا ہو، پھر دعوت کے اصول کی تشریح و تفصیل اور اس کے نتائج کے ظہور کے سلسلے میں خود اس کے داعی کے ذاتی تجربات اور اس دعوت کے ان منازل ارتقا کا ذکر ضروری ہوتا تھا جن سے یہ دعوت گزری ہے اور اس سلسلہ میں مولانا کا نام اور ان کی مساعی کا ذکر بالضرور زبان پر آجاتا تھا، اور وہ اکثر اوقات مفید ہوتا تھا۔

خاکسار راقم کو اچھی طرح یاد ہے کہ ایک مرتبہ دہلی میں ایک صاحب علم و صاحب قلم دوست سے نظام الدین جاتے ہوئے پورے راستہ شکایت کر رہے تھے وہ اس دعوت کی دینی اہمیت اور عظمت کا اظہار کرتے ان کو اس کی طرف متوجہ کر رہے تھے اس ضمن میں جب مولانا کی بلند شخصیت، روحانیت اور ان کے متعلق بعض نامور معاصرین کی رائے سنائی گئی تو ہم نے صاف محسوس کیا کہ دعوت کا وزن ان کی نگاہ میں کہیں سے کہیں پہنچ گیا، اور ان کے لئے کوئی چیز اس سے زیادہ موثر ثابت نہیں ہوئی۔

بعض انہی تجربات اور دوسرے دینی مصالح کے پیش نظر مولانا کی بابرکت حیات کے دوران میں اس عاجز کو بار بار خیال ہوا کہ مولانا کی سیرت کی ترتیب اور اس دعوت کی مفصل تاریخ بہت ضروری ہے۔ مولانا سید ابوالحسن علی صاحب کا مولانا کی علالت کے آخر زمانہ میں دہلی قیام تھا۔ میں نے ان سے اپنا خیال ظاہر کیا تو معلوم ہوا کہ وہ خود اس خیال سے فارغ نہیں ہیں، اور کچھ چیزیں انہوں نے نوٹ کرنی شروع کر دی ہیں۔ اسی اثنا میں مولانا کی وفات کا حادثہ پیش آیا، اور اس تجویز میں جان پڑ گئی۔

مولانا کی آخری خدمت و زیارت کے لئے تقریباً تمام پرانے کام کرنے والے اور بیعت یافتہ، نیز خاندان کے بزرگ اور اعزا جمع تھے، اور عنقریب یہ مجمع بکھرنے والا تھا، اور کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ جماعت بعض پھر کبھی ایک جگہ جمع ہو سکے۔ علی صاحب نے اس موقع سے پورا فائدہ اٹھایا۔ مولانا کے باخبر اعزہ اور قدیم رفقاء سے ضروری معلومات جمع کئے جن کے بغیر کوئی سوانح مرتب نہیں ہو سکتی، ان سے سوالات کر کے بہت سی کارآمد باتیں اور جزئیات فراہم کیں، تاریخیں معلوم کیے اور دعوت کے مختلف مراحل و مدارج کو منضبط کیا۔

اس کے علاوہ پرانے خطوط کا ایک قیمتی ذخیرہ قدیم خادمین سے اپنے ساتھ لے گئے، جن سے

سیرت و سوانح کے بعض ضروری خلا پر کئے۔ دعوت کے مبادی و اصول کے متعلق خطوط کا سب سے قیمتی سرمایہ خود ان کے پاس موجود تھا۔ مولانا نے دعوت اور اپنے پیام کی تشریح میں (ہمارے علم میں) سب سے زیادہ اور مفصل خطوط خود مولف کتاب کو لکھے تھے جس سے انہوں نے پورا فائدہ اٹھایا۔ بعض دوسرے دوستوں نے بھی یہ سن کر کہ مولانا کی سیرت کی تالیف کا کام ہو رہا ہے، اپنے خطوط ان کے پاس بھیج دیئے جو بہت کارآمد ثابت ہوئے۔

سب سے بڑی اور سب سے قیمتی مدد اس سلسلہ میں شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہ سے ملی۔ آپ نے بڑی جانفشانی اور بڑی تحقیق و تلاش سے معلومات فراہم کئے۔ بعض مرتبہ ایک سنہ اور تاریخ کی تحقیق میں کئی کئی دن اور کئی راتیں صرف ہوئیں۔ اپنے روزنامچہ اور پرانے کاغذات اور تحریروں سے یہ کھوئی ہوئی چیزیں برآمد کیں اور اس طرح کتاب کی تکمیل کی۔ آخر میں (کتاب کی دوسری طباعت کے وقت) مولانا کے خطوط کا ایک بہت بڑا ذخیرہ آپ کی توجہ اور کرم سے ہاتھ آیا۔ (اس ذخیرے کے قریباً 70،80 اقتباسات اس اشاعت کا قیمتی اضافہ ہیں جس سے کتاب میں نئی روح اور نئی طاقت پیدا ہو گئی ہے۔

اس طرح اول سے آخر تک اللہ تعالیٰ نے اس کام میں بڑی مدد فرمائی اور ہماری ابتدائی توقع سے بڑھ کر مواد فراہم ہو گیا۔

مسودہ کی تکمیل کر لینے کے لئے یہ مناسب معلوم ہوا کہ خصوصی واقف کار اور بعض رفیقوں کے سامنے یہ کتاب گزر جائے تاکہ واقعات کی صحت اور بیانات کی پختگی کے متعلق پورا اطمینان ہو جائے چنانچہ دسمبر 1944ء میں میوات کے ایک سفر میں کئی مجلسوں میں یہ کتاب سنی گئی اور کتاب کی مزید تنقیح کی گئی۔

ہمارے دوستوں میں مولف کتاب کو بزرگوں اور دینی شخصیتوں کی سیرت نگاری اور دینی و اصلاحی تحریکات کی تاریخ نویسی سے خاص مناسبت ہے، اور اس کا خاص ذوق اللہ نے ان کو بخشا ہے، اس سلسلہ میں "مستقل کتاب کی شکل میں" "سیرت سید احمد شہیدؒ" ان کا پہلا نقش تھا، اور مولانا محمد الیاسؒ کی یہ سوانح نقش ثانی ہے۔

اہل دین و اہل علم کی سوانح نگاری اور تذکرہ نویسی مولف کتاب کی آبائی سعادت ہے اور یہ موضوع ان کے لئے بہت سے لوگوں سے زیادہ محبوب و دلچسپ اور سہل ہے، مولف کتاب کے دادا مولانا حکیم سید فخر الدین صاحبؒ فارسی کے ایک جلیل القدر مورخ اور ادیب تھے، جن کے دوال

اور "میاں قمر کی یادگار" "مہرجہاں تاب" (قلمی) (فارسی کا انسائیکلو پیڈیا (جس کی پہلی جلد فل سکیپ سائز کے تیرہ سو صفحات میں تمام ہوئی ہے) اور "سیرۃ السادات" اور "تذکرہ مصنفین" جیسی کتابیں ہیں۔

مؤلف کے والد نامدار مولانا سید عبدالحئی صاحب سابق ناظم ندوۃ العلماء، ہندوستان کے ابن خلکان اور ابن الندیم تھے جو "نزہۃ الخواطر" (عربی) کی آٹھ جلیل القدر تصنیف کے مصنف ہیں جو ہندوستان کے مسلمان مشاہیر و اعیان علماء و مشائخ اور اہل علم و تصنیف کا آٹھ جلدوں میں سب سے مبسوط تذکرہ ہے۔

اس آبائی مناسبت اور خود اپنے تقریبے اور ذوق کے علاوہ انہوں نے امیر المؤمنین حضرت سید احمد شہیدؒ (مکتوبات امام ربانی کے سلسلے میں) حضرت مجدد الف ثانیؒ کی سیرت، تعلیم اور اصلاح و تجدید کا گہرا مطالعہ کیا ہے، اس لئے اس دعوت کے بہت سے گوشوں اور اس کے بہت سے محاسن و خصوصیات سمجھنے میں ان کو مقابلتہً آسانی ہوئی اور اس مصنف میں ان کا اعتراف اہمیت سے خالی نہیں۔

ان خصوصیات کے علاوہ خوش نصیب مؤلف کو اللہ کی بخشی ہوئی کچھ اور خاص صلاحیتیں بھی حاصل ہیں، جن کا جوہر غالباً ان کی فطرت میں پہلے سے موجود تھا، لیکن ان کا نشوونما میرے خیال میں مولانا محمد الیاسؒ کے یہاں آمد و رفت اور ان کے ساتھ قلبی تعلق ہی سے ہوا ہے، اور ان کی اندرونی خصوصیات نے حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت کی معرفت کو ان کے لئے زیادہ آسان کیا، جس کا اندازہ ناظرین کو انشاء اللہ اس سیرت کے مطالعہ سے ہو سکے گا۔

مقدمہ نگار ناظرین سے رخصت ہونے سے پہلے مختصر چند باتیں اور بھی عرض کرنا ضروری سمجھتا ہے:

(الف) مؤلف کتاب اپنی خاص صلاحیتوں اور خصوصیتوں کی وجہ سے اگرچہ یقیناً اس محنت میں یقیناً بہت زیادہ کامیاب ہوئے ہیں، اور بلاشبہ اگر کوئی دوسرا اس کام کو کرتا تو میرے خیال میں وہ ہرگز اس درجہ میں کامیاب نہ ہو سکتا، تاہم یہ حقیقت ہے کہ جنہوں نے صاحب سوانحؒ کو قریب سے اور غور سے نہیں دیکھا وہ اس کتاب سے جو کچھ اندازہ کریں گے وہ اصلیت اور حقیقت سے بہت کم ہوگا، خود راقم سطور کو بھی زیادہ قریب سے اور زیادہ غور سے مولانا مرحوم کو دیکھنے کا موقع ان کی آخری علالت ہی میں ملا، اور یہ واقعہ ہے کہ ہر اگلے دن یہ محسوس ہوتا تھا کہ کل ہم نے مولانا

کے متعلق جو کچھ لکھا تھا مولانا اس سے بھی بہت بلند ہیں۔

عصر حاضر کے ایک بڑے عارف بلکہ یقین و معرفت کے یک امام نے حضرت مولانا کی وفات سے تقریباً ساڑھے چار مہینے پہلے ایک موقع پر ارشاد فرمایا تھا کہ: یہ (مولانا) آج کل ہزاروں میل روزانہ کی رفتار سے جا رہے ہیں، اس وقت تو میں ان الفاظ کا مطلب کچھ نہیں سمجھ سکا، لیکن بعد میں حضرت کے احوال کے مطالعے سے کچھ سمجھ میں آیا کہ وہ ان کا اشارہ کس ارتقائی پرواز کی طرف تھا

مولانا مرحوم اپنی دعوت و تحریک کے متعلق کبھی کبھی فرمایا کرتے تھے کہ "یہ قرنِ اول کا ہیرا ہے"، مگر مجھے یہ کہتے ہیں کوئی مبالغہ محسوس نہیں ہوتا کہ مولانا خود اس چودہویں صدی میں قرنِ اول کے خزانے کا ایک موتی تھے، بعض سلف کے متعلق بہت سی چیزیں ہم کتابوں میں ایسی پڑھتے ہیں جن کو باور کرنے میں ہماری مادیت سے مغلوب طبیعتوں پر بڑا بوجھ پڑتا ہے، لیکن مولانا مرحوم کے اندر اس قسم کی چیزیں آنکھوں سے دیکھ کر مجھ کو ایسا انشراح اور اطمینان نصیب ہوا جو شاید صد ہا دلیلوں سے نصیب نہ ہوتا۔ روم کے عارف نے ایسوں ہی کے حق میں کہا ہے۔

اے لقائے تو جوابِ ہر سوال
مشکل از تو حل شود بے قیل و قال

(ب) مولانا مرحوم پر ان کے بعض اکابر خاندان کے کچھ ایسے احوال بھی اس کتاب میں ناظرین کرام ملاحظہ فرمائیں گے، جن کو آج کل کی شکی ذہنیں اور کوتاہ نظر شاید بعید از عقل و قیاس سمجھیں، لیکن اس قسم کے جو احوال و واقعات اس کتاب میں مؤلف نے درج کئے ہیں یہ عموماً وہی ہیں جو موجبِ یقین و اطمینان ذرائع علم سے معلوم ہوئے ہیں۔

(ج) یہ حقیقت بھی ناظرین کرام کے پیشِ نظر رہنی چاہیئے کہ مؤلف کتاب کسی قدر تفصیل کے ساتھ مولانا مرحوم کی زندگی کے صرف وہی واقعات و سوانح لکھ سکے ہیں جو کبھی کسی سفر میں ہمرکابی یا نظام الدین کی حاضری کے موقع پر خود ان کے سامنے پیش آئے، اسی بنیاد پر آخری مرض کے اخیر ایام کے حالات اور سفر لکھنؤ کے واقعات وہ اچھی خاصی تفصیل سے لکھ سکے ہیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ مولانا مرحوم کی زندگی کا بڑا حصہ ایسے ہی گزرا ہے، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر مؤلف کتاب کو اس پورے زمانے میں رفاقت حاصل رہی ہوتی تو کتاب کی ضخامت کتنی ہوتی اور اس قسم کے واقعات و معلومات کا کس قدر مفید اور قیمتی مواد اس میں ہوتا۔ تاہم جو کچھ اس میں آگیا ہے، غور و فکر اور اللہ کی دی ہوئی بصیرت سے کام لینے والوں کے لئے بہت کچھ ہے۔

(د) جیسا کہ ناظرین کرام کو کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوگا، یہ کتاب صاحب سوانح کی شخصیت کے تعارف سے زیادہ ان کی دعوت کی توضیح اور تفصیل پر مشتمل ہے، اور ایسا ہونا ناگزیر بھی تھا، کیونکہ جب کسی ایسے شخص کی سوانح لکھی جائے گی جس نے اپنی شخصیت کو اپنی دعوت میں اس طرح فنا کردیا ہو تو لامحالہ وہ شخصی احوال سے زیادہ دعوت کے متعلقات پر مشتمل ہوگی نیز مولف کا اصلی اور اولین مقصد بھی اس محنت و کاوش سے یہی ہے کہ ہمارے ناظرین کی دنیا مولانا مرحوم کی تجدیدی دعوت اور اس کے حیات بخش پیغام سے آشنا ہو۔

مقدمہ نگار نے ناظرین کا بہت وقت لیا، لیکن کتاب و صاحب کتاب کے متعلق یہ چند ضروری تھے، مقدمہ نگار درمیان سے ہٹا جاتا ہے، کتاب آپ کے سامنے ہے، لیکن یہ کتاب صرف پڑھ کر رکھ دینے کی نہیں، یہ سراپا دعوت ہے، ناظرین اگر سامعین بن جائیں تو سروش غیب کی آواز کانوں میں آئے گی۔

گوئے توفیق و سعادت در میاں افگندہ اند
کس بمیداں در نمی آید سواراں راچہ شد

یہ خاتمہ دینی جدوجہد کے ایک نئے دور کا آغاز ہے کہ صدیوں کا چھوٹا ہوا ہے، جو لوگ ہمت کر کے آگے بڑھیں گے، ان کی سعادت کا کوئی اندازہ نہیں کیا جاسکتا، صرف وقت اور اللہ کی دی ہوئی قوت کے صرف و استعمال کا سوال ہے، اور سودا ایسا ہے کہ جان کی قیمت میں بھی سستا ہے، بقول حضرت مفتی صدر الدین خاں آزردہ۔

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے، سو ایسا زیاں نہیں

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

29 ذی الحجہ 1364ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب اول: ۱

خاندان: ماحول، نشو و نما، تعلیم و تکمیل

مولانا محمد اسماعیل صاحب:

آج سے ۱۷۰،۱۸۰ برس پہلے کی بات ہے، دہلی کے باہر حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مرقد کے قریب چونسٹھ کھمبے کے نام سے جو تاریخی عمارت ہے، اس کے سرخ پھاٹک پر ایک عمارت میں ایک بزرگ رہا کرتے تھے جن کا نام مولانا محمد اسماعیل صاحب تھا۔

آپ کا قدیم آبائی وطن جھنجھانہ ضلع مظفر نگر تھا، لیکن پہلی بیوی کے انتقال کے بعد آپ نے مفتی الٰہی بخش صاحب کاندھلویؒ کے خاندان میں (جو آپ کے ایک ہم جد تھے) عقد ثانی کر لیا تھا، جس کی وجہ سے کاندھلہ بھی آمد و رفت رہتی تھی، اور وہ بھی وطن کی طرح ہو گیا تھا۔

جھنجھانہ اور کاندھلہ کا یہ خاندان صدیقی شیوخ کا معتبر گھرانہ تھا، جس میں علم اور دینداری پشتہا پشت سے چلی آرہی تھی، اور دونوں اطراف میں خاص عزت و وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ چھ پشت اوپر (مولوی محمد شریف پر) مولوی محمد اسماعیل اور مفتی صاحب کا نسب مل جاتا ہے۔ سلسلہ نسب اس طرح ہے۔

مولانا محمد اسماعیل بن غلام حسین بن حکیم کریم بخش، بن حکیم غلام محی الدین بن مولوی محمد ساجد بن مولوی محمد فیض بن مولوی محمد شریف، بن مولوی محمد اشرف بن شیخ جمال محمد شاہ بن شیخ بابن شاہ بن شیخ بہاء الدین شاہ بن مولوی شیخ محمد بن شیخ محمد فاضل بن الشیخ قطب شاہ[1]

مفتی الٰہی بخش صاحبؒ اور ان کا خاندان

مفتی الٰہی بخش صاحبؒ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے ممتاز ترین تلامذہ میں سے تھے، اپنے زمانہ کے نامور صاحب فتویٰ و تدریس اور صاحب تصنیف تھے، کامل طبیب تھے اور علوم عقلیہ و نقلیہ میں اعلیٰ دستگاہ اور عربی و فارسی اور اردو نظم پر استادانہ قدرت رکھتے تھے، جس کی شاہد ان کی شرح

---

[1] (نسب نامہ مستفاد از رسالہ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی ۱۲)

"بانت سعاد" ہے جس میں حضرت کعبؓ کے ہر عربی شعر کا ترجمہ عربی، فارسی اور اردو شعر میں کیا ہے، عربی فارسی کی تقریباً 40 تصنیف یادگار ہیں۔ "شمیم الحبیب" اور "مثنوی مولانا روم کا تکملہ" سب سے زیادہ مشہور ہے۔

مفتی صاحب حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ سے بیعت تھے، اخلاص وللہیت کی کھلی ہوئی دلیل یہ ہے کہ شیخ وقت ہونے کے باوجود 65-60 برس کی عمر میں اپنے شیخ کے جوان سال خلیفہ حضرت سید احمد شہیدؒ سے بیعت ہوئے جو مفتی صاحبؒ سے تقریباً 38 سال چھوٹے تھے، اور اس سن وسال اور بزرگی وشہرت کے باوجود آپ سے استفادہ کرنے میں تامل نہیں کیا[1]۔

مفتی صاحب کی ولادت 1162ھ میں ہوئی اور 1245ھ میں 83 کی عمر میں انتقال فرمایا۔ آپ کے صاحبزادے اور پوتے سب ذہین وذکی، ذی علم وباکمال اور صاحب وجاہت تھے، ذہن وذکاوت علم وادب سے فطری مناسبت اور اللہ کی طرف رجوع وانابت اس خاندان کی خصوصیات ہیں، مولوی ابوالحسن صاحب جن کی مثنوی گلزار ابراہیم (جو ان کی مشہور تالیف بحر حقیقت کا ایک جزو ہے) بڑی عارفانہ مثنوی ہے جو ابھی کچھ مدت پہلے گھر گھر پڑھی جاتی تھی[2] ان کے صاحبزادے مولوی نور الحسن صاحب" اور انکے چاروں صاحبزادے مولوی ابراہیم صاحب اس خانوادے کے نامور فرزند ہیں۔

مولانا مظفر حسینؒ:

مفتی صاحبؒ کے حقیقی بھتیجے مولانا مظفر حسینؒ جو حضرت شاہ اسحاقؒ کے نہایت عزیز شاگرد حضرت شاہ محمد یعقوبؒ کے مجاز اور حضرت سید صاحب اور ان کے رفقاء کے دیکھنے والے تھے، اپنے زمانے کے بڑے صلحاء میں سے تھے۔ تورع اور تقویٰ آپ کا خاص جوہر تھا۔ مشہور ومسلم بات ہے کہ ان کے معدے نے کبھی مشتبہ چیز قبول نہیں کی۔ ان کی تواضع، استقامت اور نماز کے واقعات اس جوار و اطراف ابھی تک لوگوں کی یاد میں اور وہ قرون اولیٰ کی یاد تازہ

---

1 (مفتی صاحب نے سید صاحب کے طریقہ واذکار میں ایک ایک کتاب بھی لکھی ہے جس کا نام "طہارت احمدیہ" ہے۔ 12)

2 (حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ فرماتے تھے کہ مجھے اس طریق (معرفت وسلوک) کا اشتیاق اسی مثنوی سے پیدا ہوا۔ بروایت حضرت مولانا شاہ محمد الیاس صاحبؒ۔ 12)

کرتے ہیں[1]۔

مولانا مظفر حسین صاحبؒ کی نواسی مولانا محمد اسماعیل صاحب کے عقد میں تھیں۔ یہ آپ کا نکاح ثانی تھا جو 85,13ھ (3_ اکتوبر 68ء) کو ہوا تھا۔

مولانا محمد اسماعیل صاحبؒ کی زندگی:

مولانا اسمٰعیل صاحبؒ مرزا الٰہی بخش صاحب (جو بہادر شاہ کے سمدھی تھے) کے بچوں کو پڑھاتے تھے۔ پھاٹک کے اوپر مکان میں رہتے تھے۔ متصل ہی ایک چھوٹی سی مسجد تھی جس کے سامنے مرزا الٰہی بخش صاحب کی نشست گاہ تھی جس پر ٹین پڑا ہوا تھا اسی بنا پر اس کو بنگلہ والی مسجد کہتے تھے۔

مولانا اپنی زندگی عزلت، گمنامی اور عبادت میں گزار رہے تھے۔ خود مرزا الٰہی بخش صاحب کو ان کے مرتبہ کا احساس اس وقت ہوا جب مولانا کے مستجاب الدعوات ہونے کا ان کو ذاتی تجربہ ہوا۔

ذکر و عبادت، آنے جانے والے مسافروں کی خدمت اور قرآن مجید و دین کی تعلیم شب و روز کا مشغلہ تھا۔ خدمت و تواضع کا یہ عالم تھا کہ جو مزدور بوجھ لادے ہوئے پیاسے ادھر سے آ نکلتے ان کا بوجھ اتار کر رکھ دیتے اپنے ہاتھ سے ڈول کھینچ کر ان کو پانی پلاتے، پھر دو رکعت نماز شکرانہ ادا کرتے کہ اے اللہ! تو نے مجھے اپنے بندوں کی اس خدمت کی توفیق دی، میں اس قابل نہ تھا۔ عام اجتماع و ہجوم کے زمانہ میں پانی اور لوٹوں کا خاص اہتمام رکھتے، اور رضائے الٰہی اور قربت خداوندی کا ذریعہ سمجھ کر خلق خدا کی راحت رسانی اور خدمت میں مشغول رہتے[2]۔

مولانا ہر وقت ذاکر و باخدا رہتے تھے۔ مختلف اوقات و حالات کے متعلق حدیث میں جو اذکار و اوراد آئے ہیں ان کی پابندی کرتے تھے اور آپ کو مرتبہ احسان حاصل تھا[3]۔

ایک مرتبہ آپ نے حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ سے طریق سلوک کے حصول کی خواہش کی۔ مولانا نے فرمایا کہ آپ کو اس کی حاجت نہیں، جو اس طریق اور ان ذکر و اذکار کا مقصود ہے وہ آپ کو حاصل ہے، اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی شخص قرآن پاک پڑھنے کے بعد یوں سمجھے

---

1. تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ارواح ثلاثہ ص 155,167 تذکرۃ الخلیل 12,2
2. (روایت مولانا محمد الیاس صاحبؒ ارواح ثلاثہ)

کہ قاعدہ بغدادی میں نے تمہیں پڑھا دیا اس کو بھی پڑھا دوں[1]۔

مولانا کو قرآن مجید کی تلاوت اور ورد سے خاص شغف تھا۔ پرانی تمنا تھی کہ حافظ ہوں اور قرآن پر مختار ہوں۔

رات کو اس کا خاص اہتمام تھا کہ گھر والوں میں سے کوئی نہ کوئی جاگتا رہے۔ بارہ ایک بجے تک منجھلے صاحبزادے مولانا یحییٰ صاحب مطالعہ میں مشغول رہتے۔ اس وقت مولانا اسمٰعیل صاحب بیدار ہو جاتے اور مولانا یحییٰ صاحب سو جاتے۔ پچھلے پہر بڑے صاحبزادے مولانا محمد صاحب کو بیدار کر دیتے۔

عام مقبولیت:

طبیعت اتنی صلح کل واقع ہوئی تھی کہ کسی کو آپ سے شکایت نہ تھی۔ سب یہ سمجھتے تھے کہ اللہ نے باہم بنا دیا تھا، آپ کی للہیت، خلوص و بے نفسی ایسی آشکارا تھی کہ دہلی کی مختلف الخیال جماعتیں جو اس زمانے میں ایک دوسرے سے سخت متنفر و متوحش تھیں، اور ان میں سے ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھنے کا روادار نہ تھا، ان کے پیشواؤں کو آپ پر یکساں اعتماد اور آپ کی ذات سے بلا اختلاف عقیدت تھی[2]۔

میوات سے تعلق کی ابتداء:

میوات سے تعلق بھی آپ کی حیات میں شروع ہوا۔ اس کی تاریخ یہ ہے کہ ایک مرتبہ آپ تلاش و فکر میں نکلے کہ کوئی مسلمان آتا جاتا نظر پڑے تو اس کو مسجد میں لے آئیں اور اس کے ساتھ جماعت سے نماز پڑھ لیں، چند مسلمان نظر آئے، ان سے پوچھا کہ کہاں جاتے ہو؟ انہوں نے کہا: مزدوری کے لئے! کہا کیا مزدوری ملے گی؟ انہوں نے مزدوری بتائی، فرمایا، اگر اتنی مزدوری یہیں مل جائے تو پھر جانے کی کیا ضرورت؟ انہوں نے منظور کر لیا، آپ ان کو مسجد میں لے آئے اور نماز سکھانے اور قرآن پڑھانے لگے، یومیہ مزدوری ان کو دے دیتے اور ان کو پڑھنے اور سیکھنے میں مشغول رکھتے۔ کچھ دنوں کے بعد نماز کی عادت پڑ گئی اور مزدوری چھوٹ گئی۔ یہ بنگلہ والی مسجد کے مدرسہ کی بنیاد تھی، اور یہ پہلے طالب علم تھے، اس کے بعد 10، 12 میواتی طالب علم برابر مدرسے میں رہتے، اور ان کا کھانا مرزا الٰہی بخش مرحوم کے یہاں سے آتا[3]۔

[illegible]

مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کی وفات اور آپ کی مقبولیت۔

۲۶ شوال ۱۳۱۵ھ (۲۶ فروری ۱۸۹۸ء) کو مولانا محمد اسمٰعیل صاحب نے انتقال فرمایا "مغفورلہ" تاریخ وفات ہے۔ آپ نے دہلی شہر میں بہرام کے قریب کی کھجور والی مسجد میں وفات پائی۔ مقبولیت عامہ کا اندازہ اس سے ہوگا کہ جنازے کے ساتھ چلنے والوں کا اتنا ہجوم تھا کہ اگرچہ جنازہ میں دونوں طرف بلیاں بندھی ہوئی تھیں تاکہ لوگوں کو کاندھا دینے میں سہولت ہو مگر اس کے باوجود بہت سے لوگوں کو دہلی سے نظام الدین تک (جو تقریباً ساڑھے تین میل ہے) کاندھا دینے کا موقع نہیں ملا[1]۔

جنازہ میں مختلف جماعتوں کے بکثرت لوگ تھے اور مختلف العقیدہ اور مختلف الخیال مسلمان جو کم ایک جگہ جمع ہو سکتے تھے، اس موقع پر مجتمع تھے۔ مولانا کے منجھلے صاحبزادے مولانا محمد یحیٰی صاحب فرماتے تھے کہ میرے بڑے بھائی مولانا محمد صاحب بڑے نرم مزاج اور متواضع بزرگ تھے۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں وہ کسی بزرگ کی تواضع فرمائیں اور نماز پڑھانے کے لئے ان کو اشارہ کر دیں، اور دوسری جماعت کے لوگ اور ان کے پیشوا ان کے پیچھے نماز نہ پڑھیں، اس طرح اس موقع پر ایک نامناسب صورت پیش آئے، اس لئے میں خود آگے بڑھ گیا اور میں نے کہا کہ میں خود نماز پڑھاؤں گا۔ سب نے اطمینان کے ساتھ میرے پیچھے نماز پڑھی اور کوئی اختلاف و انتشار پیدا نہیں ہوا[2]۔

جنازہ میں اتنا ہجوم اور لوگوں کی کثرت تھی کہ لوگوں نے بار بار نماز پڑھی، جس کی وجہ سے دفن میں کچھ تاخیر ہوئی، اس عرصہ میں ایک صاحب اور ایک بزرگ نے دیکھا کہ مولانا اسمٰعیل صاحبؒ فرماتے ہیں۔ "مجھے جلدی رخصت کر دو، میں بہت شرمندہ ہوں کہ حضور ﷺ صحابہؓ کے ساتھ میرے منتظر ہیں[3]۔"

مولاناؒ کے صاحبزادے:

مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کے تین صاحبزادے تھے، پہلی بیوی سے مولانا محمد صاحبؒ جو سب سے بڑے بھائی تھے، اور اپنے والد کے جانشین ہوئے۔ دوسری بیوی سے (جو مولانا مظفر حسین

---

[1] (از حضرات مشائخ کاندھلہ ص ۱۲) [2] (از شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا فرزند مولانا محمد یحیٰی صاحب ص ۱۲)

[3] (روایت مولانا محمد الیاس صاحبؒ ص ۱۲)

صاحبؒ کی نواسی تھیں اور جن سے ان کی پہلی بیوی کے انتقال کے بعد نکاح کیا تھا) دو صاحبزادے مولانا محمد یحییٰ صاحب اور مولانا محمد الیاس صاحبؒ۔

مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی ولادت آپ کا خاندانی ماحول اور بچپن:

مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی ولادت 1303ھ میں ہوئی۔ اختر الیاس تاریخی نام ہے۔ آپ کا بچپن اپنے ننھیال کاندھلہ اور اپنے والد صاحب مرحوم کے پاس نظام الدین میں گزرا۔ اس وقت کاندھلہ کا یہ خاندان دینداری کا گہوارہ تھا۔ مرد تو مرد عورتوں کی دینداری، عبادت گزاری، شب بیداری، ذکر و تلاوت کے قصے اور ان کے معمولات اس زمانہ کے پست ہمتوں کے تصور سے بلند ہیں۔

گھر میں بیبیاں عام طور پر نوافل میں اپنے اپنے طور پر قرآن پڑھتی تھیں اور عزیز مردوں کے پیچھے تراویح و نوافل میں سنتی تھیں۔ رمضان المبارک میں قرآن پاک کی عجیب بہار رہتی تھی، گھروں میں جابجا قرآن مجید ختم ہوتے اور دیر تک اس کا سلسلہ جاری رہتا[1]۔

عورتوں کو اتنا علم اور ذوق تھا کہ قرآن مجید پڑھ پڑھ کر مزہ لیتیں اور نماز کے بعد اپنے مقامات کا ذکر کرتی تھیں، نماز میں ایسی محویت اور استغراق تھا کہ بعض اوقات بعض بیبیوں کو گھر میں پردہ کرانے اور کسی حادثہ وغیرہ میں لوگوں کے آنے جانے تک کا احساس نہ ہوتا[2]۔

قرآن شریف مع ترجمہ و اردو تفسیر، مظاہر حق، مشارق الانوار، حصن حصین، یہ عورتوں کا تعلیمی نصاب تھا جس کا خاندان میں عام رواج تھا۔ اس وقت گھر کے باہر اور اندر کی مجلسیں اور صحبتیں حضرت سید صاحبؒ اور حضرت شاہ عبد العزیز صاحبؒ کے خاندان کے قصوں اور چرچوں سے گرم تھیں، ان بزرگوں کے واقعات مردوں اور عورتوں کی زبانوں پر تھے۔ مائیں اور گھر کی بیبیاں بچوں کو طوطے مینا کے قصوں کے بجائے یہی روح پرور واقعات سناتی تھیں، اور یہ کچھ زیادہ پرانی باتیں نہ تھیں، مولانا مظفر حسین صاحب کی آنکھوں دیکھی باتیں اور ان کی صاحبزادی اور عزیزوں کی کانوں سنی حکایات تھیں۔ سننے والوں کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کل کی باتیں ہیں۔

---

1 بروایت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ 2 مولانا محمد الیاس صاحبؒ مولانا نے ایک روز اس قسم کے حالات بیان کرنے کے بعد فرمایا یہ وہ گودیاں ہیں جن میں ہم نے پرورش پائی۔ اب وہ گودیں دنیا میں کہاں سے آئیں گی۔ (مولانا محمد یوسف صاحبؒ نے ایک روز مجھ سے فرمایا کہ آپ لکھتے [illegible] صاحب نے [illegible] آپ کی کتاب "سیرت سید احمد شہیدؒ" سے بہت سی معلومات میں اضافہ ہوا۔)

امی بی:

مولانا کی نانی بی "امتہ الرحمن" (جو مولانا مظفر حسین صاحبؒ کی صاحبزادی تھیں اور جن کو خاندان میں عام طور پر "امی بی" کے نام سے یاد کرتے تھے) ایک رابعہ سیرت بی بی تھیں۔ ان کی نماز کا یہ حال تھا کہ مولانا نے ایک مرتبہ فرمایا کہ: امی بی کی نماز کا نمونہ میں نے مولانا گنگوہیؒ کی نماز میں دیکھا[1]

(اور مولانا گنگوہیؒ کی نماز اپنے طبقہ میں ممتاز تھی) اخیر زمانہ میں ان کا یہ حال تھا کہ خود کھانا کبھی طلب نہیں فرماتی تھیں، کسی نے لا کر رکھ دیا تو کھا لیا۔ مگر چونکہ اکثر کلام کی کثرت اور ذکر کی مشغولیت کی وجہ سے خیال نہ آتا تو بھوکی پڑی رہتیں۔ ایک مرتبہ کسی نے کہا: آپ ایسے ضعف کی حالت میں کیسے بے کھائے رہتی ہیں؟ فرمایا: الحمد للہ! میں تسبیحات سے غذا حاصل کر لیتی ہوں[1]۔

مولانا کی والدہ ماجدہ:

مولانا کی والدہ محترمہ "بی صفیہ" بڑی جید حافظہ تھیں، انہوں نے قرآن مجید شادی کے بعد مولانا یحییٰ صاحب کی شیرخوارگی کے زمانہ میں حفظ کیا تھا اور ایسا اچھا یاد کیا تھا کہ معمولی حافظ ان کے مقابلے میں نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ معمول تھا کہ رمضان میں روزانہ پورا قرآن مجید اور دس پارے مزید پڑھ دیا کرتی تھیں، اس طرح ہر رمضان میں چالیس قرآن مجید ختم کرتی تھیں[2]۔

روانی اتنا تھا کہ گھر کے کام کاج اور انتظامات میں فرق نہ آتا، بلکہ اتنا مشق تھا کہ تلاوت کے وقت ہاتھ سے کچھ نہ کچھ کام کرتی رہتیں۔ رمضان کے علاوہ امور خانہ داری کے ساتھ روزانہ کے معمولات یہ تھے۔۔۔۔۔۔۔درود شریف 5000 ہزار بار، اسم ذات اللہ 5 ہزار بار، بسم اللہ الرحمن الرحیم (900 سو بار) یا مقتی (11 سو بار) لا الہ الا اللہ (بارہ سو بار) یا حی یا قیوم (دو سو بار) حسبی اللہ ونعم الوکیل (5 سو بار) سبحان اللہ (دو سو بار) الحمد (دو سو بار) لا الہ الا اللہ (2 سو بار) اللہ اکبر (دو سو بار) استغفار (پانچ سو بار) افوض امری الی اللہ (سو بار) حسب اللہ و نعم الوکیل (سو بار) رب انی مغلوب فانتصر (سو بار) رب انی مسنی الضر و انت ارحم الرحمین (سو بار) لا الہ الا انت سبحنک انی کنت من الظلمین (سو بار)

مولانا محمد یوسف صاحب از اسعد مولانا محمد الیاس صاحبؒ۔ 12 (1) 2 (مولانا محمد الیاس صاحبؒ) بحوالہ (تذکرہ متقین)

اس کے علاوہ قرآن مجید کی ایک منزل روزانہ تلاوت کا معمول تھا[1]۔

مکتبی تعلیم اور بچپن کا رنگ:

خاندان کے دوسرے عزیز بچوں کی طرح آپ بھی قرآن شریف اور مکتب کی ابتدائی تعلیم حاصل کرتے رہے، اور خاندانی دستور کے مطابق قرآن شریف حفظ کیا۔ قرآن شریف کے حفظ کا خاندان میں ایسا عام رواج تھا کہ خاندان کی مسجد کی ڈیڑھ صف میں موذن کے سوا کوئی غیر حافظ نہ ہوتا۔

امی بی مولانا پر بہت شفیق تھیں۔ فرمایا کرتی تھیں کہ: اختر مجھے تجھ سے صحابہؓ کی خوشبو آتی ہے۔ کبھی پیٹھ پر محبت سے ہاتھ رکھ کر فرماتیں۔ کیا بات ہے کہ تیرے ساتھ مجھے صحابہؓ کی سی صورتیں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں[2]۔

مولانا محمد الیاس صاحبؒ میں ابتداء سے صحابہ کرامؓ کی والہانہ شان کی ایک ادا، اور ان کی دینی بے قراری کی ایک جھلک تھی، جس کو دیکھ کر (شیخ الہند) مولانا محمود حسن صاحب بھی فرمایا کرتے تھے کہ جب میں مولوی الیاس کو دیکھتا ہوں تو مجھے صحابہؓ یاد آجاتے ہیں[3]۔

دین کی حمیت (جس نے آگے چل کر منظم شکل اختیار کرلی) آپ کی فطرت میں ودیعت تھی، دینی ماحول اور بزرگوں کے واقعات و روایات نے اس چنگاری کو ہوا دی، بچپن ہی میں آپ سے بعض ایسی چیزوں کا اظہار ہوتا تھا جو عام بچوں کی سطح سے اونچی ہیں، آپ کے ہم عمر و ہم مکتب ریاض الاسلام صاحب کاندھلوی بیان کرتے ہیں کہ: جب ہم مکتب میں پڑھتے تھے، ایک دن آپ لکڑی لے کر آئے اور کہا: آؤ میاں ریاض الاسلام! چلو بے نمازیوں پر جہاد کریں۔

گنگوہ کا قیام:

1 شوال 1311ء میں آپ کے منجھلے بھائی مولانا محمد یحییٰ صاحب حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کی خدمت میں گنگوہ چلے گئے اور وہیں کا قیام اختیار کیا[4]۔

مولانا محمد الیاس صاحبؒ اپنے والد ماجد کے پاس نظام الدین اور کبھی کبھی ننھیال کاندھلہ میں

1۔ تذکرۃ الخلیل بحوالہ مولانا محمد یحییٰ صاحب) 2۔ (مولانا محمد الیاس صاحبؒ)

3۔ (مولانا محمد الیاس صاحبؒ۔12) 4۔ مولوی یحییٰ صاحب ہی تھے، جب تک باہر رہتے درس رکا رہتا۔ مولانا کا ایسا اعتماد اور دل میں جگہ کی پیشکار ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے لئے کہیں جاتے تو مولانا بے چین ہو کر فرماتے کہ مولوی یحییٰ ہمارا کی لاٹھی ہیں۔ (ملاحظہ ہو تذکرۃ الرشید و تذکرۃ الخلیل) 5۔ شیخ الاسلام مولانا محمد زکریا صاحب

رہا کرتے تھے۔ نظام الدین میں والد صاحب کی شفقت اور اپنی عبادت میں مشغولی کی کثرت کی وجہ سے تعلیم جیسی ہونی چاہیے تھی، نہیں ہو رہی تھی۔ مولانا محمد یحییٰ صاحب نے والد صاحب سے عرض کیا بھائی کی تعلیم معقول نہیں ہو رہی ہے۔ میں ان کو اپنے ساتھ گنگوہ لے جاتا ہوں۔ والد صاحب نے اجازت دے دی اور آپ بھائی کے ہمراہ 14ھ یا شروع 15ھ میں گنگوہ آ گئے اور بھائی صاحب سے پڑھنا شروع کر دیا۔

گنگوہ اس وقت صلحاء و فضلاء کا مرکز تھا، ان کی اور خود حضرت مولانا رشید احمد صاحبؒ کی صحبت میں اور مجالس کی دولت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کو شب و روز حاصل تھی۔ دینی جذبات کی پرورش، تمیز دین کی سمجھ اور اس کا سلیقہ پیدا کرنے میں ان کیمیا اثر صحبتوں اور مجالس کو جو دخل ہے وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں، مولانا کی دینی اور روحانی زندگی میں اس ابتدائی ماحول کا فیض برابر شامل رہا۔ انسان کی زندگی میں مقام و ماحول کا اثر قبول کرنے کا جو بہترین زمانہ ہو سکتا ہے مولانا محمد الیاس صاحب کا وہ زمانہ گنگوہ میں گزرا۔ جب گنگوہ آئے تو دس گیارہ سال کے بچے تھے۔ جب 1323ھ میں مولانا گنگوہی نے وفات پائی تو بیس سال کے جوان تھے، گویا دس برس کا عرصہ مولانا کی صحبت میں گزرا[1]۔

مولانا محمد یحییٰ صاحب کامل استاد اور مربی تھے۔ وہ اس بات کا خاص اہتمام رکھتے تھے کہ ہونہار بھائی ان صحبتوں اور مجلسوں کے فیوض سے پورے طور پر مستفید ہو۔ مولانا محمد الیاس صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ جب حضرت گنگوہیؒ کے خاص فیض یافتہ اور تربیت یافتہ علماء گنگوہ آتے تو بعض اوقات بھائی میرا درس بند کر دیتے اور کہتے اب تمہارا درس یہ ہے کہ تم ان حضرات کی صحبت میں بیٹھو اور ان کی باتیں سنو!

مولانا گنگوہیؒ سے بیعت و تعلق:

مولانا گنگوہی بالعموم بچوں اور طالب علموں کو بیعت نہیں کرتے تھے، فراغت و تکمیل کے بعد اس کی اجازت ہوتی تھی، مگر مولانا الیاس صاحبؒ کے غیر معمولی حالات کی بنا پر ان کی خواہش و درخواست کی بنا پر بیعت کر لیا[2]۔

مولانا کی فطرت میں شروع سے محبت کی چنگاری تھی، آپ کو حضرت مولانا رشید احمد صاحبؒ

[1] (شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب۔ 11) [2] (سوانح شیخ الحدیث۔ 12)

سے ایسا قلبی تعلق پیدا ہو گیا تھا کہ آپ کے بغیر تسکین نہ ہوتی۔ فرماتے تھے کہ: کبھی کبھی رات کو اٹھ کر صرف چہرہ دیکھنے کے لئے جاتا، زیارت کر کے پھر آکر سو رہتا۔ حضرت گنگوہیؒ کو بھی آپ کے حال پر ایسی ہی شفقت تھی۔ فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ میں نے بھائی سے کہا کہ اگر حضرتؒ اجازت دے دیں تو میں حضرت کے قریب بیٹھ کر مطالعہ کیا کروں؟ مولانا محمد یحییٰ صاحب نے حضرت مولانا سے ذکر فرمایا: مضائقہ نہیں! الیاس کی وجہ سے میری خلوت میں فرق اور طبیعت میں انتشار نہیں پیدا ہوگا۔

مولانا فرماتے تھے کہ جب میں ذکر کرتا تھا تو مجھے ایک بوجھ سا محسوس ہوتا تھا۔ حضرت سے کہا تو حضرت تھرا گئے اور فرمایا کہ مولانا محمد قاسم صاحب نے یہی شکایت حاجی صاحب سے فرمائی تو حاجی صاحب نے فرمایا کہ: اللہ آپ سے کوئی کام لے گا۔

مولانا محمد یحییٰ صاحب کا طرز تعلیم:

مولانا محمد یحییٰ صاحب تعلیم میں مجتہدانہ طرز رکھتے تھے، ابتدائی تعلیم میں درسی کتب اکثر نہیں پڑھاتے تھے، بلکہ خود اصول و قواعد لکھوا کر صرفی و نحوی لفظ بناتے تھے کہ ان کی گردانیں اور تعلیلیں یاد ہوں۔ ادب پر ابتداء ہی سے زور تھا۔ ابتداء شاہ ولی اللہ صاحب کی "چہل حدیث" اور "پارہ عم" سے کرتے تھے۔ فرماتے تھے کہ مسلمان بچے کو پارہ عم تو یاد ہوتا ہی ہے، لفظ یاد کرنے نہ پڑیں گے، صرف معنی یاد کرنے ہوں گے۔ فرماتے تھے کہ ویسے بھی قرآن و حدیث کے الفاظ میں برکت ہے۔ استعداد آفرینی اور قوت مطالعہ کی طرف مولانا کی اصل توجہ تھی۔ کتابوں کے اختتام کی بھی پابندی نہ تھی۔ عموماً بے حاشیہ و شرح کی کتاب طالب علم کو پڑھنے کے لئے دیتے اور درمیان میں سہارا نہ دیتے، جب اس کا اطمینان ہو جاتا کہ طالب علم بے استاد کے ٹوکے کتاب کے کئی صفحے اچھی طرح سمجھ اور سمجھا سکتا ہے تب دوسری کتاب شروع کراتے۔ عربیت اور استعداد کی پختگی کی طرف خاص توجہ تھی۔ مولانا کے شاگردوں میں "اتقان" پیدا ہو جایا کرتا تھا[1]۔

علالت، تعلیم کا انقطاع اور دوبارہ اجراء:

آپ ابتداء سے نحیف و لاغر تھے۔ اسی گنگوہ کے قیام میں آپ کی صحت خراب ہوئی درد سر کا ایک

---

[1] شیخ الحدیث

تو میں قسم کا دورہ پڑا جس کی وجہ سے گھنٹوں سر کا جھکانا حتیٰ کہ تکیہ پر سجدہ کرنا بھی ناممکن تھا۔ مولانا گنگوہی کے صاحبزادے حکیم مسعود احمد صاحب معالج تھے، اور ان کا خصوصی طرز یہ تھا کہ بعض امراض میں پانی بہت دنوں کے لئے چھڑا دیتے، بہت کم لوگ اس پرہیز کو برداشت کر سکتے اور زیادہ مدت کے لئے پانی نہ چھوڑ سکتے تھے مگر مولانا نے اپنے مخصوص مزاج (اصول کی پابندی اور اطاعت) کے مطابق معالج کی پوری اطاعت کی اور اپنی خداداد قوت ارادی اور عزیمت سے (جو ان کی پوری زندگی میں جلوہ گر رہتی ہے) پانی سے پورا پرہیز کیا اور سات برس کامل پانی نہیں پیا[1]۔ اس کے بعد پانچ برس تک برائے نام پانی پیا۔

اس شدید علالت اور خاص طور پر دماغی کمزوری کی وجہ سے سلسلہ تعلیم منقطع ہو گیا، اس کے دوبارہ جاری ہونے کی امید نہ تھی، لیکن مولانا کو تعلیم کے ناممکمل رہ جانے کا بڑا غم تھا اور اس کی بے کلی رہتی تھی۔ آپ کا پڑھنے کے لئے اصرار تھا اور ہمدردوں کا مشورہ تھا کہ مسلسل آرام کریں۔ مولانا فرماتے تھے کہ ایک روز بھائی نے کہا کہ آخر پڑھ کر کیا کرو گے؟ میں نے کہا: جی کر کیا کروں گا! اس اصرار طلب کی بناء پر آپ کو پڑھنے کی اجازت ہو گئی اور سلسلہ تعلیم پھر جاری ہو گیا۔

مولانا گنگوہیؒ کی وفات:

1322ھ میں حضرت مولانا رشید احمد صاحب نے انتقال فرمایا۔ مولانا محمد الیاس صاحبؒ بالیں پر موجود تھے اور سورہ یٰسین پڑھ رہے تھے[2]۔

اس حادثہ کا آپ کے اثر پذیر قلب پر جو اثر ہوا اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ فرماتے تھے کہ دو ہی غم میری زندگی میں سب سے بڑھ کر ہوئے، ایک والد کا انتقال، ایک حضرتؒ کی وفات اور فرمایا حضرت! ہم تو ساری عمر کا رونا اسی روز رو لئے جس روز حضرت دنیا سے رخصت ہوئے۔

حدیث کی تکمیل:

1326ھ میں آپ شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ کے حلقہ درس میں شرکت کے لئے دیوبند تشریف لے گئے اور ترمذی شریف اور بخاری شریف کی سماعت کی[1]۔

1 یہ بات میں نے خود مولانا کی زبان سے سنی ہے اور شیخ الحدیث صاحب اور ان کے خاندان کے تمام بزرگوں سے متواتر سننے میں آئی ہے۔ 2 (ص 49) (مولانا محمد الیاس صاحب۔ ص 12) 1 روایت مولانا محمد [illegible] حکیم صاحب [illegible] تذکرہ [illegible] ص 12)

دیوبند کی شہرت درس کے لئے کئی سال بعد چار مہینے میں آپ نے اپنے بھائی مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ سے پھر حدیث کا دورہ کیا۔[1]

مولانا خلیل احمد صاحبؒ سے رجوع اور تکمیل سلوک:

حضرت مولانا رشید احمد صاحبؒ کی وفات کے بعد آپ نے شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب سے درخواست کی، آپ نے مولانا خلیل احمد صاحب سے رجوع کا مشورہ دیا۔[2]

چنانچہ آپ نے مولانا سہارنپوری سے اپنا تعلق قائم کرلیا اور آپ کی نگرانی اور رہنمائی میں منازل سلوک طے کئے۔

عبادت ونوافل کا انہماک:

گنگوہ کے قیام کے دوران میں حضرت مولانا رشید احمد صاحبؒ کی وفات کے بعد زیادہ سکوت اور مراقبہ طاری رہتا تھا۔ شاید سارے دن میں کوئی ایک بات کرتے ہوں۔ شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحبؒ فرماتے ہیں کہ:

---

[1] اس کی دلچسپ تاریخ جو شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحبؒ نے سنائی یہ ہے کہ: ایک سرحدی عالم مولوی شیر محمد نام مولانا ماجد علی صاحب وغیرہ سے معقولات کی تکمیل کرکے وطن گئے تھے۔ وہاں ان کی شادی کے روز کسی طالب علم نے ان سے ابن ماجہ پڑھنے کی درخواست کی۔ انہوں نے شرمندگی کے ساتھ کہا کہ بھائی میں نے سارا وقت معقولات کی تحصیل میں صرف کیا اور حدیث کی تعلیم باقاعدہ حاصل نہیں کی۔ البتہ حدیث کا ایک استاد مولوی محمد یحییٰ صاحب مراد ہیں کو پکڑ کر آیا ہوں۔ اب واپس جا کر ان سے پڑھ کر آؤں تو تم کو پڑھاؤں۔ بیوی سے انہوں نے ۴ مہینے کا وعدہ کیا اور گنگوہ روانہ ہو گئے۔ یہاں آکر انہوں نے مولانا محمد یحییٰ صاحب سے پڑھنا شروع کیا۔ مولانا محمد الیاس صاحب ان کے ضمنی درس تھے۔ عبارت بھی اکثر مولانا محمد یحییٰ صاحب اور مولانا محمد الیاس صاحب پڑھتے تھے۔ رات بھر درس ہوتا تھا اور حضرت تو دن کو سوتے مگر ولایتی مولوی صاحب کو بہت کم سوتا دیکھا گیا۔ مطالعہ کے انہماک و استغراق کا یہ حال تھا کہ کھانا لانے والے سے یہ کہہ دیا تھا کہ روٹی رکھ جایا کرو اور سالن لے جایا کرو۔ مولوی صاحب کتاب کا مطالعہ کرتے جاتے اور روٹی کا ٹکڑا توڑ کر منہ میں رکھ لیتے۔ (12)

[2] (مولانا محمد الیاس صاحبؒ۔ 12)

"ہم لوگ اسی زمانہ میں ان سے ابتدائی فارسی پڑھتے تھے، ان دنوں ان کا دستور یہ تھا کہ حضرت شاہ عبدالقدوسؒ صاحب کے روضے کے پیچھے ایک بوریے پر بالکل خاموش دو زانو بیٹھے رہتے تھے، ہم لوگ ہوتے اور کتاب ان کے سامنے رکھ کر انگلی کے اشارہ سے سبق کی جگہ انگوٹھا کر سبق شروع کرادیتے تھے اور فارسی شعر پڑھتے تھے اور ترجمہ کرتے تھے، جہاں ہم نے غلط پڑھا انگلی کے اشارے سے انہوں نے کتاب بند کردی اور سبق ختم۔ اس کا مطلب ہوتا کہ دوبارہ مطالعہ کرکے لاؤ۔"

نیز اسی زمانہ میں نوافل کا بھی بے حد زور تھا۔ مغرب کے بعد عشاء سے پہلے پہلے تک نوافل میں مشغول رہتے۔ اس وقت آپ کی عمر 20،25 سال کے درمیان تھی۔

جذب و شوق کی ایک مثال:

جذب و شوق مولانا کے خمیر میں تھا، اور اس کے بغیر ترقی مشکل ہے۔ اسی جذب و خود فراموشی نے جسم کی لاغری اور قویٰ کی کمزوری کے باوجود اتنا عظیم الشان اور حیرت انگیز کام کرادیا۔ جو ان کی جسمانی حالت سے ذرا مطابقت نہیں رکھتا۔

ایک مرتبہ آخری حالت میں یہ واقعہ بیان کیا[1] کہ ایک مرتبہ میں ایسا بیمار تھا اور اتنا کمزور و مجبور تھا کہ بالاخانہ سے نیچے نہیں اتر سکتا تھا۔ اتنے میں یہ خبر ملی کہ حضرت سہارنپوری دہلی تشریف لائے ہیں، بس بے اختیار اسی وقت دہلی پیدل روانہ ہوگیا۔ یہ یاد بھی نہیں رہا کہ میں اس قدر بیمار اور کمزور تھا کہ بالاخانہ سے اترنا دشوار تھا، دہلی کے راستے میں مجھے یاد آیا۔

دوسرے مشائخ اور بزرگوں سے تعلق:

اس عرصہ میں دوسرے مشائخ اور مولانا گنگوہیؒ کے دوسرے خلفاء سے عقیدت مندی اور محبت و استفادہ کا تعلق برابر قائم رہا، شاہ عبدالرحیم صاحبؒ رائے پوری، مولانا محمود حسن صاحب

---

[1] واقعہ بیان کرنے کی تقریب یہ ہوئی کہ قاری اسحاق صاحب دہلوی (جو جناب مفتی عزیز الرحمن صاحب نقشبندی دیوبندی کے خلیفہ ہیں) مرض وفات میں عیادت کے لیے آئے اور فرمایا کہ میں بالکل آنے کے قابل نہ تھا۔ لیکن بہت اصرار شوق تھا جو یہاں لے آیا، فرمایا: حضرت جذب و شوق میں بڑی قوت ہے۔ اس پر یہ واقعہ بیان فرمایا۔

دیوبندی اور مولانا اشرف علی تھانوی سے ایسا تعلق تھا کہ فرماتے تھے کہ یہ حضرات میرے جسم و جان میں بسے ہوئے تھے، اور ان حضرات کو بھی مولانا کی امتیازی خصوصیات کی وجہ سے خصوصی محبت اور دلی لگاؤ تھا۔

مجاہدانہ جذبات:

ذکر و اشغال، نوافل و عبادات کے ساتھ شروع سے مجاہدانہ جذبات سینے میں موجزن تھے، اور جاننے والے جانتے ہیں کہ اس جذبہ و شوق اور اس عزم و نیت سے آپ کی زندگی کا کوئی دور خالی نہیں رہا، اسی کا نتیجہ تھا کہ مولانا محمود حسن صاحبؒ کے ہاتھ پر بیعت جہاد کی۔

بزرگوں کی نگاہ میں آپ کی وقعت:

ابتداء ہی سے خاندان کے بزرگوں اور مشائخ وقت کی نگاہ میں خاص عزت رکھتے تھے، اور کم سنی کے باوجود بڑے بڑے معمر بزرگ آپ کا وقار لحاظ کرتے تھے۔ مولانا محمد یحییٰ صاحب باپ کی جگہ پر تھے مگر آپ کا برتاؤ بھی چھوٹے بھائی کے ساتھ ایسا تھا جیسا حضور ﷺ کا حضرت عثمانؓ کے ساتھ تھا۔

شروع سے چونکہ نحیف و نزار تھے اس لئے جسمانی مشقت کے کاموں میں حصہ نہ لے سکتے تھے اور مطالعہ و ذکر و عبادت ہی میں زیادہ وقت صرف ہوتا تھا۔ مولانا یحییٰ صاحب اس کے برعکس بے حد مشغول و جفاکش تھے، آپ کا تجارتی کتب خانہ تھا جس کے تمام کام بڑی دلچسپی اور اہتمام سے انجام دیتے، اور یہ ان بھائیوں کا ذریعہ معاش بھی تھا، ایک روز کتاب خانہ کے منتظم نے جو مولانا یحییٰ صاحب کے بڑے مخلص اور ہمدرد تھے، ازراہ ہمدردی کہا کہ مولوی الیاس کتب خانہ کے کاموں میں کچھ ہاتھ نہیں بٹاتے، کوئی خدمت ان کے ذمہ بھی کر دینی چاہیے، اس لئے کہ یہ بھی اس سے منتفع ہوتے ہیں۔ مولانا یحییٰ صاحب نے سنا تو بہت تکدر کا اظہار فرمایا اور کہا "حدیث میں آتا ہے "هل ترزقون و تنصرون الا بضعفائكم" [1] (تم کو جو رزق ملتا ہے اور تمہاری خدا کی طرف سے جو مدد ہوتی ہے وہ تمہارے کمزوروں افراد ہی کی برکت سے تو ہوتی ہے) میرا اعتقاد

۱؎ بخاری (مرسل) (شیخ حافظ ابوبکر برقانی اسحٰق)

ہے کہ مجھے اسی بچے کی برکت سے رزق مل رہا ہے۔ آئندہ اس سے کچھ نہ کہا جائے جو کچھ کہنا ہو مجھ سے کہا جائے۔

شیوخ و اکابر کے سامنے بھی خاص امتیاز و اعزاز کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ آپ کا خشوع و خضوع سب کو معلوم تھا اس لئے کبھی کبھی اکابر کی موجودگی میں امامت کے لئے آپ ہی کو بڑھایا جاتا۔

ایک مرتبہ گنگوہ میں شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری، مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری اور مولانا اشرف علی صاحب تھانوی موجود تھے، نماز کا وقت آیا تو امامت کے لئے آپ کو بڑھایا۔ مولوی بدرالحسن صاحب خاندان کے ایک بزرگ موجود تھے۔ انہوں نے ازراہ ظرافت کہا کہ ساری بڑی بڑی گاڑیاں اور ایسا ہلکا پھلکا انجن جوڑ دیا، حضرات میں سے کسی نے کہا کہ یہ تو انجن کی طاقت پر ہے [1]۔

مظاہر العلوم میں خدمت تدریس:

شوال 1328ھ میں سہارنپور میں ایک بڑا قافلہ حج کو روانہ ہوا، جس میں مدرسہ مظاہر العلوم کے اکثر بڑے بڑے حضرات مدرسین تھے۔ اس موقع پر متعدد نئے اساتذہ کا تقرر ہوا، ان میں مولانا بھی مدرسہ کے نئے مدرسین میں شامل ہوئے اور متوسط کتابیں آپ کو دی گئیں۔ حضرات حج کی واپسی کے بعد دوسرے جدید اساتذہ سبکدوش ہو گئے مگر مولانا بدستور تدریس کی خدمت میں انجام دیتے رہے [2]۔

مظاہر العلوم کی تدریس کے زمانہ میں اکثر کتابیں ایسی پڑھائیں جو پہلے پڑھی نہیں تھیں، اس لئے کہ مولانا محمد یحییٰ صاحب کے درس میں کتابوں کے پورا کرنے کا معمول نہ تھا، اور بیماری کی وجہ سے بعض درمیانی کتابیں رہ گئی تھیں [3] لیکن زمانہ تدریس میں آپ نے یہ کتابیں بھی پڑھائیں [4]۔ لیکن پڑھانے کے زمانے میں مطالعہ کی طرف بڑی توجہ تھی۔ چنانچہ [illegible]

---

1 (روایت مولوی اکرام الحسن صاحب کاندھلوی) 2 (شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب)

3 (یعنی) اپنے انتقال سے چند سال قبل ایک مرتبہ مولانا [illegible] صاحب [illegible] مدرس جامعہ [illegible]

مولانا کی خدمت میں [illegible] صاحب نے مولانا کو یاد دلایا کہ [illegible]

میں مدرسی [illegible] آپ نے [illegible] پڑھی [illegible] حضرت [illegible] آپ اس زمانہ

میں [illegible] کرتے تھے اور [illegible] بیان کرتے تھے۔ مولانا نے [illegible] فرمایا (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کے لئے بحرالرائق، شامی اور ہدایہ دیکھتے تھے اور نور الانوار کے لئے حسامی کی شرح و توضیح تک مطالعہ میں رہتی تھیں[1]۔

نکاح: ۱۷ ذیقعدہ ۱۳۳۰ھ (۱۷ اکتوبر ۱۹۱۲ء) کو جمعہ کے دن بعد نماز عصر کے آپ کے حقیقی ماموں مولوی رؤف الحسن صاحب کی صاحبزادی سے آپ کا عقد ہوا، مولانا محمد صاحب نے نکاح پڑھایا۔ مجلس عقد میں مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری، شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری اور مولانا اشرف علی صاحب تھانوی تینوں حضرات موجود تھے۔ مولانا تھانوی کا مشہور وعظ "فوائد الصحبت" جو بارہا طبع ہو چکا ہے، اسی تقریب میں کاندھلہ تشریف لے جانے پر اسی دن ہوا۔

پہلا حج: ۱۳۳۳ھ میں مولانا خلیل احمد صاحب اور مولانا محمود حسن صاحب نے حج کا قصد فرمایا۔ مولانا کو جب اس کا علم ہوا تو حج کے لئے بہت بے قرار ہوئے، فرماتے تھے کہ مجھے ان حضرات کے بعد ہندوستان تاریک ہوتا نظر آیا، اور یہاں کا رہنا مشکل معلوم ہونے لگا، لیکن اجازت کا مرحلہ درپیش تھا۔ عجیب کشمکش کی حالت تھی، ہمشیرہ (والدہ مولوی اکرام الحسن صاحب) نے بے قراری دیکھی تو کہا کہ میرا زیور لے لو اور چلے جاؤ، امید نہ تھی کہ والدہ صاحبہ آسانی سے اجازت دیں گی اور اتنی طویل مفارقت اور اتنا دور دراز کا سفر گوارا کریں گی، مگر بحمد اللہ انہوں نے بھی اجازت دے دی دوسرا مرحلہ بھائی مولانا محمد یحییٰ صاحب کی اجازت کا تھا، انہوں نے یہ سمجھ کر والدہ اجازت نہ دیں گی، ان کی اجازت پر محمول کیا، وہ اجازت دے چکی تھیں[2]، آخری مرحلہ مولانا خلیل احمد صاحب کی اجازت کا تھا۔ ان کی خدمت میں خط لکھا اور سامان سفر کی سب صورتیں لکھ دیں، کہ ایک صورت یہ ہے کہ ہمشیرہ کا زیور لیا جائے، دوسری قرض، تیسرے بعض اعزہ دے رہے ہیں۔ مولانا نے سفر کی اجازت دی اور تیسری صورت کو ترجیح دی[2]۔ خلاف امید مولانا محمود حسن صاحب کی ہمرکابی ہو گئی۔ مولانا خلیل احمد صاحب پہلے جہاز سے تشریف لے جا چکے تھے۔ آپ دوسرے جہاز سے شوال ۱۳۳۳ھ میں مولانا کے ہمراہ روانہ ہوئے اور ربیع الثانی ۱۳۳۴ھ میں واپس آکر مدرسہ میں فرائض تدریس میں بدستور مشغول ہو گئے[3]۔

(بقیہ حاشیہ) کسی دوسرے موقع پر مجھ سے فرمایا کہ مولوی ہدایت علی صاحب قطبی پڑھانے کا ذکر کرتے ہیں، میں نے قطبی خود نہیں پڑھی تھی، مدرسہ میں پڑھائی ہے۔ [1] شیخ الحدیث مولانا زکریا

[2] از مولوی اکرام الحسن صاحب و مولوی انعام الحسن صاحب [3] شیخ الحدیث مولانا زکریا

مولانا محمد یحییٰ صاحب کی وفات:

حج کے دوسرے سال 10 ذیقعدہ 1334ھ میں مولانا محمد یحییٰ صاحب نے انتقال کیا۔ یہ سانحہ مولانا کے لئے بڑا صبر آزما تھا۔ مولانا محمد یحییٰ صاحب مربی بھی تھے، استاد بھی، شفیق بھائی بھی تھے۔ اپنی امتیازی خصوصیات [1] اور محبوبیت و مقبولیت کی وجہ سے پورے حلقہ احباب کو مولانا کی مفارقت کا سخت صدمہ ہوا۔ لیکن مولانا محمد الیاس صاحب کے دل پر اس صدمے کی چوٹ لگی، اس کا درد آخر تک محسوس ہوتا تھا، معمول تھا کہ جب مرحوم بھائی کا ذکر کرتے تو ایک محویت کی طاری ہو جاتی اور سب کچھ بھول جاتے۔ ان کے اوصاف، کمالات اور ان کے واقعات کو مزہ لے لے کر ذکر کرتے اور فرماتے، حضرت میرے بھائی ایسے تھے، خصوصیات کے ساتھ ان کی جامعیت، مصالحانہ روش، اعتدال طبیعت، مختلف عناصر اور بظاہر متضاد کو جمع رکھنے اور خداداد قابلیت، غیر معمولی ذکاوت اور سلامت فہم کے واقعات بڑی تفصیل اور دلچسپی سے سناتے تھے، علوم میں آپ کے بعض تحقیقی نکات اور حکایت کا حوالہ دیتے۔

---

[1] مولانا محمد یحییٰ صاحب عجیب باغ و بہار طبیعت کے رکھتے تھے۔ بلا مبالغہ ایام بالنہار راتوں کو بہت رونے والے، دن کو بہت مسکرانے والے (؟) آپ کی صفت تھی، عمر کے آخری حصے تک اپنے تکلفوں اور بذلہ سنجیوں سے باغ و بہار رہے ہیں۔ وہ دیدۂ گریاں و روئے خنداں اور زبان گل افشاں کا پورا مجموعہ، ان کے سوز و گداز اور راتوں کے رونے و نیاز کی خبر بہت کم لوگوں کو تھی۔ معمولی آدمیوں کی طرح رہتے، مدرسہ میں پڑھاتے اور گزر اوقات کے لیے، معاش کے لئے ایک تجارتی کتب خانہ قائم کر رکھا تھا جس کا کام اپنے ہاتھ سے کرتے۔ درس کی کوئی کتاب اپنے حفظ سے پڑھا رہے ہیں اور پارسل بھی بنائے جا رہے ہیں۔ علوم سے اعلیٰ مناسبت رکھتے تھے اور مختصات نظر تھی۔ ادب و حدیث کی کتابیں خاص طور پر مستحضر تھیں۔ مفصل تذکرہ کے لئے ملاحظہ تذکرہ کیا جائے)

باب دوم

بستی حضرت نظام الدین کا قیام، تدریس اور اہتمام

مولانا محمد صاحب کی وفات:

مولانا محمد یحییٰ صاحب کی وفات کے دو سال بعد 25 ربیع الثانی 1336ھ شب جمعہ کو بڑے بھائی مولانا محمد صاحب نے انتقال کیا۔

مولانا محمد صاحب ایک فرشتہ سیرت انسان تھے۔ حلم و تواضع، مروت و شفقت اور خشیت و انابت کی مجسم تصویر، اور عباد الرحمن الذین یمشون علی الارض ھونا الایۃ) کا ایک نمونہ، کم گو، بے آزار، عزلت پسند اور اپنے کام سے کام رکھنے والے بزرگ تھے، متوکلانہ و زاہدانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ نظام الدین کی بنگلہ والی مسجد میں اپنے والد ماجد کی جگہ قیام تھا۔ ایک مدرسہ تھا جو ان کے والد مرحوم کا جاری کیا ہوا تھا، جس میں ابتدائی تعلیم ہوتی تھی اور زیادہ تر میوات کے بچے پڑھتے تھے۔ توکل و قناعت پر مدرسہ کا کام چلتا تھا۔ دہلی اور میوات میں آپ سے بہت سے لوگ ارادت و عقیدت رکھتے تھے، اور دونوں جگہ آپ سے فیض[1] تھا۔ مولانا محمد صاحب کی صورت سے تقویٰ کا سبق ملتا تھا، انوار کی چہرے پر نہایت کثرت تھی، اکثر وعظ بھی فرماتے تھے، مگر بیٹھ کر، جیسے کوئی باتیں کرتا ہو، مسلسل تقریر کی صورت نہیں تھی، بلکہ اخلاق و زہد کی احادیث سناتے اور ان کا سادہ ترجمہ اور مطلب بیان فرما دیتے۔

کسی زمانے میں آنکھ کے قریب کوئی پھنسی نکلی تھی، جس پر پکنے کے بعد جگہ سے سات شگاف آئے، ڈاکٹروں نے کلورا فارم ضروری بتایا مگر انہوں نے شدت سے انکار کیا اور یونہی بے حس و حرکت لیٹے رہے۔ ڈاکٹر متحیر تھے کہ ہم نے عمر بھر اس کی نظیر نہیں دیکھی۔

مولانا محمد صاحب نہایت ذاکر و شاغل اور خوش اوقات بزرگ تھے، حدیث مولانا گنگوہیؒ سے پڑھی تھی۔ انتقال سے پہلے 16 سال تک ان کی تکبیر فوت نہیں ہوئی، آخر وقت تک نماز جماعت

---

1 (ان حاجی عبدالرحیم صاحب (شاگرد مولانا محمد صاحب) وغیرہ

سے پڑھی، عشاء کی نماز کے بعد وتر کے سجدے میں انتقال ہوا[1]۔

نظام الدین منتقل ہونے کی تجویز:

مولانا محمد الیاس صاحب بڑے بھائی صاحب کی تیمارداری کے لئے پیشتر سے دہلی تشریف لائے تھے، علاج کی غرض سے قصاب پورے میں نواب والی مسجد میں قیام تھا، وہیں مولانا محمد صاحب کا انتقال ہوا۔ جنازہ حسب سابق نظام الدین آیا، جنازے میں بڑا ہجوم تھا۔

دفن کے بعد خاندان کے محبین و معتقدین نے مولانا محمد الیاس صاحب سے اصرار کیا کہ اب یہیں قیام فرمائیں اور والد اور بھائی کی جگہ کو جو ان کی وفات سے خالی ہو گئی ہے، آباد کریں، حاضرین نے مدرسہ کی اعانت و خدمت کا وعدہ بھی کیا، اور مصارف کے لئے کچھ ماہوار رقمیں مقرر کیں، جو مولانا نے اپنے اصول اور خاص شرائط (جن کا آخر تک التزام رہا) کے ساتھ منظور کیں[2] لیکن اپنی آمد کو حضرت سہارنپوریؒ کی اجازت پر معلق کیا۔ انہوں نے کہا کہ ہم خود جاکر اجازت لے آئیں، فرمایا کہ اس طرح اجازت نہیں ہوتی، میں تنہا اجازت لوں گا۔

بھائی صاحب کی تجہیز و تکفین اور مدرسہ کے عارضی انتظام سے فرصت پاکر آپ سہارنپور آئے اور مولانا سے ساری کیفیت بیان کی، اہل تعلق کے پیہم اصرار اور اس چشمہ فیض کے جاری رہنے کے خیال سے جو دونوں قدسی سیرت باپ بیٹے کی ذات سے فیض رساں تھا، مولانا نے نظام الدین منتقل ہونے کی اجازت دے دی، اور از راہ احتیاط فرمایا کہ فی الحال تجربہ کیلئے مدرسے سے ایک سال کی رخصت لیجئے، اگر وہاں کا قیام راس آئے اور مستقل سکونت کی رائے قرار پا جائے تو مستقل علیحدگی ہر وقت ممکن ہے[3]۔

اس اجازت اور مشورہ کے مطابق آپ نے مہتمم صاحب مدرسہ مظاہر العلوم کی خدمت میں ضابطہ کی درخواست پیش کر دی جو بجنسہ درج ذیل ہے:

''بعد سلام مسنون آنکہ سانحہ انتقال اخوی جناب مولوی محمد صاحب کی وجہ سے بندہ کو نظام الدین کے مدرسہ کے انتظام و خبر گیری کے واسطے وہاں کچھ قیام کرنے کی

1۔ (تحریر مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی) 2۔ (مولانا محمد الیاس صاحب)

ضرورت ہے، چونکہ اکثر اہل شہر و محبان بندہ وخیر خواہان تمام متفق ہیں کہ بنفس بندہ
وہاں اقامت کرے، اور جو منافع و اشاعت علوم حضرت والد حضرت و برادر مرحوم کی
سعی و تعلیم سے ان کو رزدہ و گنوار لوگوں میں اور عموم سے نہایت بعید اور نا آشنا لوگوں
میں ہوئی ہے، اس کو دیکھ کر اپنے دل میں بھی حرص پیدا ہوتی ہے کہ کچھ دنوں وہاں قیام
کر کے اس کے اجرا کا بندوبست کرسکوں اور اس دینی حصے میں بھی کچھ حصہ لے لوں،
لہذا عارض ہوں کہ ایک سال کے لئے بندہ کی رخصت منظور فرمائی جائے۔

فقط والسلام بندہ محمد الیاس اختر عفی عنہ"

تشویشناک علالت اور زندگی سے مایوسی:

ابھی نظام الدین جانے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ یک لخت علیل ہو گئے، 20 جمادی الاولیٰ 36ھ کو
بیماری کی حالت میں سہارنپور کاندھلہ پہنچے، وہاں جا کر مرض نے شدت اختیار کی، اور ذات
الجنب کا دورہ شدید ہوا، ایک رات (جو جمعہ کی رات تھی) سب مایوس ہو گئے، نبضیں ساقط ہو
گئیں، ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے، لوگوں کی زبان پر انا للہ تھی لیکن اللہ تعالیٰ کو تو ابھی کام لینا تھا،
تیمارداروں کی توقع اور ظاہر حالات کے بالکل خلاف طبیعت سنبھلنے لگی، صحت کے آثار شروع ہو
گئے اور چند دنوں میں اچھے ہو کر بستر سے اٹھ گئے، گویا زندگی دوبارہ ہوئی [1]

نظام الدین منتقلی:

کاندھلہ سے تندرست ہو کر آپ نظام الدین آ گئے، اس وقت نظام الدین کے اس جانب کوئی
آبادی نہ تھی، اور مسجد کے قریب و جوار میں جنگل ہی جنگل تھا، مولانا احتشام الحسن صاحب جو کچھ
مدت کے بعد مولانا کے ساتھ بچپن ہی میں نظام الدین آ گئے تھے، بیان کرتے ہیں باہر نکل کر اس
شوق میں کھڑا رہتا کہ کسی انسان کی صورت نظر آ جائے، اگر کوئی آدمی نظر آ جاتا تو ایسی خوشی ہوتی
جیسے کسی نادر تحفہ چیز کو دیکھ کر ہو۔

ایک مختصر سی پختہ مسجد اور ایک بنگلہ اور ایک حجرہ و دروازہ کے جنوب میں درگاہ سے متعلق لوگوں کی

---

[1] شیخ الحدیث مولوی اکرام الحسن صاحب کاندھلوی

آبادی تھی۔ کچھ تھوڑے سے میواتی اور غیر میواتی غریب طالب علم، بس یہ مدرسہ و مسجد، اس کی عمارتوں اور اس کی آبادی کی کل کائنات تھی۔

مدرسہ کی کوئی ایسی آمدنی نہ تھی جس سے آسانی کے ساتھ اس کے اخراجات پورے ہوں، توکل علی اللہ، قناعت اور اس کے مہتمم کی دست مالی اصل سرمایہ تھا، بڑی تنگی اور سختی کے ساتھ گزران ہوتی تھی، کبھی کبھی فاقہ کی نوبت آجاتی، مگر مولانا کے ابرو پر بل نہ آتا، بعض اوقات اعلان فرما دیتے کہ آج کھانے کو نہیں ہے، جس کا جی چاہے رہے اور جس کا چاہے چلا جائے اور اپنا کہیں اور انتظام کر لے، طلبہ کی بھی ایسی ہی روحانی تربیت ہوئی تھی کہ کوئی جانے کے لئے تیار نہ ہوتا۔ بعض اوقات جنگلی پھلوں (گولر وغیرہ) سے پیٹ بھر لیا جاتا، طلبہ خود جنگل سے لکڑی لا کر روٹی پکاتے اور چٹنی سے کھاتے، مولانا اس تنگی سے نہ صرف ہراساں نہ تھے، بلکہ اس فارغ البالی اور کشائش سے ڈرتے اور اپنے ساتھیوں کو ڈراتے رہتے تھے جس کی مولانا کو بھی امید تھی، اور اللہ کی سنت کے مطابق اس امتحان و آزمائش کے بعد آنے والی تھی[1]۔

مولانا کو مدرسہ کی ظاہری حالت اور تعمیر کی طرف بالکل توجہ نہ تھی۔ آپ کے رفیق قدیم مدرسہ کے سابق طالب علم حاجی عبد الرحمن صاحب[2] کی سعی پر مولانا کی طبیعت کے خلاف دہلی کے بعض حضرات نے کچھ حجرے تعمیر کرا دیئے، مولانا واپس تشریف لائے تو سخت ناراض ہوئے، مدت تک حاجی صاحب سے نہیں بولے، اور فرمایا کہ اصل چیز تعلیم ہے، مدرسہ کی عمارت جب سے پکی ہوئی تعلیم کچی ہو گئی۔

۱۔ [illegible]
۲۔ [illegible]

ایک مرتبہ دہلی کے ایک بڑے تاجر نے کسی اہم معاملے میں دعا کی درخواست کی اور ایک معقول رقم نذر کی آپ نے دعا کا وعدہ کیا اور رقم وصول کرنے سے عذر کیا، مگر حاجی عبدالرحمن صاحب نے مدرسہ کی ضرورت کے خیال سے لے لیا، آپ برابر بے چین رہے، اور بہ اصرار وہ رقم واپس کرائی۔

حاجی صاحب سے فرماتے تھے کہ دین کا کام پیسوں سے نہیں چلتا، اگر دین کا کام پیسوں سے چلتا تو حضور ﷺ کو بہت کچھ مال و دولت ملتی۔

مجاہدہ و عبادت:

یہ زمانہ مولانا کے بڑے مجاہدہ و ریاضت کا تھا۔ یہ ذوق موروثی اور فطری تھا، نظام الدین کے قیام میں اس کا زیادہ ظہور ہوا۔ خلوت و ریاضت کی طرف اس زمانے میں خاص میلان تھا، حاجی عبدالرحمن صاحب راوی ہیں کہ عرب سرا کے پھاٹک حضرت نظام الدین اولیاء کی قدیم عبادت گاہ (ہمایوں کے مقبرے کے شمال میں عبدالرحیم خانخاناں کے مقبرے اور حضرت مرزا مظہر جانجاناںؒ کے شیخ حضرت نور محمد بدایوانی کے مزار کے قریب) پہروں خلوت میں رہتے۔ کھانا دوپہر کا عموماً وہاں چلا جاتا، رات کو مکان پر آکر کھاتے، نماز سب وقتوں کی جماعت کے ساتھ پڑھتے، ہم لوگ جماعت کرانے میں وہیں چلے جاتے، طلبہ سبق پڑھنے کبھی وہیں پہنچ جاتے، کبھی چکر والی مسجد میں آکر پڑھاتے۔

حدیث کا درس دیتے تو پہلے وضو کرتے، پھر دو رکعت نماز پڑھتے اور فرماتے کہ حدیث کا حق تو اس سے زیادہ ہے، یہ اقل درجہ ہے۔ حدیث پڑھاتے وقت کسی سے بات نہ کرتے، کوئی معزز آدمی آجاتا تو درس چھوڑ کر اس کی طرف التفات نہ فرماتے۔

متعلقین ساتھ تھے، کبھی کھانے کے وقت بے وقت ہو جانے پر خفا نہ ہوتے، کھانے میں کبھی عیب نہ نکالتے۔

درس کا انہماک و محنت:

مدرسہ کے اسباق اور طلبہ کی طرف ہمہ تن متوجہ رہتے، بڑی جانکاہی اور جانفشانی کے ساتھ طلبہ کو چھوٹے چھوٹے سبق پڑھاتے، بعض ایام میں 80،80 طلبہ خود پڑھائے یا طالب علموں سے پڑھوائے، مشغولیت اور انہماک کا اندازہ اس سے ہوگا کہ کسی زمانہ میں مستدرک حاکم کا درس صبح

کی نماز سے پہلے ہوتا تھا [1]۔

مولانا طریق تعلیم اور کتب درس میں بھی ایک خاص طرز اور ذاتی رائے رکھتے تھے، مطالعہ پر زیادہ زور تھا، چاہتے تھے کہ سبق ایسا تیز کر کے لایا جائے کہ حل کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے، عبارت کی صحت، عربیت اور صرف و نحو کے قواعد کے عملی اجراء کی طرف خاص توجہ تھی۔ کتابوں میں عام مدارس کے نصاب و نظام کی پابندی نہ تھی، بہت سی ایسی کتابیں زیر درس تھیں جن کی تعلیم کا مدارس میں رواج نہیں ہے۔ مسائل کے ذہن نشین اور مستحضر کرنے اور طلبہ کی تفہیم کی قدرت پیدا کرنے کے لئے نئی نئی صورتیں اختیار فرماتے جو بہت موثر اور کارگر ہوتیں۔

[1] (روایت مولانا سید رضا حسن صاحب)

باب سوم

میوات میں اصلاح تعلیم کے مرکز کی ابتداء

میوات:

دہلی کے جنوب کا وہ علاقہ جس میں میو قوم آباد ہے، میوات کہلاتا ہے، اس علاقہ میں اس وقت گوڑگانوہ (انبالہ کمشنری صوبہ پنجاب) کا انگریزی ضلع الور اور بھرت پور کی ہندو ریاستیں اور صوبجات متحدہ کے ایک ضلع متھرا کا کچھ حصہ شامل ہے، تمام علاقوں کی طرح اس علاقے کے حدود اور رقبہ میں تغیرات پیش آئے۔ قدیم اور اصلی میوات کا رقبہ موجودہ علاقے سے ضرور کچھ مختلف تھا۔

ایک انگریز مصنف نے قدیم میوات کی حد بندی اس طرح کی ہے۔

"قدیم علاقہ میوات اندازاً اس مخنی خط کے اندر واقع ہے، جو شمالاً ڈیگ سے (جو بھرت پور میں ہے) ریواڑی کے عرض البلد کے کسی قدر اوپر تک پھیلا ہوا ہے۔ غرباً ریواڑی کے نیچے طول البلد کے اس نقطہ کی تک جو شہر الور کے چھ میل کے فاصلے پر مغرب میں اور الور کے اندر بارہ چشمہ کے جنوب میں واقع ہے، یہ خط پھر شرقاً گھوم کر ڈیگ سے مل جاتا ہے اور قریب قریب اس خط کی جنوبی سرحد بناتا ہے"۔

میو قوم: انگریز مورخین کا خیال ہے کہ میو آرین نسل کے بجائے ہندوستان کی قدیم غیر آرین نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور اس طرح ان کی تاریخ آرین نسل کے راجپوت خاندانوں سے زیادہ قدیم ہے۔ میوات کے خان زادوں کے متعلق ان کا بیان ہے کہ وہ نسلاً راجپوت ہیں، فارسی تاریخوں میں میواتی کا لفظ جہاں آتا ہے، اس سے مراد یہی خان زادے ہیں۔ آئین اکبری سے معلوم ہوتا ہے کہ جادو راجپوت مسلمان ہونے کے بعد میواتی کہلائے۔

تاریخ فیروز شاہی میں میوات کا نام سب سے پہلے شمس الدین التمش کے تذکرے میں آتا ہے۔ دہلی کی مسلمان سلطنت کے ابتدائی دور میں میواتی بہت ہی تکلیف دہ عنصر بن گئے تھے، بڑے بڑے گھنے جنگلوں کی مدد سے جو دہلی تک چلے گئے تھے، انہوں نے دہلی پر تاخت کرنی شروع کر دی تھی

اور ان کے خوف سے دارالسلطنت کے دروازے سرِ شام بند ہو جاتے تھے۔ شام ہوتے ہی شہر پناہ کے کوئی باہر نکلنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا، رات کو بھی وہ کسی نہ کسی طرح شہر کے اندر داخل ہو جاتے اور لوٹ کی تلاش و جستجو میں پھرتے رہتے تھے۔ اہل شہر بہت پریشانی محسوس کرتے تھے، غیاث الدین بلبن نے ان کے خلاف ایک بڑی مہم بھیجی، میواتیوں کی ایک بہت بڑی تعداد قتل ہوئی، نیز شہر میں افغانوں کی چوکیاں نصب کی گئیں اور دہلی کے آس پاس کا جنگل بھی فوج کے ذریعہ صاف کیا گیا اور زراعتی زمین بنا دیا گیا[1]۔ اس کے بعد تقریباً ایک صدی تک تاریخ میں میوات کا ذکر نہیں آتا۔

اس واقعہ کے بعد میوات کے جنگجو وقتاً فوقتاً مرکز کو پریشان کرتے رہے اور سلطنت کو ان کے خلاف تادیبی کارروائیاں کرنے کی ضرورت پیش آتی رہی۔ اس سلسلہ میں بہادر ناہر اور اس کے بعض جانشینوں کا نام تاریخ میں خصوصیت کے ساتھ آتا ہے جنہوں نے اپنی دلیری اور قابلیت سے میوات میں حکومت قائم کر لی تھی جو مرکزی سلطنت کی شکست کے بعد ایک علاقائی جاگیر کی صورت میں رہ گئی۔

خانزادوں میں سے ایک دوسرے ذمہ دار لکھن پال کا قبضہ پورے میوات اور مضافات پر تھا، فیروز شاہ کے زمانہ میں اس نے اسلام قبول کیا۔

میو قوم نے اسلام کب قبول کیا؟ اور کون سے واقعات اور اثرات اس کا باعث اور محرک ہوئے قوم یا اس کی اکثریت نے دفعتاً اسلام قبول کیا یا تدریجی طور پر صدیوں میں یہ قوم اسلام کی طرف منتقل ہوئی، یہ وہ سوالات ہیں جن کا جواب متعین اور یقینی طور پر دینا اب ممکن نہیں۔ اس قوم کی ابتدائی تاریخ اور خصوصاً اس کے مسلمان ہونے کی تاریخ تاریکی میں ہے، سوائے روایات اور بیانات کے (جن میں خود تعارض و اضطراب ہے) کوئی تاریخی ماخذ نہیں[2]۔

میواتیوں کی دینی اور اخلاقی حالت:

مسلمانوں کی طویل اور مسلسل غفلت اور اس قوم کی بے توجہی اور جہالت سے میو قوم کی دینی

۱۔ (تاریخ فرشتہ) [illegible]

[2] [illegible]

حالت اس درجہ پر پہنچ گئی تھی جس کے بعد قومی ارتداد کے سوا کوئی درجہ نہ تھا، غیر مسلم مورخین تک بھی (جن کی حس اس بارے میں ایک مسلمان کی حس سے یقینا کم ہونی چاہیے) میواتیوں کو اسلام سے دوری اور بیگانگی کا احساس ہے۔ مندرجہ ذیل اقتباسات سے اندازہ ہوگا کہ یہ قوم کا دینی تنزل اور اخلاقی انحطاط اور اسلام سے بیگانگی کس حد تک پہنچ گئی تھی۔

میجر پاؤلٹ جو انیسویں صدی کے آخر میں ریاست الور کا افسر بندوبست رہا ہے الور کے گزیٹیر شائع شدہ 1878ء میں لکھتا ہے:

"میو اب تمام مسلمان ہیں، لیکن برائے نام، ان کے گاؤں کے دیوتا وہی ہیں جو ہندو زمینداروں کے ہیں، وہ ہندوؤں کے کئی تہوار مناتے ہیں۔ ہولی میواتیوں میں مذاق اور کھیل کھیلنے کا زمانہ ہے اور اتنا ہی اہم اور ضروری سمجھا جاتا ہے۔ جتنا محرم، عید اور شب برات، اسی طرح وہ جنم اشٹمی، دسہرا اور دیوالی بھی مناتے ہیں۔ ان کے یہاں "پیلی چٹھی" لکھنے کے لئے شادی کی تاریخ مقرر کرنے کے لئے برہمن پنڈت بھی ہوتے ہیں۔ ایک رام کے لفظ کو چھوڑ کر وہ ہندوانہ نام بھی رکھتے ہیں، اگرچہ خان جتنا ان کے ناموں کے آخر میں ہوتا ہے، اتنا نہیں لیکن پھر بھی بکثرت سنگھ ان کے ناموں کا آخر جزو ہوتا ہے۔ اماوس میں میو بھی ہندو اہیروں اور گوجروں کی طرح چھٹی مناتے اور کام کاج بند کردیتے ہیں۔ جب وہ نیا کنواں تعمیر کرتے ہیں تو سب سے پہلے بیرو جی یا ہنومان کے نام کا چبوترہ بناتے ہیں، البتہ جب ان کو مال غنیمت حاصل کرنا ہوتا ہے تو وہ ہندو استھانوں اور مندروں کی زیادہ تعظیم و تقدیس نہیں کرتے اور جب اس موقع پر ان استھانوں اور مندروں کا تقدس ظاہر کیا جاتا ہے تو وہ بے تکلف کہہ دیتے ہیں کہ "تم دیو ہم میو"۔ میو اپنے مذہب (اسلام) سے بہت ناواقف ہیں۔ خال خال کوئی کلمہ جانتا ہے، اور پابندی سے نماز پڑھنے والے اس سے بھی کم ہیں اور ان کے اوقات مسائل سے تو وہ بالکل ہی ناواقف ہیں"۔

"یہ سب الور کے میواتیوں کے متعلق کہا گیا ہے، انگریزی علاقہ (ضلع گوڑگانوہ) میں مدرسوں کی وجہ مذہبی فرائض کی پابندی کی حالت کچھ بہتر ہے، الور کے بعض مقامات میں بھی جہاں مسجد میں ہیں مذہبی فرائض کی پابندی کچھ زیادہ ہے اور کچھ لوگ کلمہ بھی جانتے ہیں، بعض نماز بھی

پڑھتے ہیں اور مدرسہ کا کچھ شوق بھی پایا جاتا ہے"۔

"جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، شادی کی ابتدائی رسوم میں برہمن حصہ لیتے ہیں لیکن اصل رسم قاضی انجام دیتے ہیں۔ مرد دھوتی اور کمری پہنتے ہیں، پاجامہ کا رواج نہیں، ان کا لباس حقیقتاً ہندوانہ ہے، امرد سونے کے زیور بھی استعمال کرتے ہیں"۔

دوسرے مقام پر لکھتا ہے

"میو اپنے عادات میں آدھے ہندو ہیں۔ ان کے گاؤں میں شاذ و نادر ہی مسجدیں ہوتی ہیں، تحصیل نوح میں میوؤں کے باون گاؤں میں صرف آٹھ مسجدیں ہیں، البتہ مندروں کو چھوڑ کر میوؤں کی عبادت کی ویسی ہی جگہیں بنی ہوتی ہیں، جیسی ان کے ہمسایہ ہندوؤں کے یہاں ہوتی ہیں، مثلاً پانچ پیرا، کھسیا اور چابنڈ، چامنڈ یا کھیڑا مہادیوی کے نام ہوتا ہے جس پر قربانیاں چڑھائی جاتی ہیں۔

شب برات میں سید سالار مسعود غازی کا جھنڈا بھی ہر میو گاؤں میں پوجا جاتا ہے"۔

ضلع گوڑگانوہ کے گزیٹیر (شائع شدہ 1910ء) میں ہے:

GAZETTEIR OF ULWURA 1987 LONDON

"میو ابھی تک بہت ڈھیلے ڈھالے اور لاپرواہ قسم کے مسلمان رہے ہیں، وہ اپنی ہمسایہ قوم کے اکثر رسم و رواج میں شریک ہیں بالخصوص ان رسوم میں جو زرعی سبب در بہ طلف ہوتی ہیں، ان کا اصول یہ معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی جشن اور تہوار تو دونوں قوموں کے مناؤ اور فرائض اور مذہبی پابندیاں کسی ایک کی بھی پوری نہ کرو۔ کچھ عرصہ سے میوات میں کچھ مذہبی معلم پیدا ہو گئے ہیں اور کچھ میو رمضان کے روزے بھی رکھنے لگے ہیں۔ گاؤں میں مسجدیں بننے لگے ہیں، نمازیں بھی پڑھنے لگے ہیں، ان کی عورتیں ہندوانہ گھگروں کے بجائے پاجامے بھی پہننے لگی ہیں، یہ سب مذہبی بیداری کی علامات ہیں"۔

بھرت پور کی گزیٹیر میں ہے:

"میوؤں کے رسوم ہندوؤں اور مسلمانوں کے رسم و رواج کا معجون مرکب ہے، وہ ختنہ کرتے ہیں، نکاح کرتے ہیں اور اپنے مردوں کو دفن کرتے ہیں۔ سید سالار مسعود

غازیؒ کے مزار کی زیارت کے لئے بہرائچ جاتے ہیں، اور ان کے جھنڈے کے نیچے
جو قسم کھائی جاتی ہے، اس کو بہت پکی قسم سمجھتے ہیں اور اس کا پورا کرنا بہت ضروری
جانتے ہیں، وہ ہندوستان کے دوسرے متبرک مقامات کی زیارت کے لئے بھی جاتے
ہیں مگر کبھی حج کو نہیں جاتے۔ ہندوؤں کے رسوم میں سے وہ ہولی اور دیوالی مناتے
ہیں، ایک گوت میں کبھی شادی نہیں کرتے، لڑکیوں کو ترکہ نہیں ملتا، وہ بچوں کے ملے
جلے اسلامی اور ہندووانہ نام رکھتے ہیں۔ وہ تمام تر جاہل اور غیر تعلیم یافتہ ہیں۔ ان
میں بھاٹ اور گویے بھی ہوتے ہیں جن کو وہ بڑی بڑی رقمیں اور انعامات دیتے ہیں۔
دیہاتی زندگی اور کاشتکاری کے موضوع پر بہت سی چوپائی نظمیں بنی ہوئی ہیں جو وہ
مزے لے کر پڑھتے ہیں، بولی نہایت درشت اور سخت ہے جس میں عورت اور مرد سے
یکساں طریقے پر خطاب ہوتا ہے۔ ان میں مسکرات اور نشہ آور چیزوں کے استعمال کا بھی
رواج ہے۔ وہ بہت ضعیف الاعتقاد اور توہم پرست واقع ہوئے ہیں، شگون بہت لیتے
ہیں، مردوں اور عورتوں کا لباس ہندوانہ ہے، پہلے زمانہ میں ان میں نوزائیدہ بچوں کو
مار ڈالنے کی بھی رسم تھی، لیکن یہ رسم اب بالکل جاتی رہی ہے۔ غارتگری اور رہزنی ان کا
پیشہ رہ چکا ہے، اب اگرچہ ان کی اصلاح اور ترقی ہوگئی ہے، پھر بھی جانور اڑا کر اور
گائے بیل کھول کر لے جانے میں اب وہ بھی بہت مشہور ہیں۔

میواتیوں کی قومی صفات:

اس دینی انحطاط اور اخلاقی تنزل کے باوجود اس قوم میں بعض اعلیٰ اخلاق و صفات اور شریف
قوموں کی نسلی خصوصیات پائی جاتی ہیں، اور جو نقائص اور اخلاقی کمزوریاں اس قوم میں پیدا ہوگئیں
وہ اسی نوع کی ہیں جو بے تربیتی، جہالت، متمدن دنیا سے بے تعلقی اور مذہب سے بے خبری کے
باعث شریف اور بہادر قوموں میں پیدا ہو جاتی ہیں، اور خود زمانہ جاہلیت میں، عربوں میں پیدا
ہوگئی تھیں، محاسن اور فطری صلاحیتوں کا رخ ماحول کی خرابی سے غلط ہو گیا تھا، قومی دلیری اور بیباکی
نے لوٹ مار اور غارتگری کی شکل اختیار کر لی تھی، شجاعت، اور فطری بہادری نے کوئی اور مناسب
میدان نہ پا کر خانہ جنگی اور خونریزی کو اپنا مظہر بنایا، فطری غیرت اور حمیت کا کوئی جائز استعمال نہ
رہا تو حمیت جاہلیت اور فرضی عزت و ناموس اور خود تراشیدہ معیار شرافت کی حفاظت میں صرف

ہوئی عالی حوصلگی اور بلند ہمتی کا کوئی شایانِ شان مصرف نہ رہا تو برادری کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں اس نے اپنے جوہر دکھائے، ذہانت، جفاکشی و چالاکی کو شریفانہ مواقع نہ ملے تو جرائم وارداتوں اور خلاف قانون کاموں میں اس نے ہاتھ کی صفائی اور ہنرمندی دکھائی، غرض محاسن اور فطری صلاحیتوں کا رخ غلط تھا، اور مصرف حقیر تھا، مگر قوم فطری جوہر سے محروم نہ تھی۔

سادگی اور جفاکشی، عزم اور قوتِ عمل، پختگی اور صلابت اس قوم کے خاص جوہر تھے، جس میں میواتی مسلمانوں کی شہری آبادی سے بہت ممتاز تھے۔ یہ پختگی اور صلابت اور حمیت ہی کا نتیجہ تھا کہ عملاً اسلام سے بہت دور ہو جانے کے باوجود اس علاقہ میں انتہائی طغیانی کے زمانہ میں بھی ارتداد کا سیلاب کبھی نہیں آنے پایا، اور باوجود اس کے کہ بعض بیرونی علاقے اس عام سیلاب میں گلے گلے پانی میں تھے، مگر میوات اس کی زد سے باہر رہا، اور اس وسیع علاقہ میں ارتداد کے واقعات پیش نہیں آئے۔

اس قوم کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ صدیوں تک جہالت اور گمنامی کے حصار میں محفوظ رہی ہے، اور گویا بیرونی دنیا سے بے تعلق اور فراموش شدہ قوم رہی ہے، اس حیثیت سے کوئی دوسری قوم جو اتنی بڑی تعداد میں ہو، اور سلطنت کے مرکز سے اتنی قریب ہو، اور پھر اتنی گمنام اور مہجور ہو، ہندوستان کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی ذہنی اور عملی قوت بہت کم ضائع ہوئی، اور بہت زیادہ محفوظ رہی، اور اس کی لوح جس طرح اچھے نقوش سے سادہ رہی، اسی طرح ان غلط نقوش سے بھی، جو ایک مرتبہ نقش ہو جانے کے بعد مشکل سے نکلتے ہیں، اس زمین پر درحقیقت کوئی کھیتی ہوئی نہیں، غلط رسوم و عادات اور جاہلانہ اوہام و خیالات محض خس و خاشاک تھے، جو صدیوں کی افتادہ زمین پر اُگ آئے تھے، یہ قوم ہندوستان میں اس چودھویں صدی میں بہت کچھ عرب جاہلیت کا نمونہ تھی۔

وہی اپنی فطرت پہ طبع بشر تھی
خدا کی زمیں بن جتی سر بسر تھی

میواتیوں کی آمد و رفت کا سلسلہ:

اوپر گذر چکا ہے کہ میوات سے اصل تعلق مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کی حیات میں شروع ہوا، یہ محض اتفاقی بات نہ تھی، بلکہ ایک غیبی انتظام تھا کہ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کو بستی نظام الدین

یعنی میوات کے دہانہ پر ٹھہرایا گیا اور مولانا محمد الیاس صاحب کی آمد سے بہت پہلے میوات کی سر زمین میں اس خاندان کی عقیدت ومحبت کا بیج بو دیا گیا، اور اس کی آبیاری سے کبھی غفلت نہیں کی گئی، میوات کے اس آہوئے وحشی کو جو سلاطین دہلی کی جہانگیری کا بھی کبھی صید نہیں ہوا، دو دو پشتوں کے رشتہ عقیدت مندی وارادت نے اس طرح پابند کر دیا کہ وہ مطلوب کے بجائے طالبین کر آیا۔

میوات میں مولانا محمد صاحب کے مریدین اور مخلصین کو جب معلوم ہوا کہ نظام الدین کی خالی مسند پھر آباد ہے، اور دونوں بزرگوں کے جانشین مولانا محمد اسماعیل صاحب کے فرزند اور مولانا محمد صاحب کے بھائی تشریف رکھتے ہیں تو انہوں نے نظام الدین کی آمد و رفت پھر شروع کی اور وہاں حاضر ہو کر درخواست کی کہ قدیم تعلقات کی بناء پر آپ میوات تشریف لے چلیں اور اپنے خاندانی نیاز مندوں کو اس کا موقع دیں کہ وہ اپنے شیخ جانشین کی زیارت سے اپنی آنکھیں روشن کریں اور ارادت واخلاص کا پرانا رشتہ پھر مستحکم کریں۔

اصل علاج دینی تعلیم:

مولانا کے نزدیک میوات کی اصلاح کی تدبیر صرف یہ تھی کہ ان میں دین کا علم پھیلایا جائے، شریعت کے احکام ومسائل سے واقف ہوں اور جہالت ووحشت دور ہو۔

مولانا محمد اسماعیل صاحب اور ان کے بعد مولانا محمد صاحب نے بھی یہی طریقہ علاج اختیار کیا تھا، میوات کے بچوں کو انہوں نے اپنے یہاں رکھ کر اور اپنے مدرسہ میں تعلیم دے کر میوات میں اصلاح وارشاد کے لئے بھیج دیا تھا اور اس ملک میں جو تھوڑی بہت روشنی اور خال خال دینداری تھی، وہ انہی اشخاص کی بدولت تھی جو انہیں دو بزرگوں کے تربیت یافتہ اور ان کے مدرسہ کے فیض یافتہ تھے۔ مولانا نے اس سلسلہ میں ایک قدم آگے بڑھانا چاہا، آپ نے خود میوات میں دینی مکاتب ومدارس کا قیام ضروری سمجھا تاکہ دین کا حلقہ وسیع ہو اور اس ملک میں ذرا بڑے پیمانے پر اصلاح وتبدیلی پیدا ہو۔

میوات چلنے کی شرط:

آپ مریدین اور معتقدین کے حلقہ میں کسی شیخ اور اس کے جانشین کے جانے کے وہ معنی بھی

سمجھتے تھے جو بلانے اور لے جانے والوں کے ذہن میں عام طور پر ہوتے ہیں، اور ان طریقوں اور اصولوں کو بھی جانتے تھے جن میں اہل ارادات اپنے تعلق وعقیدت کا اظہار کرتے ہیں اور اس کو کافی سمجھتے ہیں، لیکن آپ اس پر قطعاً تیار نہ تھے، کہ وہاں جا کر اہل محبت کی پر خلوص دعوتیں قبول کر کے اور کلمۂ خیر کہہ کر واپس چلے آئیں۔ آپ صرف اسی صورت میں وہاں جانا چاہتے تھے کہ آپ کے جانے سے وہاں کوئی ایسی پائیدار شکل پیدا ہو جائے جس سے ملک کی اس حالت میں تبدیلی پیدا ہو اور اسلام سے قریب ہو جائیں، اور اس کی شکل میں اس وقت آپ کے ذہن میں صرف یہی تھی کہ میوات میں دینی مکاتب اور مدارس قائم ہوں اور میوات کی کم سے کم نئی نسل دین سے واقف ہو۔

آپ نے خود بیان کیا کہ جب پہلی مرتبہ چند مخلصوں نے بڑے جوش واخلاص کے ساتھ مجھ سے میوات چلنے کی درخواست کی تو میں نے کہا کہ میں صرف اس شرط پر چل سکتا ہوں کہ تم وعدہ کرو کہ اپنے یہاں مکتب قائم کرو گے۔

مکتبوں کو اہل میوات اس وقت اتنا دشوار اور ناقابل عمل سمجھتے تھے کہ ان کے لئے اس شرط سے زیادہ کوئی مشکل شرط نہیں تھی، سب سے مشکل بات یہ تھی کہ بچوں کو کام سے ہٹا کر پڑھنے بٹھایا جائے مکتبوں کی شرط سنتے ہی دعوت دینے والوں کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا اور ان پر اوس پڑ گئی، انہوں نے اس کی ہامی نہیں بھری اور مولانا چلنے پر راضی نہیں ہوئے، دو تین مرتبہ ایسا ہی ہوا، ایک مرتبہ ایک سمجھ دار میواتی نے اس بنا پر اس کا وعدہ کر لیا کہ لے تو چلنا چاہیے، پھر وہاں جا کر دیکھا جائے گا۔

مکاتب کا آغاز:

مولانا میوات تشریف لے گئے، اور آپ نے اپنی شرط کا مطالبہ کیا، آپ کے بڑے تقاضے اور اصرار اور لوگوں کی بڑی جد وجہد سے ایک مکتب قائم ہوا، اور اس طرح اس کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

مولانا اہل میوات سے فرماتے تھے کہ تم بچے دو، معلمین کی تنخواہ میں لاؤں گا۔ میواتی جو اکثر کاشتکار ہیں، اس کے روادار نہیں تھے کہ ان کے بچے کھیتی باڑی کا کام اور جانور چھوڑ کر کتابیں لے کر بیٹھیں، اور ان کے کام سے جائیں، ان میں دین کی نہ طلب تھی، نہ قدر، کہ وہ اس کے لئے تھوڑی سی بھی تکلیف اور ایثار گوارا کریں، بڑی حکمت اور تالیف قلب سے ان کو اس پر راضی کیا گیا اور بہت کہہ سن کر اور خوشامد درآمد سے ان کے بچوں کو پڑھنے بٹھایا گیا۔

اس سفر میں دس مکتب قائم ہوئے، بعض مرتبہ ایک دن میں کئی کئی مکتب قائم ہوئے اور پھر بکثرت مکاتب قائم ہونے لگے، یہاں تک کہ کچھ مدت بعد میوات میں کئی سو مکتب قائم ہو گئے جن میں قرآن مجید وغیرہ کی تعلیم ہوتی تھی۔

مکاتب کے اخراجات:

مولانا نے دین کی خدمت کو ایک "قومی کام" کی حیثیت سے نہیں شروع کیا تھا، جس کا بار اور جس کی ذمہ داری تنہا قوم پر ہوتی بلکہ اپنا کام سمجھ کر شروع کیا تھا جس میں ان کو اپنی کسی چیز کے لگا دینے میں دریغ نہیں تھا، ان کے نزدیک دین کے کام کی حقیقت یہ تھی کہ آدمی بالکل اپنے ذاتی کام کی طرح اس میں اپنا عزیز وقت اور محبوب مال خرچ کرے۔ وہ اس تقسیم کے قائل نہیں تھے کہ یہ اپنا ہے اور یہ قومی۔

ایک صاحب نے ایک مرتبہ کچھ رقم یہ کہہ کر پیش کی، کہ یہ آپ بالکل اپنے کام میں لائیں، مولانا نے فرمایا کہ "حضرت! اگر ہم نے اللہ کے کام کو اپنا کام نہ سمجھا تو ہم اپنے آپ کب ہوئے"۔ یہ کہہ کر آنکھوں میں آنسو بھر لائے اور فرمایا کہ: آہ! ہم نے حضور ﷺ کی قدر نہ کی![1]

بس یہی مولانا کا اصول تھا، انہوں نے میوات کے دینی کاموں میں سب سے پہلے اپنا سرمایہ اور اپنا روپیہ (جو آبائی جائیداد کی آمدنی یا ہدایا کی شکل میں آتا تھا)، پھر لوگوں کی امداد کو قبول کیا۔

---

[1] از حاجی عبدالرحمٰن صاحبؒ

باب چہارم

میوات میں ایمان اور طلب دین کی عمومی تحریک

مکاتب اور جزئی اصلاح سے نا اُمیدی:

مولانا کی زندگی کا اصل جوہر جس نے انسان کو خدمت دین کے اس بلند مقام تک پہنچایا بلند ہمتی ہے، خدمت دین اور اصلاح کی کسی ابتدائی منزل پر مولانا کی بے قرار طبیعت نے قرار نہ پایا، جب تک ان کو اپنی اصل منزل نہ مل گئی، اس نے کہیں دم نہ لیا اور کہیں آرام نہ کیا۔

مکاتب کے ذریعہ جو معمولی انفرادی اصلاح تعلیم ہو رہی تھی، مولانا رفتہ رفتہ اس سے غیر مطمئن ہوتے گئے، آپ نے محسوس کیا کہ ماحول کی بے دینی اور ملک کی عمومی جہالت اور ظلمت کا اثر مکاتب پر بھی ہے۔ اول تو طلبہ کی پوری اصلاح اور ان کی دینی تربیت مکمل ہونے پاتی، دوسرے جو طلبہ ان مکاتب سے دین کی تعلیم اور تھوڑی بہت اسلامی تربیت حاصل کر کے نکلتے بھی ہیں وہ بھی جہالت اور بے دینی کے اس بحر ظلمات میں جو ان کے چاروں طرف سینکڑوں میل تک پھیلا ہوا ہے، ایسے غرق ہو جاتے ہیں کہ پھر ان کا پتہ نہیں چلتا۔

قوم میں دین کی کوئی طلب نہیں جس سے وہ اپنے بچوں کو شوق سے پڑھنے بھیجیں اور مکتبوں میں بٹھائیں، نہ دین کی قدر ہے کہ ان کے پڑھ لینے کے بعد ان کے علم کی عزت اور ان کی بات کی وقعت ہو، ایسی حالت میں یہ مکاتب ان کی زندگی پر کچھ اثر انداز نہیں ہو سکتے۔

تیسرے یہ انتظامات ان کے لئے ہیں جو سرے سے غیر مکلف وہ نابالغ بچے ہیں، اور جو قانون بالغ احکام الٰہی کے براہ راست مخاطب ہیں، اور جو دینی لاعلمی اور بے عملی کی وجہ سے مورد غضب

---

(۱) ایک عرصے کے بعد مولانا نے ایک گرامی نامے میں اسی بارے میں اپنا جو خیال ظاہر فرمایا اس کو ان الفاظ میں ادا کیا جا سکتا ہے "مکاتب جذبات کی جس مقدار سے چل سکتے ہیں وہ ابھی بہت بعید ہے۔ ابھی ایک طویل مدت صرف تبلیغ پر اقتصار کر کے استقامت اور ترقی فرماتے رہیں، جب عمومی استعداد پیدا ہو جانے کی اور اسلام کی رغبت پر کچھ ترقی کرنے لگیں گے تو انشاء اللہ تھوڑی کوشش سے بہت سے مدارس ہو سکیں گے۔"

بن رہے ہیں، ان کے لئے اس میں کوئی انتظام نہیں۔

نیز ساری قوم کو ان مکاتب اور مدارس کے ذریعہ (خواہ ان کی تعداد کتنی ہی زیادہ ہو) دین کی ضروری تعلیم اور اسلامی تربیت نہیں دی جا سکتی، نہ سب ان مکاتب کے طالب علم بن سکتے ہیں، نہ اپنے مشاغل زندگی اور وسائل معاش چھوڑ سکتے ہیں۔

اسی عرصے میں ایک سفر میں مولانا کے سامنے بڑی تعریف کے ساتھ ایک نوجوان پیش کیا گیا کہ یہ میوات کے فلاں مکتب سے قرآن پڑھ کر نکلے ہیں، مولانا فرماتے ہیں کہ اس کی ڈاڑھی منڈی ہوئی تھی، چہرہ، شکل اور لباس سے بھی کسی قسم کی اسلامیت نہیں ظاہر ہوتی تھی، اس کو دیکھ کر مولانا کی غیور اور حساس طبیعت کو دھکا لگا اور خیال ہوا کہ یہ تو کوہ کندن وکاہ برآوردن کا مرادف ہے، اس واقعہ سے مکاتب کی طرف سے مولانا کا دل پھیکا ہو گیا۔

مکاتب کے علاوہ آپ نے اپنے سفروں میں نزاعات اور پرانے جھگڑے چکائے جس کا میوات میں بڑا زور رہا کرتا ہے، فریقین میں صلح اور تصفیہ کرایا، آپ اپنی موقع شناسی، حکمت اور روحانیت سے اس میں بہت کامیاب ہوئے، میوات کے لوگ کہتے تھے کہ یہ شخص دیکھنے میں تو ایک مشت استخواں ہے، مگر جس معاملہ میں پڑ جاتا ہے چٹکیوں میں اس کو سلجھا دیتا ہے، اور معلوم نہیں کیا بات ہے کہ بڑے بڑے ضدی اور اپنی بات پر اڑنے والے اس کے کہنے سے فوراً مان جاتے ہیں۔

اسی زمانے میں اور بھی بعض علماء نے میوات میں وعظ و اصلاح کا کام شروع کیا تھا اور جیسا سارے ہندوستان علمائے حق کا طریقہ ہے، خلاف شروع امور کی روک تھام اور مسائل دین کی اشاعت کی کوشش شروع کی، اسی سلسلہ میں انہوں نے بعض خاص رسوم کی مخالفت کی تحریک بھی اٹھائی۔

لیکن مولانا یہ محسوس کر رہے تھے کہ دین کی حالت اس وقت بھیڑوں کے گلے کی سی ہے کہ چوپان ایک طرف سے ان کو سمیٹتا ہے تو دوسری طرف سے کچھ بھیڑیں نکل جاتی ہیں، دوسری طرف سے سمیٹتا ہے تو تیسری طرف سے نکل جاتی ہیں، ایک جزئی کی اصلاح کی جائے تو دوسری صدہا جزئیات قابل اصلاح رہتی ہیں۔ زندگی کی چول اپنی جگہ سے ہٹی ہوئی ہے، وہ چول ہے ایمان اور دین کی طلب اور قدر جو صدیوں سے نکل چکی ہے۔

آپ مختلف تجربوں سے اس نتیجے تک پہنچے تھے کہ خواص و افراد کی اصلاح اور دینی ترقی مرض کا علاج نہیں آپ کے اس تاثر کو ایک میواتی نے اپنے سیدھے سادے الفاظ میں یوں بیان کیا کہ "جب تک عام آدمیوں میں دین نہ آئے کچھ نہیں ہو سکتا"۔

اس کے بعد عرصے تک آپ کی میوات میں آمد و رفت رہی اور اہل میوات کو آپ سے دینی اور روحانی فیض پہنچتا رہا۔ لوگ بکثرت آپ کے سلسلہ میں منسلک ہوتے رہے، یہاں تک کہ ربیع الاول 44ھ میں آپ کی اور معتقدین کی درخواست اور خواہش پر علماء اور صلحاء کی ایک جماعت کے ساتھ حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ بھی میوات تشریف لائے، فیروز پور تک میں تشریف آوری رہی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ انسانوں کا ایک جنگل تھا جو ان بزرگوں کی زیارت اور شوق ملاقات میں مجتمع تھا، بکثرت لوگ بیعت میں داخل ہوئے۔

دوسرا حج اور کام کے رُخ کی تبدیلی:

شوال 44ھ میں آپ دوسرے حج کے لئے روانہ ہوئے، مولانا خلیل احمد صاحب کی ہمرکابی حاصل تھی، ایک ہفتہ مولانا کی معیت میں حیدرآباد دکن میں قیام رہا، کیونکہ حیدرآباد کے احباب کی مولانا سہارنپوری سے اصرار تھا۔

مدینہ منورہ میں قیام کا زمانہ ختم ہوا، اور رفقاء پہلے چلنے کے لئے تیار ہوئے تو انہوں نے مولانا کو عجب بے چینی اور اضطراب میں پایا۔ آپ کسی طرح مدینہ منورہ سے جدا ہونے پر راضی نہ تھے، کچھ دن توقف کے بعد رفقاء نے مولانا خلیل احمد صاحب سے ذکر کیا۔ آپ نے مولانا کی حالت دیکھ کر فرمایا کہ تم ان سے چلنے کے لئے اصرار نہ کرو، ان پر ایک حالت طاری ہے، یا تم انتظار کرو کہ از خود تمہارے ساتھ چلے جائیں، یا تم خود چلے جاؤ، یہ بعد میں آجائیں گے۔ چنانچہ رفقاء ٹھہر گئے۔

مولانا فرماتے ہیں کہ مدینہ طیبہ کے اس قیام کے دوران میں مجھے اس کام کے لئے امر ہوا اور ارشاد ہوا کہ ہم تم سے کام لیں گے۔ کچھ دن میرے اس بے چینی میں گزرے کہ میں ناتواں کیا کر سکوں گا، کسی عارف سے ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا کہ پریشانی کی کیا بات ہے۔ یہ تو نہیں کہا گیا کہ تم کام کرو گے، یہ کہا گیا کہ ہم تم سے کام لیں گے، پس کام لینے والے لے لیں گے۔

اس سے بڑی تسکین ہوئی اور آپ نے مدینہ منورہ سے مراجعت فرمائی۔ پانچ مہینے حرمین میں قیام رہا۔ 13 ربیع الثانی 45ھ کاندھلہ واپسی ہوئی۔

تبلیغی گشت کی ابتداء:

حج سے واپسی پر مولانا نے تبلیغی گشت شروع کر دیا، آپ نے دوسروں کو بھی دعوت دی کہ عوام میں نکل کر دین کے اولین ارکان واصول (کلمہ توحید ونماز) کی تبلیغ کریں، لوگوں کے کان اس دعوت سے نا آشنا تھے، دین کی تبلیغ کے لئے عامیوں کا زبان کھولنا بڑا پہاڑ معلوم ہوتا تھا، چند آدمیوں نے بڑی شرم وحیاء اور رکاوٹ کے ساتھ خدمت انجام دی۔

ایک بار نوح میں اجتماع ہوا، آپ نے مجمع میں اپنی یہ دعوت اور مطالبہ پیش کیا کہ جماعتیں بنا کر علاقہ میں نکلا جائے اور تبلیغ کی جائے، حاضرین نے ایک مہینہ کی مہلت طلب کی، ایک مہینہ کے بعد جماعت بن گئی، آٹھ دن کے لئے وہ گاؤں طے ہو گئے جن کا اس جماعت کو دورہ کرنا تھا، اور یہ طے ہوا کہ یہ دورہ کرتی ہوئی آئندہ جمعہ سوہنے (ضلع گوڑگانوہ) میں پڑھے گی، اور وہیں آئندہ ہفتے کا پروگرام طے ہوگا۔

چنانچہ پہلا جمعہ جماعت نے سوہنے میں پڑھا، مولانا بھی تشریف لائے، آئندہ ہفتے کا نظام طے ہوا، جماعت پھر دورے پر روانہ ہوئی، اور دوسرا جمعہ ناؤڑ میں پڑھا گیا، تیسرا جمعہ نگینہ تحصیل فیروز پور میں پڑھا گیا، مولانا نے ہر جمعہ میں شرکت فرمائی اور آئندہ کا نظام طے ہوا۔

عرصے تک میوات میں اسی طرز پر کام ہوتا رہا، اور دینی وعلمی مرکزوں کے لوگوں کو میوات کے جلسوں میں ان جماعتوں کے اجتماع کے موقع پر دعوت دی جاتی رہی اور کئی سال تک یہ سلسلہ جاری رہا۔

تیسرا حج:

51ھ میں آپ تیسری بار حج کو گئے، رمضان کا چاند نظام الدین میں نظر آ گیا تھا۔ تراویح دہلی کے اسٹیشن پر ہوئی، تراویح سے فراغت پر کراچی کی گاڑی میں سوار ہو گئے، احتشام الحسن اس سفر میں آپ کے ساتھ تھے۔ وہ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کے نام ایک خط میں مولانا کے مشاغل واوقات کے متعلق لکھتے ہیں:

"حضرت والا کا اکثر وقت حرم میں گزرتا ہے، تبلیغی جلسے اور چرچے برابر رہتے ہیں، اور ہر جگہ اس کے متعلق ضرور حضرت مولانا گھنٹہ کچھ فرماتے ہیں"۔

مکہ معظمہ سے روانہ ہو کر 2 محرم 52ھ (مطابق 27 اپریل 33ء) مدینہ طیبہ پہنچے اور زیارت سے مشرف ہوئے۔ 27 جمادی الاولیٰ [561ھ کو ہندوستان واپسی ہوئی۔

اس حج سے آپ کام اور نظام کے متعلق مزید وثوق و اطمینان اور یقین لے کر آئے اور کام کی رفتار کو بڑھا دیا۔

میوات کے دورے:

حج سے واپس تشریف لا کر مولانا نے بڑی جماعت کے ساتھ میوات کے دورے کئے۔ کم سے کم سو آدمی اس سفر میں ہر وقت ساتھ رہتے تھے، باقی جا بجا مجمع بہت ہو جایا کرتا تھا۔ ایک دورہ ایک مہینہ کا تھا دوسرا دورہ کچھ کم ایک مہینہ کا، سفر کے وقت جماعتوں کو گاؤں میں تقسیم کر دیا کرتے تھے، اور فرماتے تھے کہ گشت لگا کر آؤ۔

تبلیغی جماعتیں دینی مرکزوں کی طرف:

مولانا نے اپنے طویل تجربہ اور بالغ نظری سے یہ سمجھ لیا تھا کہ اپنے ماحول اور مشاغل میں گھرے رہ کر ان غریب میواتی کاشتکاروں کا دین سیکھنے کے لئے وقت نکالنا اور اس تھوڑے سے وقت میں جس میں ان کو کامل یکسوئی حاصل نہیں ہو سکتی، دین کے ایسے اثرات کو قبول کر لینا جن سے ان کی زندگی میں انقلابی اصلاح اور تغیر پیدا ہو جائے ممکن نہیں، ان سے یہ مطالبہ کرنا بھی صحیح نہیں کہ سب کے سب اس عمر میں مکاتب اور مدارس کے طالب علم بن جائیں اور یہ توقع بھی غلط ہے کہ وعظ و پند ہی سے ان کی زندگی میں انقلاب ہو جائے گا اور وہ اس جاہلانہ زندگی سے نکل کر اسلامی زندگی میں قدم رکھیں گے ان کے عادات و اخلاق، مزاج و طبائع، شوق و رغبت اور جذبات بدل جائیں گے۔ لیکن مولانا کے نزدیک ایسا ہونا ضروری تھا، مگر کیا تدبیر ہو سکتی تھی۔ مولانا کے نزدیک اس کی تدبیر صرف یہ تھی کہ ان کو کچھ مدت کے لئے جماعتوں کی شکل میں دین اور علم کے مرکزوں کی طرف نکلنے پر آمادہ کیا جائے۔ وہ وہاں کے عوام اور جہلا میں کلمہ اور نماز کی تبلیغ کریں اور اس طرح اپنا پڑھا ہوا سبق پختہ کریں اور وہاں کے اہل علم و دین کی مجلسوں میں بیٹھ کر ان کی باتوں کو بغور سنیں اور ان کی زندگی، نشست و برخاست اور عمل کو بغور دیکھیں، اور اس طرح بالکل فطری طریقے پر جس طرح بچہ زبان سیکھتا ہے، اور آدمی تہذیب و شائستگی حاصل کرتا

ہے، وہ دین اور علم دین حاصل کریں۔

نیز اس نکلنے کے زمانے میں جس سے زیادہ یکسوئی و توجہ کامل کا زمانہ اس کو بظاہر نصیب نہیں ہو سکتا، قرآن پڑھنے، مسائل و فضائل معلوم کرنے اور صحابہ کرامؓ کے حالات و حکایات سننے میں مشغول رہیں اور اس طرح اس گشت کی مدت سے بہت کچھ سیکھ کر اور لے کر اپنے گھر واپس ہوں۔

لیکن یہ کام بہت مشکل تھا۔ کسی شیخ طریقت نے (الا ماشاء اللہ) اپنے مریدین و معتقدین پر ایسا بوجھ نہ ڈالا ہوگا۔ اپنے مشاغل سے چھڑانا، بیوی بچوں سے علیحدہ کرنا اور گھر سے نکالنا آسان کام نہیں، پھر ایسی قوم کے افراد کو جس کو بڑی کوششوں کے بعد کچھ مانوس کیا گیا تھا۔

ایک دوسری دقت یہ تھی کہ اس کا بھی اطمینان نہیں تھا کہ جہاں یہ لوگ جائیں گے وہاں ان کے ساتھ ہمدردانہ سلوک ہوگا۔ ان کی جہالت، سادہ لوحی اور شہروں کے معیار سے بعض اوقات ناشائستگی پر رحم اور شفقت کا سلوک ہوگا یا جبر و عتاب اور طنز و تعریض کا۔

مولانا کا خیال تھا کہ یو پی کا مغربی حصہ (ضلع مظفر نگر اور سہارنپور جس کے لئے کبھی دوآبہ کی اصطلاح استعمال فرماتے تھے اور کبھی مطلق یو پی کے لفظ سے ادا کرتے تھے) دین و علم کا معدن اور اہل حق کا خاص مرکز ہے، اہل دین کی صحبت و اختلاط اور آنکھوں اور کانوں کے ذریعہ سے دین کی تعلیم و اکتساب کے لئے اس قطعے سے زیادہ کوئی موزوں و مناسب زمین نہیں۔

مولانا کے نزدیک ملک کی جہالت و غفلت، دینی بے حسی اور جذبات کی خرابی تمام فتنوں کی جڑ اور ساری خرابیوں کا سرچشمہ تھی اور اس کا علاج صرف یہ تھا کہ میوات کے لوگ اپنی اصلاح و تعلیم اور دین کو دنیا پر مقدم رکھنے اور اس کے لئے جد و جہد کرنے کی طاقت اور جذبات پیدا کرنے کے لئے باہر اور خصوصاً یو پی کے ان شہروں میں جائیں............ مولانا ایک میواتی کو لکھتے ہیں:

"میرے دوست! آدمی کا جاہل اور غافل ہونا اور حق کی کوشش میں سست ہونا بڑی ترقی [unclear] کر گیا ہے، اور ضائع اور جذبات کے ان نامبارک اور گندہ صفتوں پر رہنے سے اللہ جانے کہ کتنے فتنے اٹھتے ہوئے تم دیکھو گے اور کچھ نہ کر سکو گے"۔ اٹھتے ہوئے فتنوں کو مٹانے اور آئندہ کے فتنوں سے روکنے کے لئے تمہارے ملک میں پیش آئی ہوئی اسکیم کو مشق کرنے کے لئے یو پی کے لئے نکلنے پر زور دینے کے سوا اور کوئی علاج نہیں"۔[۱]

---

[۱] بیان میاں محمد عیسیٰ (فیروز پور نمک)

مولانا کو اس کی بھی امید نہ تھی کہ آپ کی یہ دعوت و تحریک اس طرح اس علاقہ کے اہل حق اور اہل علم کے سایہ تلے آجائے گی اور اس بہانے سے ان حضرات کو میوات کے ان غریب و دور افتادہ مسلمانوں کی پسماندگی و زبوں حالی سے واقفیت کا موقعہ ملے گا۔ شاید ان کے دل میں اس کا درد پیدا ہو جائے اور ان کی نگاہ شفقت اٹھے۔ مولانا کے نزدیک ان حضرات کا تعلق اور ان کی سرپرستی نہایت ضروری تھی جس کے بغیر وہ اس تحریک کو خطرہ اور آزمائش میں سمجھتے تھے۔

غالباً انہی مصلحتوں کی بناء پر مولانا نے پہلی جماعت کے سفر کے لئے اپنے وطن کاندھلہ کا انتخاب فرمایا کہ وہ بہر حال اپنا وطن ہے۔ عزیزوں سے سابقہ ہے، اور یوں بھی وہ ایک علمی اور دینی مرکز ہے، اس لئے اس سفر کی غرض بھی حاصل ہے۔

پہلی جماعت کاندھلہ کے لئے:

ایک رمضان میں مولانا نے فرمایا کہ کاندھلہ کے لئے آدمی تیار کرو۔ علماء مشائخ کے مرکز پھر اپنے ... شیخ کے وطن میں تبلیغ کے لئے عامیوں اور جاہلوں اور میوات کے دیہاتوں کا جانا سننے والوں کو بہت ہی عجیب اور دشوار معلوم ہوا، اور چونکہ یہ غلط تخیل تھا کہ ہم کو اصلاح اور دوسروں میں تبلیغ کے لئے بھیجا جا رہا ہے، اس لئے اور بھی انوکھی سی بات معلوم ہوتی تھی۔ لوگوں کی سب پہلوؤں پر نظر تھی (اور اب بھی بیک وقت اس کام کے سب پہلو اچھے اچھے اہل نظر کے سامنے نہیں آتے) اس لئے لوگوں نے تعمیل میں جوش و سرگرمی کا اظہار نہیں کیا۔ حاجی عبد الرحمٰن جیسے مخلص و محب نے کہہ دیا کہ میں تو نہ جا سکوں گا وہ میرے استاد مولانا محمد صاحب کا گاؤں ہے"۔

مگر مولانا کوئی سنجیدہ بات سرسری طریقے سے اور رواداری کے ساتھ نہیں فرماتے تھے کہ بات آئی گئی ہو جائے، اس کے لئے وہ اپنی شخصیت کا پورا بوجھ ڈال دیتے تھے اور اپنی ساری طاقتوں کو کام میں لے آیا کرتے تھے اور جس چیز کو ضروری سمجھتے تھے اس کی طرف سے مطمئن ہوئے بغیر ان کے لئے کھانا پینا اور سونا مشکل تھا، زندگی بھر کا یہ معمول تھا۔ اس لئے ان کی بات کا ٹالنا ان سے تعلق رکھنے والوں کے لئے آسان نہ تھا۔

چنانچہ دس آدمیوں کی ایک جماعت کاندھلہ کے سفر کے لئے تیار ہو گئی، اس جماعت میں چیدہ چیدہ لوگ تھے اور تقریباً سب وہ تھے جو اعتکاف کر چکے تھے۔ اس جماعت کو ذکر اہتمام کی خاص تاکید تھی۔ کاندھلہ کے لوگوں نے بڑے اعزاز و اکرام سے اسی بی کے گھر میں ان کو ٹھہرایا، اور

بڑی خاطر کی۔

دوسری جماعت رائے پور کے لئے:

اس کے بعد رائے پور (ضلع سہارنپور) جماعت کے جانے کی تحریک کی اور شوال ہی میں 10,11 آدمیوں کو اپنے ساتھ لے گئے۔

رائے پور بھی اطمینان کی جگہ تھی، اور دینی و روحانی مرکز تھا، نیز مولانا عبدالقادر صاحب (جانشین شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری) سے یک جہتی اور یگانگت کی بناء پر وہاں سے بھی کوئی تکلف اور اجنبیت نہیں تھی۔

نمبردار محراب خاں کو نمونیا تھا۔ فرمایا: آج نہیں کل چلے آنا۔ آپ نے رات کو ان کے لئے دعا کی، نمونیا اچھا ہو گیا اور وہ رائے پور کے لئے روانہ ہو گئے۔ قاری داؤد صاحب کا بچہ قضا کر گیا تھا وہ بچے کو دفن کرتے ہی گھر واپس ہوئے بغیر روانہ ہو گئے۔

میوات کے منظم دورے:

آپ نے میوات کی تحصیلوں کے نقشے اور پورے ضلع گوڑگانوہ کا نقشہ تیار کرایا۔ سمتیں اور لائنیں قائم کی گئیں اور آپ نے ہدایت کی کہ تمام مبلغین کی کارگزاری قلم بند کریں۔ گاؤں کی آبادی اور ایک گاؤں کا دوسرے گاؤں سے فاصلہ لکھا جائے۔ آس پاس کے گاؤں اور ان کے نمبرداروں کے نام لکھے جائیں اور بتلایا جائے کہ کون لوگ زیادہ آباد ہیں۔

چھوٹا تحصیل فیروز پور میں ایک جلسہ ہوا جس میں سولہ جماعتیں بنیں، ہر جماعت پر ایک امیر اور ہر چار جماعتوں پر ایک امیر الامراء کا تقرر رہا۔ سارے ملک میوات میں ان جماعتوں کے ایک مرتب دورہ کو جانے کا انتظام کیا گیا اور اس کی شکل یہ اختیار کی گئی کہ چار جماعتیں پہاڑ کے اوپر دورہ کرنے کے لئے نامزد ہوں اور چار جماعتیں ان گاؤں میں جو سڑک اور پہاڑ کے درمیان میں واقع ہیں، اور چار جماعتیں اس سڑک کے جو ہوڈل سے دہلی کو جارہی ہے، اور اس سڑک کے درمیان جو الور سے دہلی کو جارہی ہے، اور چار جماعتیں اس سڑک کے جو ہوڈل سے دہلی کو جاتی ہے، اور جمنا کے درمیان کام کریں۔

ہر جگہ نظام الدین سے ایک آدمی خیر خبر لینے اور تقریر کرنے کیلئے آتا۔ فرید آباد میں سب

جماعتیں اکٹھا ہوئیں۔ مولانا بھی تشریف لائے۔ جلسہ ہوا، فرید آباد سے سول جماعتیں مختلف راستوں سے چار جماعتوں میں منقسم ہو کر جامع مسجد میں دہلی میں جمع ہوئیں، جلسہ ہوا اور وہاں سے جماعتیں پانی پت، سونی پت اور دوسرے مقامات کی طرف بڑھیں۔

اس عرصے میں میوات میں تبلیغی گشتوں اور دین سیکھنے کے لئے سفر و ہجرت کی تحریکیں و ترغیب اور تذکیر کا سلسلہ جاری رہا۔ مولانا کا اب بھی مطالبہ اور یہی دعوت تھی جو اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے پیش کرتے رہتے تھے، اس سلسلہ میں میوات کے بکثرت دورے اور مختلف مقامات پر جلسے ہوئے، ہر جگہ نئے نئے عنوانات اور فضائل و ترغیبات کے ساتھ یہی ایک مضمون پیش فرماتے رہے اور قوم سے اسی کا مطالبہ کرتے رہے، اور اسی میں اس کے دینی و دنیاوی فروغ کا یقین دلاتے رہے، یہاں تک کہ اس مشکل کام سے وحشت کم ہوگئی۔

میوات کے اندر باہر دورہ کرنے کے لئے جماعتیں بکثرت بننے لگیں، اس پر ہمیشہ زور دیا جاتا رہا کہ ملک میں دوسری چیزوں کی طرح اس کا بھی عام رواج ہو جائے، اس کے لئے مناسب مقامات میں جلسے اور اجتماعات بھی کئے جاتے تھے۔ ہر جلسے میں سے کچھ نئی جماعتیں تیار ہو کر اطراف و جوانب یا یو۔پی کا گشت کرنے کے لئے نکلتیں۔ لوگ اپنے اپنے وقتوں کی پیش کش کرنے لگے۔ روپے پیسے کے چندے کا رواج تو دنیا میں تھا ہی، دین کے واسطے اوقات (ہفتوں اور مہینوں) کے چندے کا پہلی مرتبہ میوات میں رواج شروع ہوا۔

مولانا کام کرنے والوں میں دین کے لئے ایثار و قربانی کی روح پیدا کرنا چاہتے تھے اور ان کو اللہ کے لئے کھیتی باڑی کا نقصان اور اپنے کاروبار کا حرج برداشت کرنے کا عادی بنانا چاہتے تھے۔ میوات میں ایک مدت کے بعد اس کا آغاز ہوا کہ دین کے لئے دنیاوی کاموں کا نقصان برداشت کیا جائے اور دنیا کا خطرہ مول لیا جائے۔ یہ الگ بات ہے کہ اکثر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے اس کی نوبت نہیں آنے دی، اور نکلنے والوں کو واپس آ کر معلوم ہوا کہ ان کی غیبی مدد ہوئی اور ان کی کھیتی باڑی اور دوکانداری کو اس عرصہ میں زیادہ فروغ ہوا۔

میوات میں دین کی عام اشاعت:

ان رضا کار مبلغین کی وجہ سے بہت بڑی تعداد میں اپنا سامان اپنی پیٹھ پر اٹھائے اپنا ضروری خرچ خوراک ساتھ باندھے ہوئے ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں اور ایک کونے سے دوسرے

کو نے تک پھرتے رہتے تھے۔ تھوڑی مدت میں اس وسیع علاقہ میں دین اور دینداری کی ایسی عام اشاعت ہوئی اور اس تاریک خطے میں جو صدیوں سے تاریک چلا آ رہا تھا، ایسی روشنی پھیلی جس کی نظیر دور دور نہیں مل سکتی۔ اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ اگر کوئی اسلامی سلطنت اپنے پورے وسائل استعمال کرتی اور لوگوں کو دین سے قریب کرنے کے لئے اور دین سے واقف کرنے کے لئے بہت بڑا تنخواہ دار عملہ رکھتی یا سینکڑوں کی تعداد میں مدارس و مکاتب قائم کرتی تو وہ اپنی سلطنت کے کسی علاقے میں اس خوبی کے ساتھ دین نہیں پھیلا سکتی اور زندگی کا انقلاب تو مادی وسائل کے قابو سے بالکل ہی باہر ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دین کے کام صحیح طرز ہی ہے جو قرن اول میں تھا۔ اسلام کے سپاہی لڑنے کے لئے ہتھیار اور کھانے کے لئے سامان خوراک اپنے گھر سے لاتے تھے اور شہادت کے شوق اور رضائے الٰہی کی طلب میں جہاد کرتے تھے، اسی طرح اس کے مبلغ اور داعی، اس کے معلم اور واعظ اللہ کا حکم اور اپنا فرض سمجھتے ہوئے اپنے فرائض دلچسپی اور دیانت داری سے ادا کرتے تھے۔ میوات کی اس دینی نقل و حرکت میں اس مبارک دور کی ہلکی سی جھلک تھی۔ اگر کوئی ان مبلغین کے قافلوں کو اس حالت میں گزرتا ہوا دیکھتا کہ کاندھوں پر کمبل پڑے ہوئے، بغل میں سیپارے دیئے ہوئے، چادر کے پلو میں چنے یا چند روٹیاں بندھی ہوئی، زبانیں، ذکر و تسبیح میں مشغول ہیں۔ آنکھوں میں شب بیداری کے آثار پیشانیوں پر سجدے کے نشانات، ہاتھ پاؤں سے جفا کشی اور مشقت کا اظہار ہو رہا ہے تو دیکھنے والے کے سامنے بیر معونہ کے ان شہید صحابیوں کی ایک دھندلی سی تصویر پھر جاتی جو قرآن اور احکام دین کی تعلیم کے لئے رسول اللہ کے حکم سے جا رہے تھے اور شہید کر دیئے گئے تھے۔

فضاء کی تبدیلی:

رفتہ رفتہ میوات کی فضا بدلنے لگی اور موسم کے تغیر کے اثرات جا بجا ظاہر ہونے لگے، زمین میں ایسی روئیدگی اور قابلیت پیدا ہونے لگی۔ اب دین کی ہر چیز کے لئے مستقل جہاد کی ضرورت نہیں رہی۔ اگرچہ کام بہت باقی تھا (اور بعض رسمیں قابل اصلاح اب بھی باقی ہیں) مگر ان مقامات میں جہاں کام زیادہ ہو چکا تھا صرف اتنا کہنا اور بتلانا کافی تھا کہ یہ دین کی چیز ہے، اور اللہ و رسول کا حکم ہے۔

مولانا کے نزدیک کام کی یہی صحیح ترتیب تھی کہ لوگوں میں حقیقی ایمان، دین کی طلب اور قدر، اور آخرت کے لئے دنیا میں اپنے جان و مال کا نقصان گوارا کرنے کی قابلیت پیدا ہو جائے پھر پورے دین کی صلاحیت از خود پیدا ہو جائے گی۔

چنانچہ میوات میں دینداری کے وہ اثرات ظاہر ہونے لگے جن میں سے ایک ایک کے لئے اس سے پہلے اگر برسوں جدوجہد کی جاتی تو شاید کامیابی نہ ہوتی بلکہ اُلٹی ضد پیدا ہو جاتی۔ ملک میں دین کی رغبت پیدا ہو گئی اور اس کے آثار نظر آنے لگے۔ جس علاقے میں کوسوں مسجد نظر نہیں آتی تھی، وہاں گاؤں گاؤں مسجدیں بن گئیں اور دیکھتے دیکھتے اس ملک میں ہزاروں مسجدیں بن کر کھڑی ہو گئیں۔ صدہا مکتب اور متعدد عربی کے مدرسے [1] قائم ہو گئے۔ حفاظ کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہے۔ فارغ التحصیل علماء کی بھی ایک خاصی بڑی تعداد پیدا ہو گئی ہے۔ [2] ہندوانہ وضع و لباس سے نفرت پیدا ہونے لگی اور اسلامی و شرعی لباس کی وقعت دلوں میں پیدا ہو گئی۔ ہاتھوں سے کڑے اور کانوں سے مرکیاں اترنے لگیں۔ بے گنتی آدمیوں نے داڑھیاں رکھنی شروع کر دیں، شادیوں سے مشرکانہ اور خلاف شرع رسوم کا خاتمہ ہونے لگا۔ سود خواری کم ہو گئی، شراب نوشی تقریباً ختم ہو گئی، قتل و غارت گری کی وارداتیں بہت کمی ہو گئی، جرائم، فسادات اور بداخلاقیوں کا تناسب پہلے کے مقابلے میں بہت گھٹ گیا۔ بے دینی، بدعات و رسوم اور فسق و فجور کی باتیں اور عادتیں موافق ہوا اور فضا نہ پانے کی وجہ سے خود بخود مضمحل ہونے لگیں۔

اس حقیقت کو ایک سن رسیدہ تجربہ کار میواتی نے بڑی بلاغت کے ساتھ بیان کیا، جس پر کسی اضافے کی گنجائش نہیں۔ قاری داؤد صاحب نے ایک بوڑھے میواتی سے اس کا عندیہ لینے کے لئے پوچھا کہ "تمہارے ملک میں کیا ہو رہا ہے؟" بوڑھے میواتی نے کہا "اور تو میں کچھ جانتا

1۔ میوات میں عربی کا مرکزی مدرسہ نوح کا مدرسہ معین الاسلام ہے جس کی بنیاد مولانا کے ہاتھوں ۱۳۴۰ھ میں رکھی گئی۔ خان بہادر شیخ عزیز الدین صاحب دہلوی مرحوم کو اس کی تعمیر و ترقی سے بڑی دلچسپی تھی اور انہوں نے اس میں بڑی فراخ حوصلگی سے حصہ لیا۔ آپ نے 24 دسمبر 40ء کو انتقال فرمایا۔

2۔ اس سلسلہ میں سب سے بڑا احسان مولانا عبدالسبحان صاحب کا ہے جو علمائے میوات کے استاد و مربی ہیں۔ آپ کے درس اور آپ کے مدرسہ واقع قرول باغ دہلی سے بکثرت میواتی طلباء عالم اور فارغ التحصیل ہو کر نکلے۔

نہیں، اتنا جاتوں کہ جن باتوں کے لئے بڑی کوشش کی جاتی تھیں اور ایک بات بھی نہیں ہوتی تھی، وہ اب آپ ہی آپ ہو رہی ہیں، اور جن باتوں کو بند کرنے کے لئے پہلے بڑی بڑی لڑائیاں جاتی تھیں اور بڑا زور لگایا جاتا تھا اور ایک بات بھی نہیں بند ہوتی تھی، وہ اب بے کہے سنے خود بخود بند ہوتی جا رہی ہیں"۔

مولانا کے نزدیک اس اصلاح و تغیر کا سب سے بڑا سبب اہل میوات کا باہر نکلنا اور خصوصاً یوپی کے دینی مرکزوں میں جانا تھا۔ ایک میواتی کو ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

"جماعتوں کے یو۔ پی کے خطے میں نکلنے کی کچھ ایسی تاثیرات ہیں کہ باوجود (افراد کی) صرف تھوڑی سی مقدار کے نکلنے کے جو دو سو کو بھی نہیں پہنچی اور (وقت کی) تھوڑی سی مقدار کے جو اپنے گھروں کے مقابلہ میں کچھ بھی شمار ہونے کی حیثیت نہیں رکھتی اتنے قلیل زمانہ کا اتنا اثر ہوا کہ انقلاب عظیم کا لفظ زبانوں پر آنے لگا اور تمہارے ملک کی نحوس اور کامل جہالت والے لوگوں کے ناپاک جذبات، دین پھیلانے کے مبارک جذبات سے بدلنے لگے"[1]۔

لیکن مولانا کے نزدیک اگر باہر نکلنے کو قوم جزو زندگی نہ بنائے گی اور دین کے لئے جدوجہد کرنا چھوڑ دے گی تو قوم پہلے سے زیادہ گر جائے گی۔ اب مذہبی بیداری کی وجہ سے دنیا کی نگاہیں میوات کی طرف ہیں۔ ان ہزاروں نگاہوں کے ساتھ ہزاروں فتنے ہیں۔ جہالت و مجہولیت (گمنامی) کا حصار ٹوٹ چکا ہے، اب زیادہ چوکنا اور ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے، ایک گرامی نامہ میں ارشاد فرماتے ہیں۔

"جب تک تبلیغ کے لئے چار چار مہینے ملک و ملک پھرنے کو اپنی قوم میں جزو زندگی بنانے کی کوشش کے لئے پورے اہتمام کے ساتھ آپ کھڑے نہیں ہوں گے اس وقت تک قومیت صحیح دینداری کا مزہ نہیں چکھے گی اور حقیقی ایمان کا ذائقہ بھی نصیب نہیں ہوگا۔ اب تک جو مقدار ہے ایک عارضی ہے، اگر کوشش چھوڑ دو گے تو قوم اس سے زیادہ گرے گی۔ اب تک جہالت اس کی حفاظت کر رہی تھی اور شدت جہالت کی

---

1 (مکتوب بنام محمد عیسیٰ (فیروزپور جھرکہ-12)

وجہ سے دوسری قومیں ان کو کسی گنتی میں شمار نہ کرنے کی وجہ سے توجہ نہیں کرتی تھیں اب تاوقتیکہ دین کی تسمہ بندی سے اپنی حفاظت نہیں کریں گی دوسری قوموں کا شکار ہو جاویں گے"۔

دہلی کے مبلغین:

دہلی اور دوسرے مقامات پر تبلیغ کرنے کے لئے کچھ عرصے سے پانچ تنخواہ دار مبلغین رکھے ہوئے تھے جو قریب قریب تبلیغ کے مروجہ عام طریقوں پر کام کرتے تھے۔ انہوں نے تقریباً ڈھائی سال کام کیا لیکن ان سے مولانا کا مقصود حاصل نہیں ہوتا تھا اور مولانا اس سست اور بے روح کام سے نا امید ہو گئے تھے، ان لوگوں کے کام سے وہ دینی و اصلاحی نتائج حاصل نہیں ہو رہے تھے اور وہ حرکت و زندگی نہیں پیدا ہو رہی تھی جو میوات کے رضا کار اور طالب اجر اور ایثار پیشہ مبلغین سے پیدا ہوئی تھی۔ مولانا اس طریقہ کار سے بالکل غیر مطمئن ہو گئے تھے اور اس کو ختم کر دینا چاہتے تھے۔

آخری حج اور حرمین میں دعوت۔

مولانا کو اس کی بڑی آرزو تھی جو آخر وقت تک قائم رہی کہ اگر ہندوستان کا کام کچھ جم جائے تو آپ اپنے چند مخصوص رفقاء کے ساتھ اسلام کے مرکز میں جا کر اس کام کی دعوت دیں اور یہاں اس کو شروع کریں کہ یہ دنیا کی سوغات ہیں اور وہاں کے رہنے والے اس کے سب سے زیادہ مستحق ہیں بضاعتنا ردت الینا کہہ کر اس کا استقبال کریں اور پھر ان کے ذریعے یہ دولت عالم اسلام میں گھر گھر پہنچے۔ 56ھ میں آپ کے دل میں بڑی شدت سے اس کا داعیہ پیدا ہوا اور آپ 18 ذیقعدہ کو حج کے لئے روانہ ہو گئے[1]۔

---

[1] آپ کے رفقاء سفر میں مولانا احتشام الحسن صاحب، صاحبزادہ مولوی محمد یوسف، مولوی انعام الحسن صاحب، مولوی نور محمد صاحب، حافظ عبدالرحمن صاحب، مولوی محمد ادریس صاحب، مولوی جمیل صاحب اور دوسرے ہمراہیوں میں حافظ متوکل صاحب، مولوی ظہیر الحسن صاحب تھے۔ نظام الدین اور میوات کا تبلیغی کام مولوی سید رضا حسن صاحب کے اور دہلی کا کام حافظ مولوی مقبول حسن صاحب کے سپرد تھا۔ کام کی نگرانی اور مختلف معاملات و مسائل کی سرپرستی شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کے ذمے تھی۔ بطور مدد کی تنخواہیں دینا، جلسوں میں جانا، آنے والوں کا قیام اور مشورہ امور شیخ حافظ رشید احمد صاحب کی رائے سے طے پاتے تھے۔

جہاز میں تبلیغ اور مناسک حج کا بہت کافی چرچا رہا۔ جدہ سے مکہ مکرمہ جاتے ہوئے بحرہ کے قیام میں وہاں کے رؤساء کو جمع کر کے مولانا نے تقریر فرمائی اور ان سب نے تحسین کی۔ ایام حج چونکہ قریب تھے، اور رہائش وغیرہ کا سامان بھی کرنا تھا اس لئے مکہ معظمہ میں تبلیغ سے متعلق کسی سے کچھ تذکرہ کرنے کی نوبت نہیں آئی البتہ منیٰ کے قیام میں مختلف اطراف کے حجاج سے گفتگو ہوئی۔ مولانا نے ایک اجتماع میں تقریر فرمائی جس کا اچھا اثر ہوا[1]۔ حج سے فراغت کے بعد بعض ہندی اہل الرائے اصحاب سے مشورہ ہوا، انہوں نے حجاز کے حالات و مصالح کے پیش نظر تبلیغ کے ارادہ کی سخت مخالفت کی، پھر مولانا شیخ الدین صاحب[2] سے تذکرہ آیا، حضرت موصوف نے بڑے زور سے تائید کی اور فرمایا کہ: مجھے غیبی امداد اور اعانت کی قوی امید ہے۔ ایک جمعہ کو محمد سعید باسلامہ مکی کے یہاں دعوت تھی۔ کھانے کے بعد مولانا نے کچھ تقریر فرمائی جس کے بعض فقروں پر وہ بہت متاثر ہوئے۔ بمشکل ان کو سنبھالا گیا اور پھر انہوں نے بہت سے مفید مشورے دیئے۔

بحرین کی ایک جماعت حجاج سے گفتگو ہوئی اور کافی دیر تک تبادلہ خیالات ہوتا رہا۔ انہوں نے عہد کیا کہ ہم ضرور اس کام کو جا کر شروع کریں گے، ان میں دو شخص ذی علم تھے۔ سب کے بشرے سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ بات کی قدر کر رہے ہیں اور بہت زیادہ اس کام کے لئے آمادہ ہیں۔ حجاز کے بعض سربرآوردہ ہندوستانی مہاجرین سے گفتگو ہوئی۔ پہلے وہ مولانا کی تقریر سے کچھ جھجکے مگر دوبارہ بات چیت کرنے پر بہت حد تک آمادہ ہو گئے۔ ان کی اور سب کی رائے ہوئی کہ پہلے سلطان سے اجازت لی جائے۔ نتیجہ قرار پایا کہ پہلے اغراض و مقاصد کو عربی میں قلمبند کیا جائے، پھر سلطان کے سامنے پیش کیا جائے۔ مولانا احتشام الحسن، عبد اللہ بن حسن شیخ الاسلام اور شیخ ابن بلیہد سے اپنے طور پر ملے۔ (مکتوب مولانا احتشام الحسن صاحب مورخہ ۲۷ فروری ۳۸ء)

دو ہفتے کے بعد (14 مارچ 38ء) کو مولانا، حاجی عبد اللہ دہلوی، عبد الرحمن مظہر، شیخ المطوفین اور مولوی احتشام الحسن صاحب کی معیت میں سلطان کی ملاقات کے لئے تشریف لے گئے۔ جلالۃ الملک نے بہت اعزاز کے ساتھ مسند سے اتر کر استقبال کیا اور اپنے قریب ہی معزز جگہ دی

---

[1] (مکتوب مولانا احتشام الحسن صاحب بنام شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب

[2] مکتوب مولانا احتشام الحسن صاحب مورخہ 27 فروری 38ء 12

مسلمانوں کو سمجھایا۔ ان حضرات نے تبلیغ کا معروضہ پیش کیا جس پر سلطان نے تقریباً گھنٹہ تک توحید و کتاب و سنت اور اتباع شریعت پر مبسوط تقریر کی، اس کے بعد بہت اعزاز کے ساتھ مسند سے اتر کر رخصت کیا۔ اگلے روز سلطان نے نجد کا قصد کیا اور ریاض کے لئے [1] روانہ ہو گئے۔

مولوی احتشام الحسن صاحب نے مقاصد تبلیغ کو اختصار کے ساتھ نوٹ کر کے شیخ الاسلام رئیس القضاۃ عبداللہ بن حسن کے یہاں پیش کیا۔ مولانا اور مولوی احتشام صاحب ان کے یہاں خود بھی گئے۔ انہوں نے بہت اعزاز و اکرام کیا اور ہر بات کی خوب تائید کی، اور زبانی ہمدردی و اعانت کا وعدہ کیا، لیکن اجازت کو نائب عام امیر فیصل کے مشورے پر محمول کیا [2]۔

مکہ معظمہ کے دوران قیام میں صبح و شام دونوں وقت جماعت تبلیغ کے لئے جاتی تھی اور حسب استطاعت انفرادی طور پر لوگوں کو تبلیغی باتوں پر آمادہ کرتی تھی۔ چند جلسے بھی ہوئے جن میں مولوی ادریس اور مولوی نور محمد صاحبان نے اردو میں تقریر کی۔ سننے والے مانوس اور قدردان ہونے لگے [3]۔

رفقائے حج کو مولانا کی تاکید تھی کہ عمرہ اور دوسری عبادات سے زیادہ تبلیغ کا اہتمام کریں۔ کہ اس زمانہ اور اس مقام مقدس میں بالخصوص، اس سے افضل کوئی عبادت اور عمل نہیں ہے۔

خواص و علماء کے ایک اجتماع میں آپ نے یہ سوال پیش کیا کہ مسلمانوں کے تنزل کا سبب کیا ہے؟ حاضرین نے اپنے اپنے طرز کے مطابق اس کا جواب دیا۔ آخر میں آپ نے خود اظہار خیال فرمایا اور دعوت پیش کی جس سے لوگوں نے اتفاق کیا اور متاثر ہوئے۔

ایک عارف کی توثیق:

صاحبزادہ مولوی محمد یوسف صاحب بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم لوگ اپنی قیام گاہ پر جو باب العمرہ کے برابر والے مکان میں تھی، .... بیٹھے ہوئے تھے، حضرتؒ کچھ فرما رہے تھے اور ہم سب سن رہے تھے کہ ایک شخص دروازہ کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے اور خطاب کر کے کہا کہ: جو کام تم کر رہے ہو اس میں مشغول رہو۔ اس کا اجر و انعام اتنا بڑا ہے کہ اگر تمہیں بتلا دیا جائے تو

1-2-1 (مکتوب مولانا احتشام الحسن صاحب بنام شیخ الحدیث 12)

3- مکتوب مولوی احتشام الحسن صاحب بنام شیخ الحدیث 12

برداشت نہ کرسکو شادی مرگ ہو جائے۔ یہ کہہ کر وہ وہاں سے چلے گئے اور ہمیں کچھ نہ معلوم ہوا کہ وہ کون بزرگ تھے۔ مولانا بدستور اپنی گفتگو میں مشغول رہے اور ادھر التفات بھی نہ کیا۔

25 صفر 57ھ کو مکہ معظمہ سے موٹر پر روانہ ہو کر 27 کی صبح کو مدینہ منورہ پہنچے اور وہاں بھی تبلیغی سعی شروع ہوئی۔ معلوم ہوا کہ امیر مدینہ کو اجازت دینے کا کوئی اختیار نہیں، وہ کاغذات مکہ مکرمہ بھیج دیں گے وہاں سے جیسا حکم آئے گا تعمیل کی جائے گی۔ مولانا مولوی سید محمود صاحب اور مولوی احتشام الحسن صاحب کی معیت میں امیر مدینہ سے ملے اور ان سے اپنے مقصد کا بھی اظہار کیا جس کو انہوں نے پسند فرمایا اور زبانی کافی تحسین کی۔

انفرادی طور پر مختلف قسم کے لوگوں سے گفتگو اور مذاکرے رہے، اس مقصد کو لے کر دو مرتبہ قبا بھی جانا ہوا۔ وہاں ایک اجتماع میں مولانا نے تقریر بھی فرمائی، چند آدمی آمادہ بھی ہوئے۔

دو مرتبہ اسی مقصد کے لئے احد بھی جانا ہوا۔ ایک اجتماع میں مولوی نور محمد اور دوسرے مولوی یوسف صاحب نے عربی میں اظہار خیال بھی کیا اور لوگوں نے ترحیب و تحسین کی [1]۔

بدوؤں سے بات چیت ہوتی تھی، بچوں کے کلمات بھی سنے جاتے تھے اور رباط میں بھی جانا ہوتا تھا [2]۔ کام کی طرف سے کبھی امید پیدا ہوتی، کبھی ناامیدی، لیکن اس سفر سے اس قدر اندازہ ہو گیا کہ ہندوستان کے مقابلہ میں عرب میں تبلیغ کی زیادہ ضرورت ہے [3]۔

ہندوستان کو واپسی:

آپ قیام حجاز کے دوران میوات اور دہلی کے کام اور کام کی رفتار سے بے خبر اور بے تعلق نہیں رہے۔ ہندوستان سے برابر خطوط جاتے تھے جن سے کام کی رفتار اور تفصیلات معلوم ہوتی رہتی تھیں۔ آپ ان خطوط کے برابر جواب دیتے تھے جن میں کام کے متعلق ہدایت و ترغیب ہوتی تھی۔

مدینہ منورہ کے پندرہ روزہ قیام کے بعد اہل الرائے کے مشورہ سے آپ نے ہندوستان کی واپسی کا قصد فرمالیا۔ یہاں پہنچ کر آپ نے مکہ مکرمہ کے ایک صاحب کو ان کے استفسار پر ایک خط لکھا تھا جس سے آپ کی کچھ تفصیل معلوم ہو گی۔

---

1 اور 2 (مکتوب مولوی محمد یوسف صاحب بنام شیخ الحدیث۔ 12 ربیع الاول 57ھ۔ 12-)

3 (مکتوب مولانا احتشام الحسن صاحب بنام شیخ الحدیث۔ 12-)۔

مکرم محترم بندہ دام مجدکم

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آنے کا باعث یہ ہوا کہ مدینہ منورہ میں پندرہ روز قیام کے بعد میں نے تبلیغ کو چاہتے ہوئے کام کو بڑے زور استقلال اور محکم بنیاد کے ساتھ شروع کرنے کے بعض طریقوں کی طرف توجہ دلائی تو ہمارے جملہ اہل الرائے نے استحکام کے ساتھ کام جاری ہونے کے لئے کم از کم دو سال کے قیام کو ضروری بتایا جو صحیح تھا۔ میری رائے نے اتفاق کیا۔ لیکن اتنے قیام سے ہندوستان میں جو کام تھا اس کے ضائع ہونے کا قوی خطرہ تھا۔ اس لئے یہاں کام کو اعداد پر ڈالنے کی نیت ہے کہ جس میں وہاں استقلال سے کام کر سکوں۔ عارضی قیام کی نیت سے واپس ہوا ہوں۔ آپ صاحبوں کو دین محمدی کی اگر حفاظت و بقا کا صحیح درد ہے اور آپ کے مشاغل سے دین محمدی زیادہ کام کرنے کی چیز اور کارآمد ہے، اور میرا یہ طریقہ آپ کے نزدیک ٹھیک بھی ہے تو میرے اصول کو براہ راست خود سمجھتے ہوئے اور وہاں کی جماعت کے لوگوں کو براہ راست خود اصول کے سمجھنے کی ترغیب دیتے ہوئے اس کام میں اپنا جانبازی و جاں نثاری کے ذریعہ اپنے ایمان کو مضبوط فرمائیں۔ فقط والسلام

از بندہ محمد الیاس

نظام الدین۔ دہلی

باب پنجم

میوات میں کام کا استحکام اور میوات کے

باہر شہروں میں دعوت و تبلیغ

ہندوستان واپس آ کر آپ نے میوات میں دینی تبلیغی سرگرمی بڑھا دی، بکثرت دورے اور جلسے اور گشت ہونے لگے، دوبارہ جماعتوں کی آمد شروع ہوئی اور میواتی جماعتیں یوپی کے شہروں اور قصبات میں پھرنے لگیں، شہری مسلمانوں کی طرف بھی دعوت کا رخ ہوا، اور میوات کی طرح دہلی میں بھی خاص تحریکیں و ترغیب کا سلسلہ شروع ہوا، محلوں میں جماعتیں بنیں، اور ہفتہ وار گشت کی ابتداء ہوئی۔

مولانا کے قلبی تاثرات اور دعوت کا محرک:

شہروں کی حالت دیکھ کر مولانا کی حساس اور ذکی طبیعت پر چند تاثرات مرتب تھے جن کی وجہ سے دل میں ایک درد اور بے کلی سی رہتی تھی۔

۱- شہر میں دینداری ضرور موجود تھی، مگر وہ برابر گھٹتی اور سکڑتی چلی جا رہی تھی، پہلے دینداری جمہور سے نکل کر مسلمانوں کی ایک معتد بہ تعداد میں محدود ہو گئی، اس کے بعد دین کا دائرہ اور تنگ ہوا اور دین عوام سے نکل کر صرف خواص کے دائرے میں رہ گیا۔ دیکھتے دیکھتے خواص سے اخص الخواص میں سمٹ کر آ گیا، اب دینداری افراد میں رہ گئی تھی اور ان افراد میں بھی برابر کمی آتی چلی جا رہی تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ کہیں کہیں دینداری کی بہت بڑی مقدار بھی ایک جگہ جمع ہو گئی تھی اور بعض اوقات اس کو دیکھ کر آدمی کا دل باغ باغ ہو جاتا کہ الحمد للہ اس زمانے میں بھی دینداری کے ایسے بلند نمونے موجود ہیں مگر دین کا پھیلاؤ گھٹتا جا رہا تھا اور سرعت کے ساتھ انحطاط کی طرف جا رہا تھا، اس سے یہ خطرہ تھا کہ ان افراد کے اٹھ جانے سے دینداری بھی دنیا سے اٹھ جائے اور عام مسلمانوں کی زندگی میں دینداری صرف ایک قصہ بن کر رہ جائے۔

مولانا کی آنکھوں کے سامنے دینداری میں سخت انحطاط اور تنزل ہو گیا تھا، جو خاندان اور قصبات رشد وہدایت کے مرکز تھے اور جہاں صدیوں سے علم وارشاد کی شمع روشن چلی آرہی تھی اور دیئے سے دیا جلتا چلا آرہا تھا، وہ بے نور ہوتے چلے جارہے تھے، جو اٹھتا تھا اپنی جگہ خالی چھوڑ جاتا تھا، اور پھر وہ جگہ تاریک ہو جاتی تھی۔ ضلع مظفرنگر وسہارنپور ودہلی کے مردم خیز قصبات کے دینی انحطاط سے مولانا ذاتی واقفیت رکھتے تھے اور اس کا ان کو بڑا قلق رہتا تھا۔ مولانا نے ایک تعزیت نامہ میں یہ الفاظ لکھے تھے۔

"افسوس کہ جن جبل وعلا کے نام کے ساتھ رد ا لقب لینے والے دنیا میں تو پیدا ہوتے نہیں، اور جو ہستیوں کی برکتوں سے کچھ ہو چکے ہیں وہ اٹھتے چلے جاتے ہیں اور کچھ بدل نہیں چھوڑتے"۔

مولانا اس نقصان کی تلافی اس طرح کرنا چاہتے تھے کہ دین عام طور پر مسلمانوں میں پھیلے اور دینداری عام ہو، پھر ان میں خواص اہل دین پیدا ہوں، یہی پہلے بھی ہوا ہے اور اسی طرح آپ بھی ہو تو کام چلے۔

علم دین کا حصول دینداری سے بھی بدتر تھا۔ وہ تو بہت پہلے خاص الخاص لوگوں اور گھرانوں سے مخصوص ہو کر رہ گیا۔ عام مسلمان دین سے بالکل بے بہرہ ہوتے چلے جارہے ہیں۔ مولانا کا رجحان اس بارے میں یہی تھا کہ علم دین مسلمانوں میں پھیل جائے اور کوئی مسلمان ایسے ضروری علم دین سے جس کے بغیر بحیثیت مسلمان کے زندگی گزارنا مشکل ہے، بے بہرہ نہ رہے پھر ان میں خواص اہل علم، ماہرین فن اور صاحب فضیلت پیدا ہوں۔

2- دین کو شہری مشغول مسلمانوں نے نہایت مشکل سمجھ لیا ہے، اور اس کو ہوا بنا رکھا ہے، ان کے نزدیک دین نام ہے ترک دنیا کا، اور چونکہ ترک دنیا مشکل ہے، اس لئے دین بھی ناممکن العمل ہوا، اور وہ اس بنا پر دین کی طرف سے مایوس ہو کر دنیا میں ہمہ تن منہمک ہو گئے اور غضب یہ ہوا کہ اس زندگی دنیاوی اور اسلامی زندگی سمجھتے ہوئے اس پر راضی اور مطمئن ہو گئے۔ ان کی زندگی کی نسبت اور رشتہ خدا سے کٹ کر نفس سے جڑ گیا، اور ان کی دنیاوی زندگی کی حقیقت وہ ہو گئی جس کو حدیث میں خدا سے بے تعلق ہونے کی وجہ سے خدا کی رحمت سے دور کہا گیا ہے۔

" الدنیا ملعونة و ملعون ما فیھا الا ذکر الله و ما والاہ او عالم او متعلم "

(خالص دنیا اور خالص دنیا کی چیزیں (جو اللہ سے علاقہ نہ رکھتی ہوں) اللہ کی رحمت سے دور ہیں، صرف اللہ کا ذکر (وسیع معنی میں) اس کے متعلقات اور علم و تعلم کا سلسلہ اس سے مستثنیٰ ہے (کیونکہ اس کی نسبت اللہ سے ہے)

نوبت یہاں تک پہنچی کہ اگر دین کی طرف توجہ بھی دلائی جاتی ہے تو بعض مسلمان بے تکلف کہہ دیتے ہیں کہ ہم تو دنیادار لوگ ہیں اور بعض تو یہاں تک تواضع اور صاف گوئی سے کام لیتے ہیں کہ کہہ دیتے ہیں۔

"صاحب ہم تو پیٹ کے بندے اور دنیا کے کتے ہیں"۔

مولانا کے نزدیک حقیقت اس کے بالکل خلاف تھی۔ اپنے دنیاوی مشاغل اور تعلقات کو شریعت کے احکام کے ماتحت اور دین کے سانچے میں ڈھال دینا ہی دین ہے اور یہ ایسی چیز ہے جو ہر مسلمان اپنی دنیاوی مشغولیت اور تعلقات کے ساتھ کر سکتا ہے، لیکن اس کیلئے تھوڑی سی توجہ اور معمولی سے علم دین کی ضرورت ہے، مولانا کے نزدیک اس حقیقت کی تبلیغ کی بڑی ضرورت تھی، اس کے نہ معلوم ہونے اور اس کی طرف توجہ نہ ہونے ہی سے مسلمانوں کا سواد اعظم دین کی دولت سے محروم ہوا جا رہا ہے اور دنیا پرستی اور نفس پروری پر قانع ہوتا چلا جا رہا ہے۔

مولانا ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:

> "دنیا کا مفہوم نگاہ میں بہت غلط ہے، معیشت دنیا کے اسباب میں مشغول ہونے کا نام دنیا ہرگز نہیں ہے دنیا پر لعنت ہے اور لعنت کی چیز کا خدائے پاک کی طرف سے حکم نہیں ہو سکتا لہذا جس چیز کا حکم ہے اس کا حکم سمجھ کر اس کے اندر سرگرمی کرنا یعنی حکم کو تحقیق کرنا اور حکم کی عظمت کے ماتحت اس کے حلال و حرام کا دھیان کرنا اسی کا نام دین ہے اور حکم سے قطع نظر کر کے خود اپنی ضرورتوں کو محسوس کرنا اور حکم کے علاوہ کوئی اور وجہ اس کے ضروری ہونے کی قرار دینا اس کا نام دنیا ہے [1]"۔

مولانا دین کی مثال اس لعاب دہن سے دیا کرتے تھے جس کی تھوڑی سی مقدار کی شمولیت کے بغیر نہ کسی چیز میں ذائقہ پیدا ہوتا ہے اور نہ وہ چیز ہضم ہوتی ہے۔ یہ مقدار ہر انسان کے پاس

---

[1] (بنام میاں محمد عیسیٰ فیروز پور نمک)

موجود ہے۔ اسی طرح دین کی یہ ضروری مقدار ہر مسلمان کے پاس موجود ہے صرف اس کو اپنے دنیاوی مشاغل اور تعلقات میں شامل کرنے کی ضرورت ہے جس سے اس کی ساری دنیا دین بن جائے۔

3 عرصہ دراز سے علم دین کے متعلق یہ خیال قائم کیا گیا ہے کہ وہ صرف کتابوں اور نصاب اور خاص اساتذہ کے ذریعہ عربی مدارس میں کئی برس کی سخت محنت سے حاصل ہو سکتا ہے اور چونکہ ہر شخص مدرسہ کا طالب علم نہیں بن سکتا، اس لئے عام مسلمانوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ علم دین ان کی قسمت میں نہیں اور یہ طے کر لیا کہ ان کی زندگی جہالت ہی میں گزرے گی۔

یہ صحیح ہے کہ علم دین عربی مدرسوں میں حاصل ہوتا ہے مگر یہ دین کا تکمیلی علم اور درجہ فضیلت ہے، لیکن ہر مسلمان کے لئے یہ علم اور یہ درجہ نہ ضروری ہے نہ ممکن ہے۔ دین کا ضروری علم ہر مسلمان اپنے کاروبار دنیاوی علائق و مشاغل کے ساتھ حاصل کر سکتا ہے۔ صحابہ کرامؓ (اصحاب صفہ کی محدود اور ایک مختصر جماعت کے سوا) سب اپنے اپنے مشاغل اور تعلقات زن و فرزند رکھتے تھے۔ وہ تاجر بھی تھے اور کاشتکار بھی تھے اور اہل حرفہ بھی۔ ان کے ساتھ بھی گھر کا بار اور زندگی کا جنجال تھا۔ مدینہ منورہ میں علوم دینیہ کا کوئی مدرسہ بھی نہ تھا، اگر ہوتا بھی تو وہ اس کے باقاعدہ طالب علم نہیں بن سکتے تھے اور اپنے آٹھوں پہر صرف اس کی طالب علمی میں صرف نہیں کر سکتے تھے، مگر سب جانتے ہیں کہ وہ ضروری علم دین رکھتے تھے اور دین کی ضرورت و مسائل و احکام اور فضائل کے علم سے بے بہرہ نہیں تھے، یہ علم ان کے پاس کہاں سے آیا؟ محض رسول کی مجلس میں شرکت و حضوری، زیادہ جاننے والوں کے پاس بیٹھنے اور اہل دین کی صحبت و اختلاط اور ان کے حرکات و سکنات کو بغور دیکھنے، سفروں اور جہاد میں رفاقت اور ہر وقت اور ہر موقع احکام معلوم کرنے اور دینی ماحول میں رہنے سے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس درجہ اور معیار کی بات آج حاصل نہیں ہو سکتی، لیکن اس سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اس کی کچھ نہ کچھ صورت انہیں راستوں سے آج بھی پیدا کی جا سکتی ہے۔

مولانا کے نزدیک اس کی تدبیر یہی تھی کہ مشغول اور کاروباری مسلمان کو اور عام اہل شہر کو دین کا ضروری علم حاصل کرنے کے لئے اپنے اوقات کا کچھ حصہ فارغ کرنے کی دعوت دی جائے اور دین کے لئے مال کی طرح وقت کی زکوٰۃ نکالنے پر آمادہ کیا جائے۔ ان کو اس ماحول سے نکلنے کی

دعوت دی جائے جس کے متعلق ان کا عمر بھر کا تجربہ ہے کہ وہ اس میں رہتے ہوئے اپنی زندگی میں کوئی محسوس تبدیلی پیدا نہ کر سکے اور دین کے ابتدائی اور ضروری مسائل (ان کی ضرورت کا اقرار اور بعض اوقات عزم رکھنے کے باوجود) حاصل نہیں کر سکے۔ جہالت و ناواقفیت کے اس مقام پر جو شخص 25،20 برس پہلے تھا آج بھی ٹھیک اسی مقام پر ہے۔ جس کی نماز غلط تھی اس کی نماز 15 برس سے غلطی چلی آرہی تھی۔ جس کو دعائے قنوت یا نماز جنازہ کی دعا یاد نہیں تھی اس کو سینکڑوں وعظ سننے اور برسوں علماء کے پڑوس میں رہنے کے باوجود اور ہزاروں کتابوں کے بازار میں بکنے کے باوجود ابھی تک وہ یاد نہیں ہے اس سے ثابت ہو گیا کہ اس ماحول میں اس کے لئے تبدیلی اور ترقی کا صرف عقلی امکان اگر چہ ہے، لیکن تجربہ اس کے بالکل برخلاف ہے۔

پس اس کا ذریعہ صرف یہ ہے کہ ان کو عارضی طور پر اس غیر دینی اور جامد ماحول سے نکال کر کسی زندہ اور بیدار دینی ماحول میں رکھا جائے تا کہ وہ کچھ دنوں کے لئے اپنے قدیم ماحول کے اثرات سے آزاد ہوں اپنے مشاغل سے فرصت پائیں، ان کی دینی عزیمت اور قوت ارادی جو ماحول کی ناموافقت اور مشاغل کی مزاحمت سے شکست کھا کر افسردہ اور کمزور ہو گئی ہے، پھر زندہ اور بیدار ہو، سویا ہوا دینی احساس اور طلب ان کے دلوں میں انگڑائی لے اور ان میں دین حاصل کرنے کا پھر حوصلہ پیدا ہو۔

4 مولانا کے نزدیک مسلمان کی زندگی کی اصل ساخت یہ تھی کہ وہ اسلام کی نصرت و خدمت اور اس کے عملی کاموں میں عملاً شریک ہو یا جو لوگ ان کاموں میں مشغول ہیں ان کے لئے پشت پناہ ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی ان کاموں میں خود عملاً شریک ہونے کا عزم اور جذبہ رکھتا ہو اور صرف کسی معذوری یا دینی مصلحت کی وجہ سے ہی وقتی طور پر اس سے علیحدہ ہو۔ شہروں کی پُرسکون اور کاروباری زندگی جس کو مولانا مہاجرانہ اور مجاہدانہ زندگی کے مقابلہ میں سکونی زندگی فرماتے تھے، اسلام کی راہ راست سے ہٹی ہوئی اور بگڑی ہوئی زندگی ہے۔

شہروں کی زندگی مدت ہائے دراز سے خالص کاروباری، کمانے اور کھانے کی زندگی رہ گئی ہے، مولانا اس طرز زندگی کو دیکھ کر کڑھتے رہتے تھے اور چاہتے تھے کہ اہل شہر بھی" ہجرت و نصرت" کی زندگی اختیار کریں اور شہروں میں بھی اس کا رواج ہو۔

مولانا اس تقسیم کے قائل نہ تھے کہ کچھ لوگ دین کی خدمت کریں اور کچھ لوگ اطمینان سے اپنا

کاروبار کریں اور دنیاوی ترقی میں مشغول رہیں اور کبھی کبھی اہل دین کی مالی اعانت و خدمت کر دیا کریں، اور سمجھ لیں کہ تقسیم عمل کے اصول سے علماء اور اہل دین کے ذمہ دین کی خدمت ہے، اور ان کے ذمہ دنیاوی ترقی اور اہل دین کی حسب توفیق بس مالی امداد ہے۔

مولانا فرماتے تھے کہ: جس طرح زندگی کے ضروری کاموں میں تقسیم عمل نہیں، اس پر کوئی راضی نہیں کہ ایک کھانا کیا کرے، دوسرا پانی پیا کرے، اور تیسرا پہن لے، بلکہ ہر شخص ان میں سے ہر کام فرداً فرداً اپنے لئے ضروری سمجھتا ہے، اسی طرح مذہب کے فرائض کی پابندی، دین کا ضروری علم حاصل کرنا، اور فی الجملہ دین کی نصرت، اعلاء کلمۃ اللہ کی کوشش ہر شخص کے لئے کسب معاش کے ساتھ ضروری ہے۔

دہلی میں میواتیوں کا قیام:

ان تمام وجوہ کی بناء پر مولانا شہروں کے مسلمانوں کیلئے اپنی یہ دعوت بہت ضروری سمجھتے تھے اور بہت زور کے ساتھ ان کے سامنے یہ دعوت پیش کرنا چاہتے تھے، مگر مولانا اس کے لئے محض مواعظ اور تقریر و تحریر کافی نہیں سمجھتے تھے، بلکہ عملی نمونہ اور عملی آغاز کے بعد اس کو مفید سمجھتے تھے۔ ایک گرامی نامہ میں ارشاد فرمایا:

"جب تک عوام کے سامنے عملی نمونہ نہ ہو، محض منبروں پر کی تقریر عمل پر پڑنے کے لئے کافی نہیں ہو سکتی۔ اگر تقریر کے بعد عمل پر پڑنے کی تجویز تکمیل نہ ہو تو عوام کے اندر گستاخی اور بے ادبی کے لفظ بولنے کی عادت پڑ جائے گی"۔

چنانچہ آپ نے دہلی شہر اور دوسرے بڑے بڑے مرکزوں میں میواتیوں کی جماعتیں بھیجنی شروع کیں، اور انہوں نے دہلی میں طویل قیام کرنا شروع کیا۔ ابتداء میں ان کو دہلی میں بڑی دقتیں پیش آئیں، ان کو مسجدوں میں رات کو جگہ دینے سے انکار کر دیا جاتا، کسی مسجد میں اگر ٹھہر بھی گئے تو ضروریات پوری کرنے میں بڑی تکلیف ہوتی، لوگ ان کی شکایتیں کرتے اور برا بھلا کہتے۔ وہ شہر کی تکلیفوں سے دق ہو کر اہل شہر کی بے مہری سے تنگ آ کر اپنے امراء اور ذمہ داروں سے شکوہ کرتے، وہ غریب کبھی اہل محلہ کی خوشامد کرتے کبھی میواتی بھائیوں کو سمجھا بجھا کر خاموش

کرتے، مگر یہ ایک مستقل جہاد اور آزمائش تھی جو روزانہ [1] پیش آتی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ دقتیں دور ہوئیں۔ لوگوں کی نگاہیں اور سلوک بدل گئے اور اپنے جوش واخلاص اور قربانی کی وجہ سے میواتی محبت کی نظر سے دیکھے جانے لگے۔

اہل علم کی طرف توجہ:

آپ نے اپنے نزدیک اس کا فیصلہ کر لیا تھا کہ جب تک اہل حق اور اہل علم اس کام کی طرف متوجہ نہ ہوں گے اور اس کی سرپرستی نہ کریں گے اس وقت تک اس اجنبی دعوت اور اس نازک اور لطیف کام کی طرف سے (جس میں بڑی دقیق رعائتیں اور نزاکتیں ملحوظ ہیں) اطمینان نہیں کیا جا سکتا آپ کو اس کی بڑی آرزو تھی کہ اہل اشخاص اس کام کی طرف توجہ کریں اور اپنی قابلیتوں اور خداداصلاحیتوں کو اس کام کے فروغ میں لگائیں جس سے اسلام کے درخت کی جڑ شاداب ہوگی، پھر اس سے اس کی تمام شاخیں اور پتیاں سرسبز ہو جائیں گی۔

اس سلسلہ میں آپ علماء سے صرف وعظ وتقریر ہی کے ذریعہ اعانت نہیں چاہتے تھے، بلکہ آپ کی خواہش اور آپ کا مطالبہ علماء عصر سے سلف اول کے طرز پر اشاعت دین کے لئے عملی جدوجہد اور دربدر پھرنے کا تھا۔ شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''عرصہ سے میرا خیال ہے کہ جب تک علمی طبقہ کے حضرات اشاعت دین کے لئے خود جا کر عوام کے دروازوں کو نہ کھٹکھٹائیں اور عوام کی طرح یہ بھی گاؤں گاؤں اور شہر شہر اس کام کے لئے گشت نہ کریں، اس وقت تک یہ کام درجہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا کیونکہ عوام پر جو اثر اہل علم کے عمل و حرکت سے ہوگا وہ ان کی دھواں دھار تقریروں سے نہیں ہو سکتا۔ اپنے اسلاف کی زندگی سے بھی نمایاں ہے جو کہ آپ حضرات اہل علم پر بخوبی روشن ہے''۔

درس وتدریس سے تعلق رکھنے والے بعض بزرگوں کو شبہ تھا کہ تبلیغ واصلاح کی اس کوشش میں

---

1 (مولانا نے کئی بار ذکر فرمایا کہ ایک روز میاں جی داؤد (جو اکثر میواتیوں اور اہل شہر کے درمیان واسطہ ہوتے دو طرفہ شکایت اور غم وغصہ سن کر اور عاجز آ کر بہت روئے۔ مولانا فرماتے تھے کہ ان کے اس رونے سے راستہ کھل گیا اور کام میں بڑی برکت ہوئی)

مدرسین اور طلبہ مدارس کا اشتغال ان کے علمی مشاغل اور علمی ترقی میں حارج ہوگا لیکن آپ جس طرح مستعار پر علماء مدارس اور طلبہ سے یہ کام لینا چاہتے تھے، وہ درحقیقت علماء اور طلباء کے علوم کی ترقی و پختگی کا ایک مستقل انتظام تھا، ایک گرامی نامہ میں لکھتے ہیں۔

"علم کے فروغ اور ترقی کے بقدر اور علم ہی کے فروغ اور ترقی کے ماتحت دین پاک فروغ اور ترقی پا سکتا ہے، میری تحریک سے علم کو ذرا بھی ٹھیس پہنچے یہ میرے لئے خسران عظیم ہے۔ میرا مطلب تبلیغ سے علم کی طرف ترقی کرنے والوں کو ذرا بھی روکنا یا نقصان پہنچانا نہیں ہے، بلکہ اس سے بہت زیادہ ترقیات کی ضرورت ہے اور موجود جہاں تک ترقی کر رہے ہیں، یہ بہت ناکافی ہے۔

مولانا چاہتے ہیں کہ اس تبلیغی کام ہی کے ضمن میں طلباء اپنے اساتذہ ہی کی نگرانی میں اپنے علوم کے حق ادا کرنے اور مخلوق کو ان سے فائدہ پہنچانے کی مشق کریں تاکہ ان کے علوم خلق اللہ کے لئے نافع ہوں۔ ایک گرامی نامہ میں لکھتے ہیں:

"کاش تعلیم ہی کے زمانہ میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی استادوں کی نگرانی میں مشق ہو جایا کرے تو علوم ہمارے نفع مند ہوں، ورنہ افسوس کہ بیکار ہو رہے ہیں، ظلمت و جہل کا کام دے رہے ہیں۔ الا ما شاء اللہ و الیہ راجعون"۔

بہرحال اپنی اس دعوت کو اہل علمی و دینی حلقوں میں پہنچانے کے لئے آپ نے جماعتوں کا رخ دینی مرکزوں کی طرف کیا۔

دینی مرکزوں میں کام کے اصول:

آپ نے میواتیوں کو دیوبند، سہارنپور، رائے پور اور تھانہ بھون کی طرف بھیجنا شروع کیا اور ہدایت فرمائی کہ بزرگوں کی مجلسوں میں تبلیغ کا ذکر نہ کریں، ۵۰، ۶۰ آدمی ہوں گے دیہاتوں میں گشت کریں اور آٹھویں روز قصبہ میں جمع ہو جائیں، پھر وہاں سے دیہات کے لئے تقسیم ہو جائیں۔ حضرات اکابر کی طرف سے اگر پوچھا جائے تو تمنا بیان کی جائے از خود کچھ ذکر نہ کیا جائے۔

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کو ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

"میری ایک پرانی تمنا ہے کہ خاص اصولوں کے ساتھ مشائخ طریقت کے یہاں یہ جماعتیں آداب خانقاہ کی بجا آوری کرتے ہوئے خانقاہوں میں فیض اندوز ہوں اور

جس میں باضابطہ خاص وقتوں میں جوار کے گاؤں میں تبلیغ بھی جاری رہے، اس بارے میں ان آنے والوں سے مشورت کر کے کوئی طرز مقرر فرمادیجئے، یہ بندہ ناچیز بھی اس ہفتہ بہت زیادہ طالب ہے کہ چند طلباء کے ساتھ حاضر ہو۔ دیوبند اور تھانہ بھون کا بھی خیال ہے"۔

اہل بصیرت کا اطمینان:

اس طریقے سے بعض اہل بصیرت کو کام کرنے کی طرف سے اطمینان ہونے لگا اور ان کے شکوک وشبہات جو اس کام سے متعلق تھے زائل ہوئے۔

تھانہ بھون میں اسی طرح ہوا۔ جماعتیں تھانہ بھون کے ماحول اور آس پاس کام کرتی رہیں، اعتراف واکتناف سے آنے والے مولانا اشرف علی صاحبؒ سے جماعتوں کی کارگزاری، ان کے طرز واصول اور ان برکات کا ذکر کرتے جو ان کے گشت وقیام سے ان مقامات میں نظر آنے لگے تھے۔ مولانا کو پہلے بڑا شبہ اس میں تھا کہ جب ان علماء کو جنہوں نے آٹھ آٹھ دس دس برس مدرسوں میں تعلیم پائی تھی تبلیغ دین میں پوری کامیابی نہیں ہوتی بلکہ صدہا اور ہنگامے کھڑے ہو جاتے ہیں تو یہ جاہل میواتی بغیر علم وتربیت کے اتنا نازک کام کیسے کریں گے۔

مولانا کی احتیاط اور دوررس طبیعت اس کی طرف سے غیر مطمئن تھی کہ کہیں اس طریقہ سے کوئی بڑا فتنہ پیدا ہو، لیکن ان میواتیوں کے عملی کام اور قرب وجوار کی متواتر خبروں اور تصدیقوں سے اور پھر ان کی آمد کی برکات کو خود ملاحظہ کرنے سے آپ کو اس کا اطمینان ہوا۔ چنانچہ ایک موقع پر جب مولانا محمد الیاس صاحب نے اس طرز کے متعلق کچھ گفتگو کرنی چاہی تو مولانا نے فرمایا کہ دلائل کی ضرورت نہیں، دلائل تو کسی چیز کے ثبوت اور صداقت کے لئے پیش کئے جاتے ہیں، میرا تو اطمینان عمل سے ہو چکا ہے، اب کسی دلیل کی ضرورت نہیں، آپ نے تو ماشاء اللہ یاس کو آس سے بدل دیا ہے۔

مولانا کو ایک بے اطمینانی یہ تھی کہ علم کے بغیر یہ لوگ فریضہ تبلیغ کیسے انجام دے سکیں گے؟ لیکن جب مولانا ظفر احمد صاحب نے بتایا کہ یہ مبلغین ان چیزوں کے سوا جن کا ان کو حکم ہے کسی اور چیز کا ذکر نہیں کرتے اور کچھ اور نہیں چھیڑتے تو مولانا کو مزید اطمینان ہوا۔

مولانا کا جوش و یقین اور اہلِ علم کی کم توجہی:

مولانا کو اپنے کام پر یقین بے حد بڑھ چکا تھا اور جوش حد سے فزوں تھا، مگر اہلِ علم اس کام کے شایانِ شان توجہ نہیں کر سکتے تھے جس کا مولانا کو بڑا قلق اور بے چینی رہا کرتی تھی۔ روز بروز یہ یقین بڑھتا ہی جاتا تھا کہ وقت کے تمام فتنوں کا علاج اور زمانے کے ہر تقاضے کا جواب اصل دین کی یہی کوشش ہے، جب کوئی نیا فتنہ پیدا ہوتا تو دل کا یہ جوش زبان اور قلم پر آ جاتا۔ ایک ایسے ہی موقع پر ایک دینی مدرسے کے ایک ذمہ دار کو تحریر فرمایا:

''میں کون سی قوت سے سمجھاؤں اور کون سی زبان سے بیان کروں اور اس کے علاوہ کون سی قوت سے اپنے دماغ میں بساؤں اور متعین اور بدیہی امر معلوم کو مجہول اور مجہول کو معلوم کیونکر بناؤں، میرے نزدیک صاف صاف ان فتنوں کے دریائے اٹک اور ان ظلمات کی جمنا کے سیل کو روکنے کی سد سکندری سوا میری والی تحریک میں قوت کے ساتھ اپنی قوت جہد کو اور اندرونی جذبات کو اور رحمت کیساتھ جملہ مساعی کو متوجہ کر دینے کی کوئی صورت نہیں۔ غیب سے اس تحریک کی صورت کا نمایاں ہو جانا ہی صرف اس وبا کا علاج ہے، جیسا کہ عادت ازلیہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہ، وبا کے مناسب علاج بھی پیدا فرمایا کرتے ہیں، حق تعالیٰ شانہ کے یہاں کے پیش کئے ہوئے علاج اور نعمت کا توجہ سے استقبال نہ کرنا کچھ بہتر نہیں ہوا کرتا''۔

اسی یقین، اسی درد اور اسی خطرہ اور خوف کو ایک دوسرے گرامی نامہ میں اس طرح ظاہر فرماتے ہیں:

از بندہ حقیر فقیر ناکارہ دوجہاں محمد الیاس عفی عنہ

الحمدللہ الذی بعزتہ و جلالہ تتم الصالحات اللھم لک الحمد شکراً و لک المن فضلا

السلام علیکم ورحمۃ وبرکاتہ، میں آپ سے کن الفاظ کے ساتھ ظاہر کروں کہ میں آپ کو اس وقت کس بے کلی کے ساتھ خط لکھ رہا ہوں۔ میرے عزیز دوست بات یہ ہے کہ اس تحریک میں کھڑے ہونے سے جس قدر اللہ جل جلالہٗ کی رضا اور اس کے قرب اور اس کی نصرت اور اس کا فضل و کرم کھلا اور کثرت سے نظر آتا ہے، وہیں مجھے یہ ڈر پیدا ہوتا

یہ کہ اللہ کے اس قدر بڑے مہمان کا استقبال اور اکرام اور تشریف اس کے مناسب نہ ہو کر موجب حرمان و خسران و بدبختی نہ ہو۔"

مگر مولانا اس غم اور سوز سے اندر ہی اندر گھلتے تھے، حتی الامکان شکایت زبان پر نہیں لاتے تھے، کسی کو الزام دینا مولانا کے مسلک اور اصول کے خلاف تھا، بلکہ اگر غیر علماء میں سے کوئی ان حضرات کی سرد مہری کی شکایت کرتا تو فرماتے کہ جب تم سے اس کام کے لئے اپنے وہ مشاغل اور دلچسپیاں نہیں چھوڑی جاتیں جن کے متعلق خود تمہارا خیال ہے کہ وہ دنیاوی ہیں تو یہ حضرات اپنے وہ مشاغل اور دلچسپیاں کیسے چھوڑ دیں جن کے متعلق ان کا یقین ہے اور حق ہے کہ وہ دینی ہیں۔ تم سے اگر وہ کام نہیں چھوڑی جاتی تو ان سے مسندوں کے چھوڑ دینے کی توقع کیوں کرتے ہو اور اس پر تمہیں ان سے کیوں شکایت ہے"۔

بے التفاتی کے اسباب:

اس دعوت کی طرف پوری توجہ نہ ہو سکنے کے چند اسباب تھے۔

1۔ یہ زمانہ عام تحریکات کا تھا اور ذہن و دل عام طور پر ان میں مشغول تھے۔ مولانا کی خاموش اور تعمیری تحریک کی طرف توجہ کرنا اس ہنگامہ خیز زمانے میں مشکل تھا، نیز تحریکات کا عام تصور اور مسلسل تلخ تجربہ بھی اس کے متعلق کوئی بڑا حسن ظن قائم کرنے سے مانع تھا۔

2۔ اس کام کے متعلق لوگوں کو بہت کم معلوم تھا اور سوائے قریبی تعلق رکھنے والوں کے عام اہل علم اور خصوصاً دور افتادہ لوگوں کو کچھ خبر نہ تھی۔ کام اور اس کے اثرات و نتائج کی کوئی اشاعت نہیں کی گئی تھی۔

3۔ لفظ تبلیغ جو اس دعوت کا عمومی اور مشہور عنوان ہے، اس تحریک کی گہرائی اور اہمیت سمجھنے سے بڑا حجاب بنتا تھا۔ لوگ اس کو ایک سطحی تبلیغی تحریک سمجھ کر توجہ نہیں کرتے تھے یا فرض کفایہ سمجھ کر اپنے ذمہ کوئی فرض نہیں سمجھتے تھے۔

4۔ اس دعوت و تحریک کو اہل علم کے سامنے پیش کرنے والے خود مولانا تھے اور ان کا حال یہ تھا کہ نئے نئے مضامین کے ورود اور جوش بیان اور کچھ لکنت کی وجہ سے اکثر گفتگو بھی جاتی تھی اور مفہوم واضح نہیں ہو سکتا تھا۔ بلکہ کبھی کبھی اس وجہ سے خود وہ کے ذہن

میں انتشار اور طبیعت میں توحش پیدا ہو جاتا تھا اور وہ تحریک کا مغز نہیں سمجھ پاتا تھا۔

نیز بعض مضامین ایسے بلند ہوتے تھے جو عام درسی اور متداول کتابوں میں نہیں پائے جاتے اور غیر اصطلاحی زبان میں ادا ہوتے جس کی وجہ سے بہت سے علماء کو پہلی مجلس میں مناسبت نہ پیدا ہوتی اور زیادہ وقت صرف کرنا ان حضرات کے لئے مشکل تھا۔

5- لوگ سیدھے سادے میواتیوں کو دیکھ کر مولانا کی نسبت کوئی بلند خیال قائم نہیں کر سکتے تھے۔ وہ مولانا کو میواتیوں کے شیخ و مرشد کی حیثیت سے جانتے تھے جنہوں نے ان سادہ مزاج میواتیوں میں ایک نئی روح پیدا کر دی ہے۔

سوز دروں:

لیکن اب طبیعت کا چشمہ رواں اُبلنے اور بہنے کے لئے بیتاب تھا اور طبعی ارتقاء کے لحاظ سے اس کا وقت آ گیا تھا کہ یہ دعوت عام ہو .... ہاتف غیب کی زبان پر بھی بہت دنوں سے تھا[1]۔

ایک سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند
اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی

ادھر مولانا کی طبیعت پر دعوت کا غلبہ روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ مضامین اور علوم کا شدت سے زبان پر ورود تھا، دعوت اور نظام کے مختلف گوشے اور پہلو نظر کے سامنے آتے جاتے تھے اور ان کے نصوص اور مآخذ کتاب و سنت، سیرت رسولؐ اور صحابہ کرامؓ کی زندگی میں مل رہے تھے۔ دوسری طرف ان علوم و معارف کو سننے کے لئے مولانا ہی کے ساختہ پرداختہ دو چار نو عمر اہل علم کے علاوہ بس سیدھے سادے میواتی تھے جو مولانا کی علمی زبان (جس میں بکثرت تصوف کے اصطلاحات اور شرعی الفاظ ہوتے تھے) کم سے نامانوس تھے۔ اس وقت زبان حال اگر اس طرح گویا

---

[1] (علامہ اقبال کے پہلے مصرعہ "تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند" میں یہ ترمیم اس لئے کی گئی ہے کہ راقم کے نزدیک سو سال سے پہلے ہندوستان میں اسلام کا مے خانہ اس طرح کھلا تھا کہ مشکل سے کوئی تشنہ لب رہا۔ حضرت سید صاحب اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی تحریک اصلاح و تجدید ہندوستان کی آخری عمومی تحریک تھی جو خالص دینی بنیادوں پر اٹھائی گئی تھی)

ہوئی تو عجب نہیں۔

من مثال لالۂ صحرا ستم   درمیان انجمن تنہا ستم
شمع را تنہا تپیدن سہل نیست   آہ یک پروانہ من اہل نیست
انتظار غمگسارے تا کجا   جستجوئے رازدارے تا کجا؟
درجہان یارب ندیم من کجاست   نخل سینا یم کلیم من کجاست

میواتی اگرچہ ان بلند اور دقیق علوم سے بھی علمی مناسبت نہیں رکھتے تھے مگر اس کام سے روحی مناسبت رکھتے تھے۔ قوت عمل میں اہل علم اور اہل شہر سے بہت بڑھے ہوئے تھے۔ پندرہ بیس برس کی لگاتار جدوجہد کا حاصل اور تحریک کا سرمایہ تھے۔ مولانا اس حقیقت سے خوب واقف تھے اور آپ نے اس کا بارہا اعتراف فرمایا۔ چند میواتی احباب کو ایک خط میں اپنے دل کی بات لکھتے ہیں:

"میں اپنی قوت اور ہمت کو تم میواتیوں پر خرچ کر چکا۔ میرے پاس بجز اس کے کہ تم لوگوں کو اور قربان کر دوں کوئی اور پونجی نہیں۔ میرا ہاتھ بٹاؤ[1]۔"

"دنیاوی کاروبار میں مصروف رہنے والے جتھے ہیں دین کے فروغ کے لئے گھر بار چھوڑنا اس وقت اللہ نے میووں کو نصیب کیا ہے[2]۔"

سہارنپور میں تبلیغی جماعتوں کا تسلسل:

مولانا سہارنپور کے دینی اور علمی مرکز کو نظر انداز نہیں کرنا چاہتے تھے۔ زبانی دعوت اور تحریک تو برابر ہی فرمایا کرتے تھے اور مدرسہ مظاہر العلوم کے اساتذہ اور متعلمین مولانا سے شخصی طور پر سب سے زیادہ واقف اور آپ سے مانوس و قریب تر بھی تھے۔ نیز میوات کے جلسوں میں شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب اور جناب مولانا حافظ عبداللطیف صاحب ناظم مدرسہ مظاہر العلوم کے علاوہ بھی مدرسہ کے اساتذہ و مدرسین برابر شرکت کرتے تھے اور مولانا کی دعوت و طلب پر ہمیشہ نظام الدین پہنچ جاتے تھے، لیکن اب مولانا نے اس مقدار کو بڑھانے کے لئے سہارنپور کی طرف تبلیغی جماعتوں کا خاص رخ کر دیا۔

1 (بنام میواتی احباب و متعلمین خصوصاً مولوی سلیمان)

2 (بنام میاں محمد عیسیٰ فیروز پور نمک)

سہارنپور و مظفر نگر کے اطراف میں تبلیغی دورے:

مولانا نے مدرسہ مظاہر العلوم کے اساتذہ کے ساتھ سہارنپور کے نواح بہٹ، مرزاپور، سلیم پور اور دوسرے دیہاتوں اور مواضعات میں تبلیغی دورے فرمائے اور جلسے کئے۔

13 جمادی الثانی 56ھ سے 20 جمادی الثانی ایک بڑی جماعت کے ساتھ کاندھلہ کے نواح کے دیہاتوں میں دورے کئے اور جماعتیں قائم کیں۔ شیخ الحدیث صاحب بھی اس سفر میں ہمراہ تھے۔ اس سفر میں مولانا پر حقوق الوطن کا بہت غلبہ تھا۔ مولانا کے نزدیک ان حقوق کی ادائیگی کی کوئی صورت اور اہل وطن کے لئے اس تبلیغ سے بہتر کوئی اور سوغات اور تحفہ نہیں تھا۔

59ھ میں قرار پایا کہ میوات کی جماعتوں کا مسلسل سہارنپور میں رہنا چاہیے اور پہلی جماعت جب جائے تو دوسری آ جائے، ایک سال تک مدرسہ کے مکانات میں قیام رہا۔ محرم 61ھ سے مستقل مکان اس کے لئے کرایہ پر لیا گیا۔ مگر چند ماہ بعد وہ مکان چھوٹ گیا۔ اخیر 62ھ تک مسلسل چار سال تک یہ دور رہا۔ ان شہروں اور قصبات میں جو علم و دین سے بڑی حد تک معمور ہیں ان دیہاتی ناخواندہ میواتیوں کو بھی کبھی ناقدرانہ نظر سے دیکھا جاتا اور اس پر تعجب کا اظہار کیا جاتا کہ ان بے علم میواتیوں سے جو خود تعلیم و اصلاح کے محتاج ہیں، تبلیغ و اصلاح کا کام لیا جاتا ہے۔ مولانا نے اس پر متنبہ فرمایا کہ یہ ان کا موضوع ہی نہیں ہے، ایک خط میں مقصد کی وضاحت فرماتے ہوئے تحریر فرمایا:

> "ان لوگوں (میواتیوں) کو مبلغ نہ سمجھیں بلکہ اس ایک چیز کے علاوہ یعنی دین پھیلانے کے لئے گھر بار چھوڑ کر باہر نکلنا اس چیز کو تو ان سے سیکھیں اور دیگر تمام اشیاء میں ان لوگوں کو اپنا محتاج سمجھیں، اپنے ذہن میں ان کو مبلغ سمجھ کر پھر اعتراض کرتے ہیں"۔

باہر سے لوگوں کی آمد:

55-59ھ میں اس تحریک دعوت کے متعلق رسائل میں بعض مختصر مضامین شائع ہوئے اور میوات و دہلی کے باہر تذکرہ شروع ہوا کہ جن لوگوں کو اسی نوع کے کام کی یا صحیح طریقے پر دین کے کام کی طلب و جستجو تھی، انہوں نے سفر کیا۔ مولانا سے ملے اور میوات گئے۔ اس خوش نصیب گروہ میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے بعض مدرسین بھی تھے، ان کے مشاہدات و تاثرات نے کچھ اور

لوگوں کو کھینچا۔ بعض باخبر آدمیوں نے اس کو ایک "انکشاف" سے موسوم کیا اور اس پر حیرت کی کہ یہ کام کس طرح اتنی مدت تک گمنامی سے ہوتا رہا۔

مولانا نے اپنی عادت اور تواضع کے مطابق نئے آنے والوں کی آمد پر بڑی مسرت کا اظہار کیا اور ان کی بڑی قدر دانی فرمائی۔ علمی اور درسی حلقوں کی توجہ منعطف ہونے لگی اور لوگ باہر سے آنے لگے۔ مولانا نے ان نو واردوں کا ایسا اکرام فرمایا جس پر ان کو بھی حیرت ہوئی اور کام سے لگاؤ پیدا ہونے کا سبب ہوا۔

دہلی کے کام کی تنظیم:

دہلی کے کام کو منظم کرنے اور اس کو ترقی دینے کے لئے آپ نے حافظ مقبول حسین صاحب کو شہر دہلی کی تمام جماعتوں کا امیر اور ذمہ دار بنایا۔ حافظ صاحب کی مستعدی اور جناب حافظ فخر الدین صاحب کی توجہات سے جماعتوں میں زیادہ باقاعدگی اور انضباط پیدا ہو گیا۔

کارکنوں میں ایک دوسرے سے ربط اور کام میں روح اور سرگرمی پیدا کرنے کے لئے جمعہ کی رات نظام الدین میں قیام کرنے کے لئے اور مہینہ کا آخری چہار شنبہ تمام جماعتوں کے جامع مسجد میں جمع ہونے اپنی کارگزاری سنانے اور کام کے لئے مشورہ کرنے کے لئے تجویز کیا۔ مولانا خود بھی اس اجتماع میں بڑے اہتمام سے شریک ہوتے اور دوسرے علماء و صلحا کو بھی شریک کرنے کی کوشش کرتے۔ شب جمعہ کو نظام الدین نے آنے کی عمومی دعوت دیتے۔ جو لوگ چند بار وہاں رات گزارتے ان کو اکثر اس کام سے روحانی مناسبت پیدا ہو جاتی۔ اکثر رات کا کھانا سب لوگ اکٹھا کھاتے۔ عشاء کی نماز سے پہلے اور اس کے بعد مولانا اپنے موضوع پر گفتگو فرماتے رہتے اور تحریص و ترغیب کا سلسلہ جاری رہتا۔ کبھی نہایت جوش و تاثر کے ساتھ تقریر فرماتے، کبھی اتنی محویت اور استغراق طاری ہو جاتا کہ وقت گزرنے کا احساس باقی نہ رہتا اور عشاء کی نماز بہت موخر ہو جاتی۔ ایک مرتبہ نومبر کی تاریخوں میں عشاء کی نماز میں گھڑی نے بارہ بجائے۔ صبح کی نماز کے بعد اکثر مولانا مجمع سے خطاب فرماتے، کبھی حاضرین میں سے کسی دوسرے عالم یا مقرر کو جس کی ترجمانی پر اعتماد ہوتا کچھ کہنے کے لئے حکم ہوتا۔ صبح کی نماز میں کچھ ایسے اصحاب بھی تشریف لاتے جو رات کو نہیں تھے۔ اکثر نئی دہلی کے بعض معززین اور نو تعلیم یافتہ اور جامعہ ملیہ کے بعض اساتذہ خصوصاً ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب صبح کی نماز میں شرکت کرتے اور تقریر کے بعد واپس

ہوتے۔ اس رات کے اجتماع میں حاضرین کی تعداد روز افزوں تھی اور اس سے کارکنوں میں روح و تازگی اور نو واردوں میں کام سے انس و لگاؤ پیدا ہوتا جاتا تھا۔

دہلی کے سوداگروں میں دین کی رو:

دہلی کے سوداگر مولانا سے تعلق رکھتے تھے۔ معمر اور سن رسیدہ لوگ تو مولانا کے والد صاحبؒ اور بھائی صاحب مرحوم کے زمانہ سے آمد و رفت اور عقیدت و محبت رکھتے تھے نوجوانوں نے اپنے بزرگوں سے یہ عقیدت و محبت میراث میں پائی اور بہت سے نوجوان سوداگروں نے از خود تعلق پیدا کیا۔ میواتیوں کے علاوہ دوسرا طبقہ جس کے دل میں مولانا کا سچا وقار اور ان کی بات کا احترام تھا اور جس کو سب سے زیادہ خدمت و اطاعت کی توفیق ملی وہ دہلی کے یہ تاجر تھے جو مولانا کی خدمت میں مختلف اوقات میں اور خصوصیت کے ساتھ شب جمعہ کو حاضر ہوتے۔ اکثر رات وہیں گزارتے۔ میوات کے اہم جلسوں میں پوری پوری لاریاں کر کے اور کھانے کا سامان (کبھی کبھی دہلی سے تیار کر کے) اپنے ساتھ لے کر جاتے اور میواتی جماعتوں کے ساتھ قریب کے مقامات پر گشت کو جاتے۔

مولانا دہلی میں ان کی تقریبوں میں بڑی محبت و عنایت سے تشریف لے جاتے لیکن اپنا پیغام اور اپنی بات نہ بھولتے، ان کے چھوٹوں پر اولاد کی سی شفقت فرماتے۔ ان کی خوشی سے خوش ہوتے، ان کی فکر سے ملول ہوتے۔ لیکن ان کی تربیت و اصلاح سے غافل نہ ہوتے اور ان کو دین کے اصلی کام میں لگانے کی ہر وقت فکر رکھتے، بڑوں خصوصاً اپنے والد اور بھائی صاحب کے ملنے والوں سے بڑے احترام سے ملتے، لیکن ان کے تعلقات کی قوت کی بنا پر ان کی طرف سے تبلیغ میں اگر کوتاہی ہوتی تو کبھی کبھی عتاب فرماتے اور وہ اس کو اپنی عقیدت اور محبت میں برداشت کرتے اور ان کے تعلق میں فرق نہ آتا۔

تبلیغ میں حصہ لینے سے، علماء اور دینداروں کے سفروں میں رہنے سے اور سب سے بڑھ کر مولانا کے یہاں کی آمد و رفت اور تعلق و محبت کے اثر سے ان سوداگروں میں دینداری بہت زیادہ ترقی کرنے لگی اور ان کی زندگی و معاشرت اور معاملات و اخلاق میں محسوس تغیر ظاہر ہونے لگا۔ مولانا جزوی اور تفصیلی باتوں کو بہت کم چھیڑ کرتے، لیکن دین سے عمومی تعلق پیدا ہو جانے کی وجہ سے دین اور شعائر دین کی عظمت اور شریعت کا احترام ان کی نگاہوں میں پیدا ہو گیا اور دینی ماحول

اور اہل دین سے زیادہ وانس وقرب پیدا ہونے لگا اور ان تتقوا اللہ یجعل لکم فرقانا کے مصداق وہ اپنے ہم جنسوں اور ہم چشموں سے ایسے ممتاز ہو گئے کہ پہچانے جانے لگے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو مولانا سے تعلق رکھتے ہیں اور تبلیغ میں حصہ لیتے ہیں۔

حتی کہ بعض وہ تجار جو داڑھی رکھنے والے آدمی کو اپنی دکان پر ملازم رکھنا پسند نہیں کرتے تھے، انہوں نے خود داڑھیاں رکھیں۔ جو نمازی آدمی کے ملازم ہونے سے اپنی دکان کا حرج سمجھتے تھے، وہی عین کاروباری مشغولیت کے وقت دکان چھوڑ کر جماعت اور تبلیغی گشت میں شرکت کرنے لگے، بے سواری چلنے اور اپنا سامان اٹھا کر بازاروں میں پھرنے میں ذلت، فرش زمین پر سونے میں تکلف، ساتھیوں کا بدن دابنے، کھانے پکانے اور غریبوں کے محلے میں دروازے دروازے پھرنے میں ان کو عار نہ رہا۔ غرض ماحول کے بدل جانے اور ذہنیت کے تبدیل ہو جانے سے کتنوں ہی کی زندگیاں بدل گئیں۔

اہل ثروت کا رجوع اور مولانا کا اصول:

دہلی اور باہر کے تجار اور اہل خیر نے اس کام کی شہرت سن کر اور اس کے گراں قدر مصارف دیکھ کر بارہا مولانا کی خدمت میں مالی اعانت کی پیش کش اور بڑی بڑی رقمیں پیش کرنی چاہیں لیکن مولانا کا اس بارے میں ایک خاص اصول تھا، وہ مال کو جان کا فدیہ، وقت کا بدل اور آدمی کا قائم مقام کبھی نہیں سمجھتے تھے، آپ کے نزدیک روپیہ آدمی کے ہاتھ کا میل تھا اور آدمی قیمتی چیز کا بدل نہیں ہو سکتا، چنانچہ مالی امداد پیش کرنے والوں سے ہمیشہ فرماتے تھے کہ ہمیں تمہارا روپیہ نہیں چاہیے، تمہاری ضرورت ہے۔ انہی لوگوں کی مالی امداد قبول فرماتے جن کی کام میں عملی شرکت اور رفاقت ہوتی۔ آپ کے نزدیک انفاق (راہ خدا میں خرچ کرنے) کی صحیح شکل یہی تھی اور صدر اسلام میں یہی شکل رائج تھی کہ جو لوگ اللہ کے دین کے کاموں میں روپیہ خرچ کرتے تھے اور جن کے نام راہ خدا میں مال لٹانے والوں کی فہرست میں ہم خاص طور پر دیکھتے ہیں، یہ وہی لوگ تھے جو اسلام کی نصرت میں عملاً شریک تھے، بلکہ صف اول میں تھے۔

بہر حال احیاء دین کی اس جد وجہد میں جو لوگ عملی حصہ لیتے تھے اور مولانا کو ان کے اخلاص، تعلق اور محبت پر پورا اطمینان تھا ان کی اعانت کو بے تکلف قبول فرماتے اور دین کی خدمت کی سعادت میں ان کو خوشی سے شریک کرتے۔ حاجی نسیم صاحب بٹن والے (صدر بازار) اور محمد شفیع

صاحب قریشی کے حصہ میں خاص طور پر یہ دولت عظمیٰ آئی۔ مولانا کو ان سے کوئی تکلف اور اجنبیت باقی نہیں رہی تھی۔ دین کے کاموں اور ضرورتوں میں ان کے مال اور سامان کو بے تکلف استعمال کرتے۔ ان کے علاوہ چند اور مخلصین کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ تھا۔

میوات کے جلسے:

اکثر مہینہ میں ایک مرتبہ میوات کے کسی مقام پر اور سال میں ایک مرتبہ نوح کے مدرسہ کا جلسہ ہوتا تھا۔ دہلی کی تبلیغی جماعتیں اور نظام الدین کے مقیم حضرات، نیز مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور، دارالعلوم ندوۃ العلماء اور مدرسہ فتح پوری دہلی کے بعض علماء اور مدرسین شرکت کرتے۔ مولانا رفقاء، جماعت کے ساتھ تشریف لے جاتے، راستہ بھر اپنی تحریک کی دعوت دیتے جاتے اور اس کے اصول و آداب پر پُرجوش اور پُر از حقائق تقریر فرماتے اور لاری کے مسافر یا ریل کے ہم سفر جن میں بڑی تعداد مبلغین اور ہمراہیوں کی ہوتی مستفید ہوتے، گویا یہ ایک متحرک جلسہ ہوتا تھا جو نظام الدین ہی سے شروع ہو جاتا تھا۔

اہل قصبہ مولانا کی آمد سن کر جوق در جوق اور گروہ در گروہ پیشوائی کے لئے نکل آتے اور پروانہ وار مصافحہ کرتے اور بچوں، جوانوں اور بوڑھوں کا مجمع آپ کو گھیر لیتا۔ آپ ہر ایک سے بڑی محبت کے ساتھ مصافحہ کرتے، کسی سے معانقہ کرتے، کسی کے سر پر ہاتھ رکھتے اور انہی کے حلقہ میں گفتگو شروع فرما دیتے۔

مولانا ان جلسوں کے ایام میں غریب میواتیوں ہی کے بیچ میں رہتے۔ رات کو اکثر مسجد ہی کے حجرے میں یا صحن کے سامنے آرام فرماتے۔ سارا دن اور رات کا بڑا حصہ انہی سے گفتگو میں گزرتا۔ میوات میں قدم رکھتے ہی مولانا کا جوش و نشاط اور طبیعت کی تازگی اور شگفتگی بہت بڑھ جاتی۔ علوم و معارف ابر نیساں کی طرح برستے اور دین کے اصول و حقائق چشمے کی طرح ابلتے۔ میواتی سمجھتے یا نہ سمجھتے لیکن متأثر ہوتے۔ وہاں مولانا بہت کم خاموش ہوتے اور بہت کم آرام کرتے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ میوات سے آکر بہت تھک جاتے اور اکثر تو ان کو بے خوابی اور بھی بخار کی حالت میں واپس آتے۔

ان اجتماعات کے موقع پر ایک دینی اور روحانی ماحول ہوتا اور فضا میں ایک روحانیت و نورانیت محسوس ہوتی کہ قلب پر اثر پڑتا اور قاسی القلب بھی رقت و تاثر محسوس کرتا۔ ذکر کے نعرے اور رات کی

ذکر سے مسجدیں معمور ہوتیں۔ مسجد میں جانے میں اگر ذرا سی دیر ہو جاتی تو مسجد میں جگہ پانی محال تھی۔ سڑکوں اور راستوں پر بھی نماز کی صفیں ہوتیں۔ پچھلے پہر کا سماں خاص طور پر دیکھنے کے قابل ہوتا۔ سردیوں کے ایام میں جفاکش اور دین کے حریص میواتی صحن مسجد میں زیر آسمان یا درختوں کے نیچے اپنی سوتی چادریں اور کمبل اوڑھے پڑے رہتے، جاڑوں کی بارش میں برستے پانی اور رستے شامیانے ٹپکتے ہوئے درختوں کے نیچے گھنٹوں صبر و سکون کے ساتھ علماء کا وعظ سنتے رہتے اور اپنی جگہ سے حرکت نہ کرتے۔

ان جلسوں میں تقریریں اور مواعظ بالکل ضمنی تھے۔ اصل مقصود اور اصل کوشش نئی جماعت بنانے اور ان کو باہر نکالنے کی ہوا کرتی تھی اور یہی جلسہ کی کامیابی کا معیار تھا کہ کتنی جماعتیں اپنے علاقہ سے باہر جانے اور یوپی کے گشت کے لئے آمادہ ہوئیں، اور کتنے آدمیوں نے کتنا وقت دیا۔ مولانا اسی کا مطالبہ اور تقاضا کرتے رہتے اور سارے جلسہ پر اسی حیثیت سے خود نگرانی کرتے اور خبر لیتے رہتے تھے کہ اس کا اہل جلسہ سے کتنا تقاضا کیا جا رہا ہے، تجربہ کار میواتی اور نظام الدین کے مبلغین عام اجتماع کے علاوہ برادریوں کے چودھریوں میانجی صاحبان، علماء، اور اہل اثر کو علیحدہ جمع کر کے اپنی اپنی برادری اور اپنے اپنے حلقہ اثر میں اس کی کوشش کراتے تھے اور ان کے ذریعے نئی جماعتیں بناتے تھے۔

مولانا کو جب تک اس کام کی طرف سے اطمینان نہ ہوتا ان کو کھانا پینا اور سونا دوبھر ہو جاتا اور اس کا اطمینان کئے بغیر اس قصبے سے جانا اور نظام الدین واپس ہونا مشکل ہوتا۔ اس کا اطمینان ہو جانے اور اس کی صورت بن جانے کے بعد واپسی کا قصد فرما دیتے اور پھر کسی کا اصرار کسی مخلص کی ضیافت یا آرام کا خیال سفر سے مانع نہ آ سکتا تھا۔

دہلی اور نظام الدین کے مبلغین اکثر جلسے سے کچھ پہلے جا کر زمین ہموار کرتے اور تبلیغی گشت کر کے جلسے اور علماء کے مواعظ سے فائدہ اٹھانے کی استعداد اور طلب پیدا کرتے اور اکثر جلسہ کے ختم ہو جانے کے بعد جلسہ میں نئے آمادہ ہونے والوں کی آمادگی اور تاثر سے فائدہ اٹھانے اور اس کو ٹھکانے لگانے کے لئے کچھ بعد تک قیام کرتے۔

مولانا کے قیام کے دوران میں میواتی بکثرت بیعت میں داخل ہوتے لیکن مولانا بیعت لیتے وقت ان کے سامنے اپنی تقریر فرماتے، اپنے کام کا ان سے عہد لیتے اور اسی کی ان کو تعلیم کرتے،

پر سچے بیعت کرنے والے گویا تبلیغی اور دینی فوج کے لئے رنگروٹ تھے۔

اہل قصبہ مہمانوں کی (جو اکثر بڑی تعداد میں ہوتے)[1] دل کھول کر ضیافت کرتے اور بڑی بلند حوصلگی اور ہمت سے ان کو اور آنے والے میواتی مہمانوں کو جو سیکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں ہوتے، کئی کئی وقت مہمان رکھتے اور پھر بھی حسرت کرتے۔ سنا گیا کہ دل کی حسرت نہ نکلی۔ میواتیوں نے اپنی اس مہمان نوازی اور عالی حوصلگی سے قدیم عربوں کی روایات کو زندہ کر دیا۔

عام اہل اسلام کی عزت و توقیر اور اہل علم و دین کے احترام و تعظیم کی ایسی عادت ڈالی گئی تھی اور اس کی ایسی تربیت کی گئی تھی کہ ہر میواتی ہر آنے والے شخص سے ایسا ملتا ہے جیسے کسی بزرگ و شیخ سے۔ باہر کے ہر شخص کو اپنا محسن سمجھتا، گویا اسی کے ذریعہ ان کو دولت اور دین کی یہ نعمت حاصل ہوئی ہے۔ ان دیہاتی میواتیوں کے دینی جوش، خلوص و محبت، تواضع، عبادت و ذکر کی حرص، رقت و سوز اور دینی مناظر کو دیکھ کر شہریوں کو اپنی حالت پر سخت تاسف اور اپنی زندگی پر نفرت ہوتی اور اپنے اوپر نفاق کا شبہ ہونے لگتا۔

ایک مرتبہ مولانا نے ایک صاحب سے جو ایک جلسہ سے واپس آئے تھے فرمایا کہ کچھ اپنی حالت پر افسوس بھی ہوا؟ انہوں نے عرض کیا کہ جو کچھ دیکھا اس کے بعد تو اپنے کو مسلمان کہتے ہوئے شرم آنے لگی ہے۔

نوح کا بڑا جلسہ:

8،9،10 ذیقعدہ 1360ھ مطابق 28،29،30 نومبر 1941ء کو نوح (ضلع گوڑگاؤں) میں ایک عظیم الشان جلسہ ہوا۔ میوات کی سرزمین نے انسانوں کا اتنا بڑا اجتماع کبھی نہیں دیکھا تھا۔ شرکاء جلسہ کی تعداد کا تحقیقی اندازہ 25... 20 ہزار کیا جاتا ہے، ان شرکاء میں بڑی تعداد ان لوگوں

---

1 (نوح میں حاجی عبدالغفور صاحب مرحوم ہمیشہ مولانا اور ان کے کثیر التعداد رفقاء کے میزبان ہوتے تھے اور بڑی عالی حوصلگی سے ضیافت ہوتی تھی۔ بعض اوقات کئی روز تک بڑے اہتمام سے کھانا کھلاتے تھے۔ انہوں نے اپنی یہ ضیافت کبھی نہیں چھوڑی، مہمانوں کی تعداد کتنی بھی زیادہ ہو۔ حاجی صاحب حضرت حاجی امداد اللہ صاحب سے بیعت تھے۔ (از جناب ...)

کی بھی تھی جو 30،30 ..... 40،40 کوس سے پیدل چل کر اپنا سامان کندھے پر لاد کر اپنا کھانا باندھ کر آئے تھے۔ خصوصی مہمانوں کی تعداد بھی جو بیرون میوات سے تشریف لائے تھے اور دونوں وقت مدرسہ معین الاسلام میں پر تکلف کھانا کھاتے تھے، ایک ہزار کے قریب تھی۔

جلسے کے وسیع شامیانے کے نیچے مولانا حسین احمد صاحب مدنی نے جمعہ کی نماز پڑھائی جامع مسجد اور قصبے کی تقریباً سب مسجدوں میں نماز ہوئی، پھر بھی ہجوم اتنا تھا کہ چھتوں اور بالا خانوں پر آدمی ہی آدمی تھے، سڑکوں پر نمازیوں کی صفیں تھیں اور آمد و رفت بند ہو گئی تھی۔

نماز کے بعد جلسہ شروع ہوا۔ صبح سے شام تک اجلاس ہوتے تھے، لیکن نہ کوئی صدر جلسہ تھا نہ مجلس استقبالیہ اور صدر استقبالیہ نہ رضا کار، لیکن تمام انتظامات خوش اسلوبی سے ہو رہے تھے۔ کام کرنے والوں میں ایسی مستعدی اور فرض شناسی تھی جو وردی پوش رضاکاروں کی منظم جماعت میں نہیں دیکھی گئی۔ اس اجتماع میں دہلی کے عوام و خواص اور ہر طبقے کے حضرات بکثرت شریک تھے۔ خان بہادر حاجی رشید صاحب، حاجی وجیہ الدین صاحب، جناب محمد شفیع صاحب قریشی وغیرہ حضرات اپنی کاروں میں تشریف لے گئے جن سے مہمانوں اور علماء کی آمد و رفت میں بڑی سہولت رہی۔

مفتی کفایت اللہ صاحب نے اس جلسہ کے متعلق اپنے تاثر کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: کہ میں 35 سال سے ہر قسم کے مذہبی اور سیاسی جلسوں میں شریک ہو رہا ہوں، لیکن میں نے اس شان کا ایسا بابرکت اجتماع آج تک نہیں دیکھا۔

یہ اجتماع اور انسانوں کا یہ جنگل ایک جلسہ سے زیادہ ایک زندہ خانقاہ تھی۔ دن کے سپاہی رات کے راہب بن جاتے تھے اور رات کے عبادت گزار دن کے خدمت گزار نظر آتے تھے۔ ان دونوں چیزوں کا جمع کرنا اور اس دعوت کے مقاصد میں سے تھا۔

اس جلسہ کے باضابطہ اجتماعات کے علاوہ خود مولانا اٹھتے بیٹھتے اور ہر نماز کے بعد اپنی بات کہتے تھے۔ ہر نماز کے بعد کی خود فراموشانہ دعا بھی ایک پر جوش اور اثر آفریں تقریر سے کم نہ تھی۔

تبلیغی جماعتیں باہر کو:

میواتیوں اور دہلی کے تجار اور مدارس کے طلبہ کی یہ جماعتیں اطراف اور یوپی و پنجاب کی طرف جانے لگیں۔ خورجہ، علی گڑھ، آگرہ، بلند شہر، میرٹھ وہاں جماعتیں حاضر ہوئیں اور وہاں کے بعض

لوگ نظام الدین آنے لگے۔

کراچی کو جماعتیں:

حاجی عبدالجبار صاحب و حاجی عبدالستار صاحب (ایس۔ ایم۔ ایجنسی فضل الٰہی کراچی) کی دعوت وخواہش پر (جن کو تھوڑے دن پہلے اس کام سے گہری دلچسپی اور مولانا سے تعلق پیدا ہو گیا تھا) ایک جماعت صفر 62ھ مطابق فروری 43ء کو اور دوسری جماعت اپریل کی ابتداء میں مولوی سید رضا حسن صاحب کی امارت میں کراچی گئی اور سندھ میں کام شروع ہوا۔ کراچی میں مختلف جماعتیں مختلف محلوں میں قائم ہوگئیں۔

مولانا کو سواحل پر کام پھیلانے کی بڑی آرزو تھی اور اس میں یہ آرزو مضمر تھی کہ ان بندرگاہوں سے یہ آرزو سواحل عرب تک پہنچے اور وہاں سے اس ملک میں پھیلے۔ ان بندرگاہوں پر بکثرت عرب اور دوسرے ممالک کے لوگ آباد ہیں، اس لئے آپ ان ساحلی مقامات پر دعوت کے پھیل جانے سے اس کی توقع رکھتے تھے کہ ان ممالک کے لوگ اس کو قبول کر کے اپنے اپنے ملکوں میں لے جائیں گے۔

لکھنؤ کا سفر:

لکھنؤ میں 59ھ (40ء کی ابتداء سے) دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مدرسین اور طلبہ مولانا کے اصول اور آپ کی ہدایت کے مطابق لکھنؤ کے قرب وجوار اور دیہاتوں میں کچھ کام کر رہے تھے اور تعطیلات اور مختلف جلسوں اور تقریبات کے موقع پر مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے تھے۔ مولانا کو بھی اس جماعت سے بڑا تعلق پیدا ہو گیا تھا۔ یہاں کے کام کی روداد کو بڑی دلچسپی سے سنتے اور اس جماعت کے افراد پر خاص شفقت فرماتے۔

رجب 62ھ میں آپ نے لکھنؤ کے سفر کی دعوت قبول فرمائی۔ آپ کے تشریف لانے سے ایک ہفتہ پہلے دہلی کے تجار اور میواتیوں کی 30،40 آدمیوں کی ایک جماعت لکھنؤ آگئی تاکہ مولانا کی تشریف آوری سے پہلے شہر میں کام کرے۔ جماعت کا قیام دارالعلوم ندوۃ العلماء کی عمارت میں ہوا۔

جماعت کا نظام اوقات یہ تھا کہ روزانہ عصر کی نماز کے بعد جماعت دارالعلوم سے نکلتی۔ نماز مغرب کے بعد کسی محلے میں گشت ہوتا۔ عشاء کے بعد اپنے اصول ومقاصد کی تشریح اور دو ایک

تقریروں کے بعد جماعت بنا کر قیام گاہ واپس آ جاتے اور کھانا کھاتے۔ اس میں رات کے 11،12 بج جاتے۔

صبح کی نماز کے بعد ان کی تعلیم کا (جو ان تبلیغی سفروں کا اہم جزو ہے) نظام اوقات شروع ہو جاتا۔ کچھ وقت تجوید وتصحیح مخارج کے لئے تھا، کچھ وقت ضروری فضائل ومسائل کی تعلیم کے لئے، کچھ وقت صحابہ کرامؓ کے حالات اور واقعات جہاد کے سننے کے لئے کچھ اپنے اصول بیان کرنے کی مشق اور دعوت وتبلیغ کا طریقہ سیکھنے کے لئے، پھر کھانا کھانے اور آرام کرنے کا وقت آ جاتا۔ عصر کے بعد بدستور روزانہ کا معمول شروع ہو جاتا۔

18 جولائی کو خود مولانا، جناب حافظ فخر الدین صاحب، مولانا احتشام الحسن صاحب جناب محمد شفیع صاحب قریشی اور حاجی نعیم صاحب کی معیت میں تشریف لے آئے۔ موتی محل کے پاس سے پہلے سبزہ پر آپ نے نوافل پڑھے اور دیر تک بڑے درد اور خشوع وخضوع کے ساتھ دعا کرتے رہے۔ دار العلوم میں سب سے پہلے مسجد میں داخل ہوئے جہاں جماعتیں اپنے اسباق واشغال میں الگ الگ حلقوں میں بٹی ہوئی اپنے اپنے معلم کی ماتحتی میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ انتہائی تعلق اور اشتیاق کے باوجود کوئی شخص اپنا کام چھوڑ کر مولانا سے مصافحہ اور آپ کے استقبال کے لئے نہیں اٹھا۔ مولانا نے سب پر نگاہ شفقت ڈالی اور امیر جماعت حافظ مقبول حسین صاحب سے مصافحہ اور کلام کیا اور اپنی قیام گاہ پر تشریف لے گئے۔

مولانا سید سلیمان صاحب ندوی ایک روز پہلے ہی تشریف لائے تھے اور مولانا کے ساتھ ہی مقیم تھے۔ سید صاحب کو اس سے پہلے چند گھنٹوں کے لئے تھانہ بھون کے اسٹیشن پر اور تھانہ بھون کے کاندھلہ تک ریل میں معیت اور گفتگو کا اتفاق ہو گیا تھا اور آپ نے اگلے روز پھاٹک حبش خاں کے جلسے میں مولانا کی دعوت کی ترجمانی اور اپنے خیالات کا اظہار فرمایا تھا۔ اس موقع پر آٹھ دن شب وروز ساتھ رہا۔

دوسرے روز شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب، مولانا منظور صاحب نعمانی اور مدرسہ مظاہر العلوم کے بعض مدرسین حضرات اور مولانا عبد الحق صاحب مدنی تشریف لائے۔

لکھنؤ کے قیام میں تین روز چودھری نعیم اللہ صاحب کی کوٹھی پر اور دو روز شیخ اقبال علی صاحب کی قیام گاہ بھوپال ہاؤس میں عصر کے بعد نشست رہی اور حاضرین کے سامنے اس دعوت کا تعارف

اور اس کے مقاصد و اصول کی تشریح کی گئی۔
ان مجلسوں کے علاوہ صبح سے ظہر تک مہمان خانہ میں آنے والوں کے سامنے اس دعوت کے اصول و مقاصد اور دین کے حقائق کو بے تکلف بیان فرماتے رہتے تھے اور مشکل سے کوئی جلسہ اور کوئی نشست اس تذکرہ سے اور بلند علوم و معارف سے خالی رہتی۔ ظہر کے بعد دار العلوم کی مسجد میں اجتماع رہتا اور سلسلہ کلام عصر تک جاری رہتا۔
لکھنؤ کے قیام میں مولانا عبد الشکور صاحب کے یہاں بھی جانا ہوا، مولانا قطب میاں صاحب فرنگی محل ملاقات کے لئے تشریف لائے اور آپ بازدید کے لئے فرنگی محل تشریف لے گئے تھوڑی دیر کے لئے ادارہ تعلیمات اسلام کو بھی مشرف فرمایا۔
آخری روز جمعہ کا دن خاص مصروفیات کا تھا۔ صبح طلباء کی جمعیۃ الاصلاح میں ایک مختصر تقریب میں شرکت کے بعد امیر الدولہ اسلامیہ کالج تشریف لے گئے جہاں ایک بڑا اجتماع آپ کے انتظار میں تھا۔ وہاں پہلے مولانا سید سلیمان صاحب نے ایک پر اثر تقریر کی آپ کے بعد مولانا نے ارشاد فرمایا۔ وہاں سے فراغت پا کر ماموں بھانجے کی قبر والی مسجد میں نماز پڑھی۔ نماز کے بعد مقررین نے لوگوں کو دہلی کی تبلیغی جماعت کے ساتھ کانپور جانے کی ترغیب دی۔ مولانا مسجد کے اندر دالان میں تشریف رکھتے تھے، سفر کے لئے کوئی تیار نہیں ہوا، مولانا جلسے کی اس سرد اور افسردہ فضا کو دیکھ کر بیتاب ہو گئے اور دین کی اس دعوت پر جو مولانا کے نزدیک دین سے تعلق پیدا کرنے اور اس مشغولیت اور بعد کے زمانہ میں دین سیکھنے اور سکھانے کا واحد ذریعہ تھا لوگوں کے اس جمود پر بے چین اور بے قرار ہو گئے۔ خود دروازہ جا کر بند کر دیا اور اس پر پہرہ بٹھا دیا اور مسجد کے بیچ کے در میں کھڑے ہو کر لوگوں کو آمادہ کرنا شروع کیا۔ بعض لوگوں کو کھڑا کر کے پوچھا کہ تمہارا کیا عذر ہے، جب دنیا کے لئے تمام سفر کرتے رہتے ہو تو دین کے لئے کیوں نہیں کرتے۔
آپ اس وقت سراپا جوش و اثر تھے۔ سارا جسم، پوری روح اور سارے قویٰ اس کام کی طرف متوجہ تھے۔ حاجی ولی محمد صاحب کئی روز سے صاحب فراش تھے، بواسیر کی شکایت نے نقاہت پیدا کر دی تھی، آپ نے ان کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا: "تم کیوں نہیں جاتے؟" انہوں نے کہا میں تو مر رہا ہوں! فرمایا مرنا ہی ہے تو کانپور جا کر مرو۔ وہ سفر پر آمادہ ہو گئے، اور اللہ تعالیٰ نے ان کا سفر بخیر و عافیت پورا کر دیا۔ ان کے علاوہ آٹھ دس آدمی اور تیار ہو گئے جن میں اکثر بہت کام کے

تو بہت ہوئے اور ان کا سفر بہت مبارک رہا۔

رات کی گاڑی سے آپ شیخ الحدیث صاحب اور جناب حافظ فخر الدین صاحب اور بعض دوسرے رفقاء کی معیت میں رائے بریلی تشریف لے گئے۔ تین چار بجے رات کو قیام گاہ پر پہنچے[1]۔

باوجود رات کو جاگنے اور تھک کر چور چور ہونے کے آپ اپنے کام میں مشغول رہے۔ خاندان کے افراد کے سامنے بڑے حکیمانہ اور موثر طریقے پر اپنی دعوت پیش کی اور دین کی سادات سے مناسبت اور سادات کی دین سے مناسبت پر ایک نہایت لطیف اور پُرسوز دل گفتگو کی اور دین کے کام کو لے کر اٹھنے، اس کو اپنا مشغلۂ زندگی بنانے پر ابھارا اور فرمایا کہ دین کا کام اگر سادات نہیں کریں گے تو اس کو وہ ترقی نہیں ہوگی جو ان کے کرنے سے ہوتی اور سادات دین کو چھوڑ کر کوئی دوسرا کام کریں گے تو ان کو وہ حقیقی چین نصیب نہیں ہو سکتا جو اپنا فطری کام کرنے میں ہوتا ہے۔

دوپہر کی گاڑی سے لکھنؤ واپسی ہوئی اور اسٹیشن ہی سے کانپور روانگی ہوگئی، جہاں دو روز قیام فرما کر دہلی تشریف لے آئے۔

---

[1] (تکیہ رائے بریلی کے باہر سئی ندی کے کنارے ایک چھوٹی سی بستی ہے جو حضرت سید علم اللہ نقشبندی (خلیفہ حضرت سید آدم بنوریؒ) کی آباد کی ہوئی اور ان کے نامور فرزند حضرت سید احمد شہیدؒ کا وطن ہے جو سید علم اللہ کی چوتھی پشت میں تھے)

باب ششم

مرض وفات اور زندگی کے آخری حالات

مولانا کی صحت ہمیشہ سے کمزور تھی اور اس پر محنت کی شدت اور مسلسل مشغولیت اور بے آرامی نے اس کو اور بھی کمزور کر دیا تھا۔ آنتوں کی شکایت موروثی اور پیدائشی تھی، سفروں کی کثرت اور ان کی وجہ سے بے احتیاطی اور سونے کھانے کی بے قاعدگی نے نظام جسمانی کو متزلزل کر دیا تھا، نومبر 43ء میں آپ کو پیچش ہوئی، اور ایسی ہوئی کہ پھر نہ اچھی ہوئی۔ اس زمانے میں دہلی سے جو آتا اس سے معلوم ہوتا کہ مولانا کی شکایت بدستور ہے اور ضعف بڑھ رہا ہے، اپنے کام میں مشغولیت و انہماک بدستور تھا اور جوش و فکرمندی زائد۔ 13 جنوری 44ء کو ایک دوست نے دہلی سے لکھا

> "بفضلہ تعالیٰ حضرت کو اب کافی افاقہ ہے مگر ضعف بہت ہے، باوجود ضعف کے بولنا بند نہیں کرتے، فرماتے ہیں کہ تبلیغ کے لئے بول کر مر جانا پسند کرتا ہوں بہ نسبت اس کے کہ اس سے خاموش رہ کر صحت حاصل کروں، فرماتے ہیں کہ میری بیماری کی خاص وجہ یہی ہے کہ علماء توجہ نہیں کر رہے ہیں، علماء آئیں جو نکلنے والے ہیں۔ اگر اس کے لئے ان کو قرض لینا پڑے تو نہ گھبرائیں، اللہ تعالیٰ برکت دے گا، میری بیماری نعمت ہے، اسی کو سن کر لوگ آئیں مگر لوگ نہیں آتے اس کی برکتوں کا خود میں مشاہدہ کر رہا ہوں، ان کلمات کو فرماتے وقت حضرت کی جو حالت تھی کہ میں بیان نہیں کر سکتا، خاص کر آخری جملہ"۔

21 محرم 63ھ (17 جنوری 44ء) کو لکھنؤ کی ایک جماعت دہلی کے لئے روانہ ہوئی، شرکائے جماعت میں مولانا حافظ عمران خاں صاحب مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء اور حکیم قوام حسین صاحب بھی تھے، مولانا کو دیکھا بہت ضعیف ہو رہے تھے، مگر چلتے تھے اور اکثر نماز خود پڑھاتے تھے، گفتگو اور تقریر میں کوئی کمی نہیں تھی، البتہ بیٹھ جاتے تو اٹھنے کے لئے بعض اوقات سہارا دینا پڑتا، مرض کافی ترقی کر چکا تھا اور خطرے کے آثار تھے۔ ان دنوں مولانا محمد یوسف صاحب کشمیری (میر

واعظ صاحب) مقیم تھے، اور مولانا پوری طاقت کے ساتھ علماء کو اس کام کی اہمیت اور عظمت سمجھانے کی طرف متوجہ تھے، اور یہی ان دنوں مولانا کی سب سے بڑی فکر اور موضوعِ سخن تھا۔ مولانا اس وقت اس کی بڑی ضرورت محسوس کر رہے تھے کہ اہلِ فہم اور اہلِ بصیرت ان کے قریب رہیں، صبر و سکون سے ان کی باتیں سنیں اور اس دعوت کے اصول و قواعد کو اخذ کریں، اور اس تحریک کو اپنا لیں، علماء کے نام مولانا کا باربار پیغام تھا کہ یہ تحریک و دعوت آپ ہی کے لائق ہے اور آپ ہی اس کے لائق ہیں، اور آپ ہی کے اس کو لے کر کھڑے ہونے سے اس کو صحیح فروغ ہو گا۔ میری مثال بالکل اس شخص کی سی ہے جس نے کہیں آگ لگی ہوئی دیکھی تو آگ بجھانے کے لئے لوگوں کو پکارنے لگا، اس شخص کا کام لوگوں کو بلانا تھا، آگ بجھانے والے دوسرے ہی ہیں۔

دہلی کے تاجر اور مبلغین کو تاکید فرماتے تھے کہ علماء سے فائدہ اٹھائیں، شہر میں جلسے کریں اور ان کے خیالات سے عوام کو مستفید اور ان کی تائید و تصدیق سے دینی دعوت کو تقویت پہنچائیں۔ چنانچہ ان دنوں جابجا جلسے ہوئے جن میں جناب مفتی کفایت اللہ صاحب، مولانا عبدالحنان صاحب، مولانا عمران خان صاحب اور بعض دوسرے اصحاب نے تقریریں کیں، جناب مفتی کفایت اللہ صاحب نے بڑے کھل کر اور بڑے جوش کے ساتھ تحریک کی تائید کی، مولانا کو اس سے بڑی مسرت ہوئی اور اعتراف و شکر کے کلمے زبان سے نکلے۔

مولانا ان جلسوں کی روداد سننے کے لئے مضطرب و بیتاب رہتے تھے اور جب تک متعدد آدمیوں سے نہیں سن لیتے تھے سوتے نہیں تھے۔ اکثر ہم لوگوں کی واپسی جلسہ سے فراغت پا کر دیر رات کو ہوتی تھی، مولانا برابر بیدار رہتے، آہٹ پاتے ہی طلب فرماتے اور جلسے کی کیفیت اور تفصیلات بڑے شوق و محویت کے ساتھ سنتے، بعض اوقات مقررین سے اپنے خیال کی ترجمانی میں کوتاہی یا تسامح سن کر زبانِ قال سے کچھ نہ فرماتے مگر زبانِ حال سے کہتے۔

ہر کسے از ظن خود شد یار من

وز درون من نجست اسرار من

صبح کی چائے اور رات کے کھانے کے بعد دعا کا معمول فرماتے جو بعض اوقات کئی کئی گھنٹے جاری رہتی جس سے ضعف بڑھ جاتا، ہم لوگ ادب سے چپ رہتے، ایک روز میر واعظ صاحب نے خوب فرمایا کہ شاید اسی موقع کے لئے ہے۔ (حتی قلقا نیہ سکت)

ان ہی دنوں میں صاحب زادہ مولانا محمد یوسف صاحب کی امارت میں گھاٹ میکا کا ایک کامیاب تبلیغی سفر پیش آیا جس میں میوات کے ان جلسوں کی تمام خصوصیات اور مناظر دیکھنے میں آئے جو مولانا کی موجودگی میں دیکھنے میں آتے تھے۔

علماء سے ربط:

مولانا کی دعوت کا ایک اہم مقصد یہ تھا کہ امت کے مختلف حلقوں اور طبقوں میں جو بعد ریگانگی اور غلط فہمیوں کی بناء پر ایک دوسرے سے جو وحشت و تنفر پیدا ہو گیا ہے وہ دور ہو اور ان میں پھر ربط و الفت پیدا ہو اور وہ اسلام کے لئے تعاون اور اشتراک عمل کریں، ایک دوسرے کی تعظیم اور قدر کرنا جانیں، اور ہر ایک کے دوسرے کے محاسن سے فائدہ اٹھانے کی توفیق ہو۔
مولانا اس سلسلہ میں (جیسا کہ آگے آئے گا) کسی ایسے طبقے اور حلقے کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہتے تھے جو دینی حیثیت سے بہت پست اور بعید ہو، اس لئے عوام اور علماء کی بیگانگی اور ایک دوسرے سے دوری اور وحشت کو کسی طرح دیکھ نہیں سکتے تھے اور اس کو امت کی بہت بڑی بدقسمتی اور اسلام کے مستقبل کے لئے بہت بڑا خطرہ اور الحاد و بے دینی کا پیش خیمہ سمجھتے تھے۔ مولانا اس دعوت سے یہ امید رکھتے تھے (اور اس کے آثار ظاہر ہونے لگے) کہ اس میں شریک ہونے سے عوام اور علماء ایک دوسرے سے قریب ہو جائیں گے، ہر ایک دوسرے کو پہچاننے لگے گا اور اس کی طرف اپنی احتیاج محسوس کرے گا۔
خاکسار نے گھاٹ میکا میں مولانا محمد یوسف صاحب کے حکم سے علماء میوات کے سامنے ایک مختصر سی تقریر کی جس میں عرض کیا گیا کہ اگر علماء نے اس دعوت کے ذریعہ عوام سے اپنا رابطہ بڑھایا اور ان میں کام نہ کیا تو قوی اندیشہ ہے کہ علماء بھی ملک میں ایک ایسی اچھوت اقلیت اور ذہنی صفر بن کر رہ جائیں گے جس کی تہذیب و معاشرت سے عوام بالکل بیگانہ ہوں گے۔ زبان و خیالات تک عام طبقے کے لئے نامانوس ہو جائیں گے اور شاید دونوں کے درمیان ترجمان کی ضرورت پیش آئے۔ مولانا نے جب مولوی یوسف صاحب سے اس تقریر کا خلاصہ سنا تو بہت پسند فرمایا۔ یہ دراصل مولانا ہی کی گفتگو اور مجلسوں سے اخذ کیا ہوا مضمون تھا جس کی تصدیق اس دعوت تحریک کے سلسلہ میں بار بار ہوئی۔
مولانا ایک طرف علماء کو عوام سے اس دعوت کے ذریعے قریب ہونے کی اور ان کا درد اپنے دل

میں پیدا کرنے کی تاکید فرماتے تھے، دوسری طرف عوام کو علماء کی مرتبہ شناسی اور قدردانی اور ان سے استفادہ کی طرف توجہ دلاتے رہتے تھے۔ ان کو بتا کر اصول کے مطابق علماء کی خدمت میں حاضر ہونے کی فہمائش کرتے تھے، ان کی ملاقات اور زیارت کا ثواب بیان فرماتے تھے۔ ان کی خدمت میں حاضر ہونے کے آداب و اصول سکھاتے تھے، ان کی دعوت دیتے اور ان سے فائدہ اٹھانے اور ان کو مشغول کرنے کا طریقہ بتاتے تھے، ان کی جو باتیں سمجھ میں نہ آئیں ان کی تاویل اور ان کے ساتھ حسنِ ظن رکھنے کی عادت ڈالتے، ان کو ان کی خدمت میں بھیجتے تھے اور پھر ان سے پوچھتے تھے کہ کس طرح گئے اور کیا باتیں ہوئیں، پھر ان کی تعبیروں اور تاثرات کی اصلاح و تصحیح فرماتے تھے، اس طرح عوام، تبلیغ اور کارکن دینی لوگوں کو علماء سے اتنا قریب کر دیا کہ پچھلے برسوں میں (غالباً تحریکِ خلافت کے بعد) کبھی اتنے قریب نہیں ہوئے۔

بدقسمتی سے شہروں میں سیاسی تحریکات اور مقامی اختلافات کی وجہ سے عوام میں علماء کی طرف سے ایک عام بیزاری پیدا ہونے لگی تھی اور بغیر کسی استثناء اور تخصیص کے عام حامیانِ دین اور علماء کے خلاف ایک عام جذبہ عناد پیدا ہونے لگا تھا۔

مولانا کی ان کوششوں اور حکمتِ عملی سے کم سے کم اس دعوت کے حلقہ اثر میں یہ بات پیدا ہوگئی کہ سیاسی اختلافات کو عوام دین کے لئے گوارا کرنے لگے، اور سیاسی مسلک کے اختلاف کے باوجود علماءِ حق کی تعظیم اور قدر و اعتراف کی گنجائش نکل آئی۔ بڑے بڑے تاجر جو علماء سے متوحش تھے علماء کی خدمت میں مؤدبانہ حاضر ہونے لگے اور اپنے تبلیغی جلسوں اور تقریروں میں ادب و احترام کے ساتھ لے جانے لگے۔ مرضِ وفات کی ابتداء میں مولانا کی اس طرف بڑی توجہ تھی اور اس میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔

مسلمانوں کی مختلف جماعتوں کی طرف توجہ:

خیالات کے تھوڑے تھوڑے اختلاف سے اور عرصے سے ایک دوسرے سے دور رہنے سے اہلِ سنت کی مختلف جماعتوں میں ایک وحشت سی پیدا ہوگئی تھی، ہر جماعت اپنے دین کی حفاظت اسی میں سمجھتی تھی کہ دوسرے کے سائے سے بھاگے، ایک دوسرے کے محاسن کی بالکل خبر نہیں تھی۔ ایک دوسرے سے ملنے ملانے کے راستے عرصے سے بند ہو چکے تھے۔

ان اختلاف کو زائل کرنے کا طریقہ لوگوں نے صرف مناظرہ و مباحثہ، دوسرے کے مسلک کی

تردید اور اپنے مسلک کا اثبات اور دلائل و براہین کو سمجھا لیکن تجربہ سے ثابت ہو گیا کہ اس سے اختلافات دور نہیں ہوتے بلکہ اور بڑھتے ہیں ضد اور عناد پیدا ہوتا ہے اور وحشت میں اور ترقی ہوتی ہے۔

مولانا کی نزدیک اس کا طریقہ یہ تھا کہ اخلاق و اکرام سے ان کے ذہن میں گرہیں کھولی جائیں اور دلوں کی سلوٹیں اور شکنیں دور کی جائیں، تعلق پیدا کیا جائے اور مانوس کیا جائے۔ ایک دوسرے کو قریب سے دیکھنے اور برتنے سے غلط فہمیاں خود بخود رفع ہو جائیں گی۔ ان کے دین کے صحیح اور اصولی کام میں لگ جانے اور اختلاط و صحبت سے اختلافات میں اعتدال پیدا ہو جائے گا اور افراط و تفریط باقی نہ رہے گی۔

اس مرض وفات میں اس کی طرف خاص توجہ ہوئی۔ اس کے لئے آپ خاص اصول و ہدایات تعلیم فرماتے تھے اور اس سلسلہ میں ایسی نازک باتیں ذہن میں آتی تھیں اور اس کے لئے اپنی ذاتی رعایتیں اور وسیع انتظامات اور سلیقے اختیار فرماتے تھے جو شاید اہل سیاست بھی اپنے اہم اور نازک کاموں میں اختیار نہیں کرتے۔

مولانا کی عیادت کے لئے یا مسجد میں ان علماء میں سے جن کی آمد و رفت زیادہ نہیں رہتی تھی، اگر کوئی بزرگ تشریف لے آتے تو مولانا ان کی تواضع و اکرام میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتے۔ ان کی آمد کو اتنا اہم اور ان کی خاطر و دلجوئی کا اتنا لحاظ رکھتے جس سے زیادہ تصور میں نہیں آتا اور ان کو کسی طرح کی بیگانگی و اجنبیت اور حاکمی صحبت کی بو بھی محسوس نہ ہونے دیتے۔

علالت کا اشتداد:

بار بچہ ۱۹۴۴ء میں ضعف بڑھ چکا تھا۔ نماز بھی پڑھانے سے معذور تھے، لیکن جماعت میں دو آدمیوں کے سہارے تشریف لاتے تھے اور کھڑے ہو کر نماز پڑھتے تھے، کئی بار فرمایا کہ میں اس مرض سے جانبر نہیں ہوں گا۔ ظاہر اسباب میں صحت نہیں معلوم ہوتی، یوں اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ اہل مدارس کی شکایت فرماتے کہ فروعی اور تکمیلی کاموں اور شاخوں اور پتیوں میں اس قدر مشغول ہیں کہ اصلی اور بنیادی کام کے لئے وقت نہیں رہا۔ انہی دنوں میں دو نہایت لطیف تقریریں فرمائیں جن میں بند بند لفظوں میں اس کا اظہار تھا کہ وقت اخیر کچھ دور نہیں، اور اس میں بھی اللہ کے بڑے مصالح ہیں۔

علماء کی آمد

سندھ جانے والی جماعتوں کے ذریعہ مولانا حافظ ہاشم جان صاحب مجددی کو اس تحریک سے دلچسپی اور مولانا کی ذات سے غائبانہ تعلق پیدا ہو گیا تھا، مارچ میں وہ دہلی تشریف لے آئے۔ مولانا نے ان کی آمد کا بڑا اہتمام اور اس پر بڑی مسرت کا اظہار فرمایا۔ مولانا اپنے اس کام میں ان لوگوں کی شرکت سے بے حد مسرور ہوتے تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے خاص دل و دماغ اور خاص جوہر عطا فرمایا اور ان کے اضافے سے دین کی بڑی خدمت و ترقی ہوئی۔ حضرت مجدد سے نسبت فرزندی کی وجہ سے مولانا نے مخدوم زادوں کی طرح ان کا اکرام فرمایا۔

مارچ ہی کے مہینے میں پیر صاحب کی آمد کے چند روز بعد راقم سطور کے برادر محترم ڈاکٹر مولوی سید عبدالعلی صاحب کی آمد ہوئی۔ مولانا نے لیٹے لیٹے ان سے معانقہ فرمایا، اور ان کی آمد پر مسرت کا اظہار کیا اور فرمایا کہ میں آپ کے آنے کی خوشی سے پہلے سے اچھا ہوں، اس بیماری میں یہ معمول رہا کہ کام کے سلسلے میں اگر کوئی خوشی کی بات پیش آتی تو مولانا کی صحت بظاہر ترقی کر جاتی اور نشاط پیدا ہو جاتا۔ روح کو توانائی پہنچتی جس سے مرض کے کچھ اثرات دب جاتے۔

مولانا نے ان دونوں صاحبوں سے دہلی کے ان حلقوں میں کام لینا چاہا جہاں کے لوگ ابھی کام سے مانوس نہیں ہوئے تھے اور ان سے زیادہ مانوس تھے۔ مولانا نے ان کی آمد کو محض ذاتی نہیں رہنے دیا بلکہ کام کے لئے مفید بنانے کی کوشش کی۔ مولانا اپنے لوگوں سے برابر تقاضا فرماتے رہتے تھے کہ ان کے حسب حال اور شایان شان اس سے کام لیا جائے، اور ان کی آمد سے وہ خصوصی فائدہ اٹھایا جائے جو دوسروں سے حاصل نہیں ہو سکتا۔

بار بار فرماتے تھے کہ ڈاکٹر صاحب کا وقت ضائع ہو رہا ہے تم ان سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔ بار بار کہنے کے بعد ایک بار ان سے یہ فرمایا کہ کہیں آپ تو یہ نہیں سمجھتے کہ وقت ضائع ہو رہا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ "نہیں!" فرمایا: بس کہیں آپ بھی میرے بار بار کہنے سے یہ نہ سمجھ لیں کہ وقت ضائع ہو رہا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کو پرانے تجربہ کار ساتھیوں سے ملنے اور ان کے پاس وقت گزارنے کی تاکید فرماتے رہتے تھے۔ آپ کا قیام پیچھے دار الاقامہ کے کمرے میں تھا، مگر مولانا کو اس سے خوشی نہ تھی، ایک مرتبہ فرمایا کہ جو مسجد سے باہر ہے وہ بچے کو آیا ہوا نہ سمجھے ڈاکٹر صاحب نے مسجد کی

میں زیادہ وقت گزارنا شروع کر دیا اور اس کا اعتراف کیا کہ مسجد میں میواتیوں اور مبلغین کے ساتھ وقت گزارنے سے ان کو نمایاں فرق معلوم ہوا اور محسوس فائدہ ہوا۔

ایک مرتبہ مولانا کے تقاضے سے مدارس کے علماء اور ارباب اہتمام بھی جمع ہوئے اور ان پر مشورہ کیا کہ ان کے مدارس اس کام میں کیا حصہ لے سکتے ہیں۔ مولانا طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند، مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب، مولانا محمد شفیع صاحب مہتمم مدرسہ مدرسہ عبدالرب دہلی، مولانا عبداللطیف صاحب ناظم مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور، مولانا اعزاز علی صاحب استاد دارالعلوم دیوبند اور شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب نے اس مجلس مشاورت میں شرکت کی۔

مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری بھی نظام الدین تشریف لائے اور نظام الدین کی رونق دوبالا ہو گئی۔

آخر بہت میں یہ محفل انجم منتشر ہوئی، بھائی صاحب رخصت ہونے لگے تو مولانا نے فرمایا۔

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد

سندھ کو تیسری جماعت:

اپریل کی ابتدائی تاریخوں میں 60،70 آدمیوں کی ایک جماعت حافظ مقبول حسن صاحب کی امارت میں سندھ روانہ ہوئی، اس قافلہ کی پہلی منزل لاہور ہوئی جہاں اس نے دو تین روز ٹھہر کر کام کیا۔ اس جماعت کے پہنچنے کے دوسرے روز پیر ہاشم جان صاحب بھی تشریف لے آئے۔ ایک روز پیر صاحب کی معیت میں حضرت نورالمشائخ صاحب (کابل) کی خدمت میں جو ان دنوں لاہور میں مقیم تھے، چند احباب نے حاضری دی اور مولوی سید رضا حسن صاحب نے اس تحریک کا تعارف کرایا۔

پشاور کی جماعت کی آمد:

پشاور میں مولانا کے تذکرے اور تحریک کے تعارف سے متاثر ہو کر دوستوں کی ایک جماعت نے اپریل میں دہلی جانے اور مولانا کی خدمت میں حاضر ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔ مولانا کی خدمت میں لکھا گیا اور اسی خط میں عرض کیا گیا کہ آپ کی زندگی وسعت اسلام کی ملکیت اور مسلمانوں کی

ایک دولت ہے، آپ اس کے مقابلے کے لئے خود بھی اللہ تعالیٰ سے دُعا کریں۔ مولانا کی طرف سے اس کا حسب ذیل جواب گیا:

"اپریل میں جماعت کا آنا مبارک ہو، مگر مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ قبل ازیں کہ وہ جماعت یہاں تشریف لاوے پہلے پہلے اگر جناب کی زیر نگرانی اصول کی پابندی کرتے ہوئے، وہیں پر کچھ دنوں کام کرے اور اس طریق سے مناسبت پیدا کرے تو پھر اپریل میں یہاں آنا بہت زیادہ مفید ہوگا، لہذا وقت مقررہ سے پہلے اس جماعت سے آپ اپنی نگرانی میں وہاں کام کرالیں"۔

"میں اپنی تندرستی کے لئے دُعا گو ہوں مگر بدیں شرط کہ میں اپنے اوقات کو نظام الاوقات سے گزار سکوں، اور میرے اوقات کا کوئی حصہ لایعنی میں صرف نہ ہو جیسا کہ میری موجودہ حالت اب ہے، جو چیز میرے بغیر نہ ہو سکے اس میں دخیل ہوں، ورنہ سب کام کا انصرام جماعت کرے۔ یہ سبق میں نے اپنی بیماری سے حاصل کیا ہے۔(14 مارچ 1944ء)

8 اپریل کو متعدد تبلیغی کششوں اور عملی کام شروع کر دینے کے بعد ایک مختصر جماعت پشاور سے دہلی کو روانہ ہوئی، جس میں ارشد صاحب، مولانا احسان اللہ صاحب ندوی، مستری عبدالقدوس صاحب اور دو بچے تھے۔ 10 اپریل سے 14 اپریل تک ان کا قیام نظام الدین میں رہا۔

نظام الدین کا نظام اوقات اور ماحول:

ارشد صاحب نے اس سفر کے مشاہدات و تاثرات قلمبند کر لئے تھے جو اب ایک تاریخی دستاویز ہے۔ اس کے کچھ اقتباسات جن سے اس وقت کے حالات و ماحول پر روشنی پڑتی ہے یہاں نقل کئے جاتے ہیں:

"ایک بجے ایک بچہ پیغام لایا کہ کھانا تیار ہے۔ مسجد ہی کے ایک کونے میں مولانا کا حجرہ ہے، وہاں کھانا چنا تھا اور چارپائی پر حضرت لحاف اوڑھے تکیوں کے سہارے بیٹھے تھے، ان کے سامنے ان کا پرہیزی کھانا رکھا تھا، چہرہ سے نور صاف عیاں تھا اور جسم تھا کہ بس ہڈیوں کا پنجر، ان کی چارپائی کے پاس زمین پر ان کے معالج حکیم صاحب بیٹھے تھے۔ ہم سب افراد سلام کر کے کھانے پر بیٹھ گئے، کوئی بیس تیس اشخاص ہوں

گئے۔ کھانے کے دوران میں حضرت نے مندرجہ ذیل ارشادات فرمائے۔

1۔ حکیم صاحب! میں آپ کے پرہیز کے مطابق عمل کرنا شرعی فرض سمجھتا ہوں، کیا یہ کم ہے کہ میں نماز میں قیام کے ثواب سے محروم ہوں۔

2۔ بھائیو! خداوند کریم کا اپنے بندوں سے خاص لگاؤ ہوتا ہے، یہاں تک کہ کافروں کے ساتھ بھی یہ لگاؤ موجود ہے۔ یہ لگاؤ ہی تو تھا جس نے حضرت یونس علیہ السلام کے حق میں قرآن حکیم کے یہ کلمات کہلوائے۔

"مکیم کے لفظ حضرت نے زور دیا۔ جب کافروں تک سے اللہ کو اتنا لگاؤ ہے تو مومنین سے کیا کم ہوگا، بھائیو! مومنین کی خدمت عبدیت کا اصل مقام ہے۔ عبدیت کیا ہے؟ مومنین کے لئے ذلیل ہونے کی عزت کو حاصل کرنا، یہی ہماری تحریک کا اولین اصول ہے اور ایک ایسا اصول ہے کہ کوئی اجتہادی (یعنی علماء کرام) تقلیدی (عوام الناس) یا مادی (جو لوگ ہر کام کو دولت یا دنیا کے حصول کے لئے کرتے ہیں) اس کی تردید نہیں کرسکتا۔ اس کے بعد مولانا نے کبرو ریا کی مذمت فرمائی اور مجلس برخاست ہوئی۔ ظہر کے وقت حضرت دو آدمیوں اور ایک لکڑی کے سہارے باہر نکلے، حضرت حجرہ کے سہارے بیٹھ گئے اور فرمایا:

1۔ بھائیو! ہم رسول کریم ﷺ کے راستے سے صرف بھٹکے ہی نہیں بلکہ بہت زیادہ بھٹک گئے ہیں۔ کبھی حکومت یا اور کسی قسم کا سیاسی اقتدار مسلمانوں کا مقصد نہیں ہوسکتا۔ رسول کریم ﷺ کے راستے پر چلتے ہوئے اگر حکومت مل جائے تو اس سے ہمیں بچنا نہیں لیکن یہ ہمارا مقصد ہرگز نہیں۔ بس اس راہ میں ہمیں سب کچھ بلکہ جان تک بھی لٹا دینا چاہیے۔

2۔ دوسری بات یہ یاد رکھو کہ مسلمانوں کی برائیوں کا انسداد ان کی برائیاں بیان کرنے سے نہیں ہوسکتا، بلکہ چاہیے کہ ان میں جو ایک آدھ بھی اچھائی موجود ہو اس کی تشہیر کی جائے، برائیاں خود بخود دور ہو جائیں گی۔

اس کے بعد نماز کھڑی ہوگئی اور حضرت کو دو آدمیوں نے پکڑ کر کھڑا کیا۔ حیرت ہے کہ جو شخص

بغیر دو آدمیوں کی امداد کے اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتا وہی شخص نماز کی چار رکعتوں میں قیام، رکوع، سجدہ، جلسہ سب خود پر کمال اطمینان اور خوشی سے کر رہا ہے۔

نماز کے بعد حضرت نے ہمیں مخاطب کر کے کہا۔ دیکھو تم لوگ مستد لشتی کے لئے نہیں آئے۔ اپنا وقت بیکار نہ ہونے دو۔ ہمیشہ ذکر و تعلیم میں مصروف رہو۔ تم لوگ بہت ہی کم وقت کے لئے آئے ہو۔ یہ وقت تو کچھ نہیں، پھر تمہاری جماعت سے کہا، بھائی دوسری دفعہ ایک کثیر جماعت لے کر آنا اور کافی عرصہ قیام کرنا یہاں زیادہ سے زیادہ عرصہ قیام کی ضرورت ہے۔

دو آدمیوں کے سہارے نماز کے بعد مولانا حجرہ میں واپس تشریف لے گئے۔ حاضرین کو دو گروہوں میں منقسم کیا گیا۔ ایک عربی داں طبقہ اور ایک غیر عربی داں۔ غیر عربی داں طبقہ کو تحریک کے متعلق اردو کتابوں کی تعلیم ہوتی رہی اور عربی داں طبقہ کو کتاب الایمان سے چند حدیثیں پڑھ کر سنائی گئیں اور ان پر باہم مذاکرہ رہا۔ معلوم ہوا کہ یہاں کے مقیم حضرات کو اس نصاب کی تکمیل ضروری ہے۔ رات کو پشاور کی جماعت نے دوسری جماعت کے ساتھ پہاڑ گنج میں تبلیغ کی اور وہیں رات گزاری۔

دوپہر سے پہلے حدیث کا دورہ رہا اور خوب رہا۔ چائے کے وقت حضرت کی طبیعت اچھی معلوم ہوتی تھی، مجھ سے فرمانے لگے کہ بھائی کثیر جماعت دیکھو، دنیا کا معمولی کام بغیر سیکھے نہیں آتا حتیٰ کہ چوری کے لئے بھی استاد کی ضرورت ہے۔ اگر بے سیکھے چوری کرو گے تو پکڑے جاؤ گے تو پھر تبلیغ جیسا اہم کام بغیر سیکھے کیوں کر آ سکتا ہے؟ پھر نہایت ملاطفت سے فرمانے لگے کیوں بھائی جماعت لاؤ گے؟ میں نے عرض کیا حضرت اگر پہلے یہاں سے ایک جماعت پشاور آجائے تو انشاءاللہ پھر پشاور کے لوگ اس کام کی طرف بآسانی متوجہ ہو سکتے ہیں۔

فرمانے لگے بھائی دیکھو کہ ایک کام کرو۔ تم .... کو خود بھی لکھواور وہاں کے بااثر لوگوں سے لکھواؤ کہ وہ جماعت لے کر پشاور آئیں، ایک تو آپ کے شہر میں جماعت آجانے کی، دوسرے یہ لوگ خود بھی اب تک مستد لشتی کر رہے ہیں، عمل کے لئے تیار ہو جائیں گے۔

آج ظہر کی نماز کے بعد حضرت تبلیغی جماعتوں کی تشکیل اور ان کی روانگی کے متعلق ہدایات فرماتے رہے

ظہر کے بعد حدیث کا دور رہا اور خوب رہا۔ مولانا واصف نے کتاب الجہاد سے عجیب و غریب حدیثیں سنائیں۔

سیلاب اور عرس کے سلسلے میں لوگ کثرت سے آئے ہوئے ہیں، ان میں تبلیغ ہوتی رہی۔ شام کو 5 بجے تبلیغی جماعت حسب معمول روانہ ہوئی۔

13 اپریل 1944ء آج چائے کے وقت حضرت نے فرمایا جس طرح پہلے پیغمبر شریعت لائے تھے اسی طرح ہمارے سرکار ﷺ بھی شریعت لائے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی انجیل نے تورات کو منسوخ نہیں کیا تھا، اس کے احکام میں ترمیمات کی گئی تھیں، لیکن رسول کریم ﷺ کے قرآن نے پہلی سب کتابوں کو منسوخ کر دیا۔ اب ان کا براہ راست اتباع حرام ہے۔

جس چیز میں ہمارے حضور ﷺ دیگر انبیاء سے ممتاز تھے وہ طریقہ تبلیغ تھی۔ پہلے انبیاء کے بعد سلسلہ نبوت جاری تھا، اس لئے انہیں اس اہتمام کی ضرورت پیش نہ آئی، جس اہتمام کو حضور ﷺ نے ملحوظ رکھا، کیونکہ ان کے بعد سلسلہ نبوت ختم تھا اور تبلیغ کا تمام بوجھ ان کی امت کے افراد پر پڑتا تھا۔

آپ جماعتیں بنا بنا کر احکام دین سکھانے کے لئے بھیجتے تھے، اور ضرورت ہے کہ اس طریقہ تبلیغ کا پھر احیاء ہو۔

پھر حضرت نے لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق کے مسئلہ پر روشنی ڈالی اور فرمایا کہ دنیاوی معاملات حتی کہ پیر، مرشد، والدین و استاد تک کے تعلقات میں اسے ہمیشہ نظر رکھنا چاہیے۔

مولوی احسان اللہ صاحب سے مخاطب ہو کر فرمانے لگے "دیکھو مولوی جی! یہ کام قرن اول کا ہے"۔ اس کے لئے اپنی جانیں قربان کر دو، اور اپنا سب کچھ مٹا دو۔ اس کے لئے جتنا زیادہ قربان کرو گے اتنا زیادہ پاؤ گے۔

یہ سب کچھ جو تم سن رہے ہو اور لطف اٹھا رہے ہو، یہ یوں ہے جیسے کوئی دوسرے کے باغوں کے میووں کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ اصل خوشی تو یہ ہے کہ اپنے باغ کا پھل پیدا کرو اور یہ چیز بغیر محنت اور قربانی کے کیونکر آ سکتی ہے۔

عصر کے وقت بہت زور کی بارش ہونے لگی۔ آج تبلیغ کا ارادہ ملتوی تھا۔ عصر کے وقت جب حضرت باہر نکلے تو ناراضگی کا اظہار فرمایا کہ آج جماعت کیوں گشت کے لئے نہیں گئی۔ آپ نے

میواتیوں کی قربانی اور ایمان کا تذکرہ فرمایا اور کہا کہ یہ لوگ تمہارے محسن ہیں۔ ان لوگوں نے تمہیں صحیح راستہ بتایا، پھر ایک غریب میواتی کو بلا کر اپنے پاس بیٹھایا اور کہا کہ جب پہلے پہل میں نے اس سے کہا کہ جاؤ تبلیغ کرو تو یہ مجھ سے کہنے لگا کہ تبلید کیا ہوتی ہے؟ میں نے کہا تم لوگوں کو کلمہ سکھاؤ۔ اس نے کہا کہ کلمہ تو حضرت مجھے خود نہیں آتا۔ میں نے کہا جاؤ تم لوگوں سے یہی کہو کہ دیکھو میری یہ عمر ہوگئی ہے اور نہ سیکھنے کی وجہ سے مجھے اب تک کلمہ نہیں آتا۔ بھائیو، تم کسی کے پاس جا کر کلمہ ضرور سیکھو۔

مولانا کی تقریر کے اثر سے سخت بارش میں نماز عصر کے بعد جماعت روانہ ہوئی۔ اللہ کی شان دیکھئے کہ روانہ ہوتے ہی بارش تھم گئی اور موسم نہایت خوشگوار ہو گیا۔ آدھ میل پر ایک گاؤں میں مولانا واصف کی زیر قیادت تبلیغ ہوتی رہی۔ نماز مغرب پڑھ کر واپسی ہوئی۔

یہاں جمعرات کی رات دہلی کے بڑے بڑے لوگ مولانا کی زیارت کو آتے ہیں۔ آج باوجود بارش کے رونق ہے۔ کئی مبارک صورتیں دیکھنے میں آتی ہیں۔

تہجد کے وقت اکثر کو ذکر و تہلیل میں مصروف پایا۔ نماز فجر حضرت مولانا کے حکم سے ہمارے رفیق مولانا احسان اللہ نے پڑھائی۔ چائے کے وقت 50،60 کا مجمع تھا، حضرت نے ارشاد فرمایا:

1- نماز میں قرآن شریف کی ایک چھوٹی سی سورہ فاتحہ کا جتنا ثواب ہے، نماز کے باہر تمام قرآن شریف ختم کرنے کا اتنا ثواب نہیں، پھر جماعت لوگوں میں نماز کی تلقین کرے اس کے اجراء کا اندازہ کون کیا لگا سکتا ہے۔ ہر کام اپنے محل اور موقع پر اپنی خاصیت رکھتا ہے، اسی طرح جہاد و دین کے پھیلانے کی کوشش کے دوران میں ذکر کا ثواب گھر میں بیٹھ کر یا خانقاہ میں ذکر کرنے سے کہیں زیادہ ہے۔ پس دوستو ذکر کی کثرت کرو۔

2- یہ تحریک کیا ہے؟ انفروا خفافاً و ثقالاً پر عمل کرنا۔ اس نفر میں کوتاہی عذاب الٰہی کی دعوت دینا ہے! دوستو! اس تبلیغ میں اصولوں کی پابندی نہایت ضروری ہے، اگر کسی اصول میں ذرا بھی کوتاہی کرو گے تو اللہ کا وہ عذاب جو شاید بدیر آئے فوراً ہی تمہارے سر پر آموجود ہوگا۔ اس تحریک کی تاریخ میں دو واقعات ایسے پیش آئے جب یہ تحریک ظاہراً اپنے بام ترقی پر پہنچ کر اصول کی غیر پابندی ہی کی وجہ سے پھر نیچے گری بس بھائیو! اچھا اصولوں کی سختی سے پابند کرو۔

3۔ اسلام کیا ہے؟ حال کا جو حکم ہو اس کے آگے گردن رکھنا۔ شیطان ہمیں حال کے حکم کی پابندی سے روکتا ہے۔ شیطان دو قسم کے حجابات ہماری آنکھوں کے سامنے کر دیتا ہے۔ ایک تو ظلمانی حجاب یعنی نفس کو بُرے کاموں کی حلاوت دے کر ان کے کرنے پر لگا دیتا ہے اور ایک نورانی حجاب اور نورانی حجاب یہ ہے کہ ایک افضل کام سے ہٹا کر کم اہم کام پر لگا دیتا ہے، فرض کے وقت میں نوافل میں مشغول کر دیتا ہے اور نفس یہ سمجھتا ہے کہ میں تو اچھا کام کر رہا ہوں۔ حال کا سب سے بڑا فریضہ تبلیغ ہے اور اس میں کوتاہی کا بدل بڑی سے بڑی عبادت نہیں ہو سکتی۔

چائے کے بعد قرار پایا کہ پشاور کی جماعت دہلی کی جماعت کے ساتھ کل صبح تبلیغ کے لئے روانہ ہو۔ ہم حضرت سے رخصت ہونے کے لئے آئے۔ بچے ساتھ تھے، فرمایا بچوں کو کیوں نہیں لائے؟ ہم نے عذر پیش کیا، فرمایا بھئی تم خود بچوں کو سمجھانے سے قاصر ہو اور اپنے قصور کو محسوس کرتے ہو، بچوں کی ناسمجھی پر بچوں کے لئے کسی چیز کا سمجھنا ضروری نہیں ہے۔ ان کے کان میں ڈالنا، نظر میں رکھنا، اور احساس دلانا اصل چیز ہے۔ اگر یہ نہیں تو بچے کے کان میں اذان کا کیا مطلب ہے؟

اس کے بعد وحدت اور تکرارات و مرات ذکر کرتے رہنے کی تلقین فرمائی۔ فرمایا ذکر حصن کے مانند ہے تاکہ شیطان تم پر حملہ اور غلبہ حاصل نہ کرے۔ الا بذکر اللّٰہ تطمئن القلوب نیز بھائیو اپنے بچوں کو نیک اور اچھی باتیں سناتے رہو۔

آخر وقت تک ذکر کے فضائل اور تاکید فرماتے رہے، سہارنپور میں مولوی عبدالغفار صاحب ندوی جو دہلی مولانا سے مل کر ہمارے پاس سہارنپور آئے تھے۔ ملے اور ہمارے نام مولانا کا یہ پیغام لائے "تم لوگ آئے اور چند روز مستفیض کر کے چل دیے، یاد رکھو اس راہ میں بھوک اور پیاس کی تکلیفات برداشت کرنے کی ضرورت ہے۔ اس راہ میں اپنا پسینہ بہاؤ اور خون بہانے کے لئے تیار رہو"۔

دعوت کا انہماک:

یہاں چند واقعات مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدیر "الفرقان" کی روایت اور حوالہ سے نقل کئے جاتے ہیں جن سے اس شدت علالت میں بھی اپنے کام میں مولانا کی یکسوئی اور کامل

انہماک و استغراق کا اندازہ ہوگا۔

"اپریل کے آخری ہفتے میں مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری زیارت اور مزاج پرسی کے لئے تشریف لائے، اس سے پہلے حضرت پر نہایت سخت دورہ پڑ چکا تھا، جس کی وجہ سے ضعف بے حد ہو گیا تھا کہ دو چار منٹ بھی بات کرنے کی سکت نہ تھی، شاہ صاحب کی خبر سن کر اس ناچیز کو طلب فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ مجھے ان سے ضروری باتیں کرنی ہیں، لیکن صورت یہ ہوگی کہ تم اپنے کان میرے منہ کے قریب کر دینا اور میں جو کہوں وہ ان سے کہے جانا، چنانچہ جب شاہ صاحب اندر بلائے گئے تو بات شروع ہوئی تو مجھ سے فرمائی، لیکن دو تین ہی منٹ کے بعد اتنی قوت آ گئی کہ خود مخاطب ہو گئے اور تقریباً آدھ گھنٹے مسلسل تقریر فرماتے رہے[1]۔

اسی اپریل کے مہینے میں جس روز آپ پر وہ شدید دورہ پڑا جس کا ذکر اوپر بھی آ چکا ہے۔ اس دن آپ پر قریب دو گھنٹے کے غشی کی سی کیفیت طاری رہی۔ آنکھیں تک بند رہیں۔ دیر کے بعد آنکھیں کھولیں اور زبان پر یہ کلمات جاری ہوئے۔ الحق یعلو، الحق یعلو، الحق یعلو ولا یعلیٰ پھر ایک وجد کی سی کیفیت میں ایک گونہ ترنم کے ساتھ (جو عام عادت نہ تھی) تین دفعہ یہ آیت فرمائی:

کان حقا علینا نصر	ایمان والوں کی مدد کرنا
المومنین ط	ہمارے ذمہ حق ہے

جس وقت بلند آواز سے آپ نے یہ آیت تلاوت فرمانی شروع کی میں صحن مسجد میں تھا اور آواز سن کر حضرت کے حجرہ کے دروازے پر جا کر کھڑا ہوا، جو خاص خادم اندر تھے ان سے میرا نام لے کر ارشاد فرمایا کہ وہ کہاں ہے؟ میں سنتے ہی اندر حاضر ہو گیا، ارشاد فرمایا:

"مولوی صاحب اللہ کا وعدہ ہے کہ یہ کام ہوگا اور اللہ کی مدد اس کو اتمام تک پہنچا دے گی، مگر شرط یہ ہے کہ اس کے وعدہ نصرت پر کامل یقین اور بھروسہ کے ساتھ اس سے

[1] (اس موقع پر جو ارشاد فرمایا وہ باب ہفتم میں ملاحظہ ہو)

نصرت مانگتے ہو اور اپنی امکانی کوششوں میں کمی نہ کرو"۔

یہ فرمانے کے بعد پھر آنکھیں بند ہو گئیں، تھوڑی دیر کی گہری خاموشی کے بعد صرف اتنا فرمایا "کاش علماء اس کام کو سنبھال لیتے اور پھر ہم چلے جاتے"۔

عجب تماشا تھا۔ اس علالت میں حضرت کی قوت وصحت جوں جوں گرتی تھی احیاء دین کی تڑپ اور اعلاء کلمۃ اللہ کا جذبہ روز بروز اسی قدر بڑھتا جاتا تھا۔ ضعف ونقاہت کے لحاظ سے حضرت کی مہینوں وہی حالت رہی جس میں اچھے اچھوں کو سوائے خاموش پڑے رہنے کے اور کچھ گوارا نہیں ہوتا، لیکن اس سارے عرصے میں دیکھنے والوں نے اکثر ان کو تین ہی حالتوں میں دیکھا۔

نمبر1: اس کام (احیاء دین) کی سوچ فکر میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

نمبر2: یا اس کے لئے دل کی انتہائی شکستگی کے ساتھ دعا میں فرما رہے ہیں، کارکنوں کے لئے اخلاص ثبات، استقامت، اتباع طریقہ محمدی اور اصول مرضیہ کی پابندی اور رضاء وقبول اپنے اللہ سے مانگ رہے ہیں اور ایسے سوز کے ساتھ مانگ رہے ہیں کہ بعض اوقات پاس والوں کو رونا آجاتا ہے۔

نمبر3: یا اس سلسلہ میں احکام وہدایت دے رہے ہیں۔

"حتیٰ کہ علاج کے سلسلہ میں جو طبیب ڈاکٹر آتے، ان سے پہلے اپنی بات کہتے اس کے بعد ان کو دیکھ بھال کا موقع دیتے۔ ایک دن حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب دہلی کے ایک مشہور ڈاکٹر کو لائے، مولانا نے اپنی بات کیسے عجیب انداز میں ان سے کہا، فرمایا:

"ڈاکٹر صاحب! آپ کے پاس ایک فن ہے جس سے مخلوق استفادہ کرتی ہے، لیکن وہ فن وہ ہے جس کو ماند کرنے کے لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو چند ظاہری معجزے (اندھوں اور کوڑھیوں کو اچھا کر دینا مردوں کو زندہ کر دینا) دے کر بھیجا گیا تھا، اور یہ آپ جان سکتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جو روحانی علوم دیئے گئے تھے، وہ ان ظاہری معجزوں سے بدرجہا اعلیٰ اور افضل تھے تو مجھے آپ سے یہ کہنا ہے کہ ہمارے حضرت خاتم الانبیاء ﷺ کے ذریعہ جو روحانی علوم واحکام بھیجے گئے ہیں، وہ وہ ہیں جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے روحانی علوم اور ان کی لائی ہوئی شریعت کو بھی

غیر چلن دار کر دیا تو ذرا سوچئے کہ حضور ﷺ کی لائی ہوئی ان روحانی چیزوں کی طرف توجہ نہ کرنا کتنی بڑی چیز کی ناقدری ہے الوگوں سے ہم بس یہی کہتے ہیں کہ وہ اس نعمت سے فائدہ اُٹھائیں ورنہ بڑے گھاٹے میں رہیں گے"۔

اس موضوع (احیاء دین) کے سوا کوئی بات کہنا تو درکنار سننا تک گوارا نہ تھا۔ اگر کوئی شخص دوسری بات سامنے شروع کر دیتا تو اکثر اوقات برداشت نہ فرما سکتے اور فوراً روک دیتے۔ خدام میں سے کوئی خیریت مزاج پوچھتا تو فرماتے۔

"بھی تندرستی بیماری تو انسان کے ساتھ لگی ہوئی ہے، اس میں کیا خیریت اور بے خیریت؟ خیریت جب ہے کہ جس کام کے لئے پیدا کئے گئے ہیں وہ کام ہو، اور حضور ﷺ کی روح مبارک کو چین ہو، صحابہ کرامؓ کو حضور ﷺ نے جس حال میں چھوڑا تھا اس میں ادنیٰ تغیر آنے کو بھی خلاف خیریت سمجھتے تھے[1]۔

حاجی عبدالرحمٰن صاحب راوی ہیں کہ مولانا کے وطن کاندھلہ سے آپ کے کچھ اعزہ عیادت کے لئے آئے۔ مولانا نے پوچھا کس لئے آئے؟ کہنے لگے آپ کی خیریت دریافت کرنے کے لئے! فرمایا جو مٹنے کے لئے بنا ہے، اس کی خیریت پوچھنے کے لئے کاندھلہ سے یہاں تک آؤ اور رسول کریم ﷺ کا دین عزیز جو مٹنے والا نہیں وہ مٹا جا رہا ہے اور تم اس کی خبر نہیں لیتے[2]۔

ایک جمعہ کو فجر کی نماز مولانا یوسف صاحب نے پڑھائی اور قنوت نازلہ پڑھی۔ نماز کے بعد ایک میواتی خادم نے آواز دی کہ حضرت یاد فرماتے ہیں۔ مولانا نے ارشاد فرمایا کہ قنوت نازلہ میں دوسرے کفار کے ساتھ ان غیر مسلم فقراء اور اہل ریاضت کی نیت بھی کرنی چاہیے جو اپنی قلب قوت کو اسلام کے خلاف استعمال کر رہے ہیں۔ سہارنپور کے اس مناظرہ کے واقعہ کی طرف اشارہ فرمایا جس میں ایک ہندو سنیاسی مناظر اسلام کے خلاف اپنی قوت قلب استعمال کر رہا تھا اور مسلمان مناظر اظہار خیال میں دقت محسوس کر رہا تھا۔ مولانا خلیل احمد صاحب تشریف رکھتے تھے، ان کی توجہ دلائی گئی۔ آپ نے جب توجہ کی تو سادھو متوحش ہو کر جلسہ سے اُٹھ گیا اور مناظر اسلام

---

1 (رسالہ الفرقان ماہ رجب وشعبان 1363ھ)

2 (روزنامچہ جماعت تبلیغ پشاور ارشد صاحب)

کی زبان کھل گئی ۔[1]

اس صبح کو خاکسار اور مولانا محمد منظور صاحب نے مختصر تقریریں کیں، مولانا کی تشویشناک اور نازک حالت کو دیکھ کر اور یاد کر کے کبھی مولانا اس جگہ خطاب فرمایا کرتے تھے، لوگوں پر ایک رقت طاری تھی، خصوصاً جب مقرر نے اس جگہ کی طرف اشارہ کر کے کہا "خدا اس محراب و منبر کو آباد رکھے، آپ نے یہاں سے کئی بار سنا ہے کہ .... تو حاضرین کی آنکھیں اشکبار تھیں ۔

جمعہ کی رات کو برسوں کا معمول تھا کہ مولانا مجمع سے تبلیغی گفتگو فرماتے تھے، اور مختلف محلوں اور بعض اوقات دوسرے شہروں سے لوگ بڑی تعداد میں جمع ہوتے تھے۔ آخری علالت میں یہ مجمع بہت زیادہ ہو جایا کرتا تھا۔ مولانا خود خطاب فرمانے سے معذور تھے، لیکن یہ گوارا نہ تھا کہ یہ لوگ اپنے مشاغل اور گھر کی راحتیں چھوڑ کر دین کے لئے یہاں آتے ہیں وہ بیکار وقت گزاریں یا ان کی آمد ایک ذاتی آمد بن کر رہ جائے کہ مزاج پرسی کر کے اور خیریت دریافت کر کے یا ہاتھ پاؤں دبا کر چلے جائیں۔ مولانا اس کو خیانت سمجھتے تھے کہ ان کی یہ للّٰہی محبت اور دینی جذبہ بے محل صرف یا ضائع ہو، اس لئے طبیعت پر سخت تقاضا ہوتا تھا کہ ان کو دینی کام میں مشغول کیا جائے اور ان کے سامنے دین کی وہ خصوصی دعوت جو اس جگہ سے دی جا رہی ہے پیش کر دی جائے، اس میں اگر ذرا تاخیر ہوئی تو مولانا کی نازک طبیعت اس کا تحمل نہ کر سکتی۔

اس روز شب جمعہ کو مغرب کی نماز کے بعد لوگ مسجد کی چھت پر جمع کر دیئے گئے تھے اور خطاب کا حکم ہوا تھا، شروع کرنے میں چند منٹ کی تاخیر ہوئی۔ اسی اثناء میں دو تین پیامبر آئے اور یہ پیام لائے کہ مولانا فرماتے ہیں کہ جلد شروع کرو، مجھ پر ایک ایک منٹ بار ہے۔ جب خطبہ مسنونہ شروع ہو گیا اور مولانا کو اس کی اطلاع ہوئی اس وقت اطمینان ہوا۔

آخری مہینہ:

حالت بروز بروز نازک ہوتی چلی جاتی تھی۔ پہلے کھڑے ہو کر نماز پڑھ لیتے تھے، اب اس سے بھی معذوری تھی۔ چارپائی صف کے کنارے لگا دی جاتی تھی اور آپ جماعت کے ساتھ نماز پڑھتے تھے۔

---

1. (تفصیل کے لئے دیکھا جائے "تذکرہ خلیل")

ان دنوں مولانا ظفر احمد صاحب کا بھی قیام تھا، اور وہی گویا علاج کے نگراں مشیر تھے عام مجالس اور اجتماعات میں عموماً وہی خطاب کرتے اور جلسوں میں وعظ و تقریر فرماتے، مولانا ان کے قیام سے بڑی تسکین و اطمینان محسوس کرتے تھے۔

28 جمادی الثانی (21 جون) کو شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب بھی تشریف لے آئے۔

30 جمادی الثانی 63ھ (جون 44ء) کو نوح کے مدرسہ معین الاسلام کا سالانہ جلسہ تھا، یہ غالباً پہلا جلسہ تھا جس میں مولانا کی شرکت نہیں ہورہی تھی۔

23 کی صبح کو لاری سے نظام الدین کا قافلہ روانہ ہوا، جماعت نے مولانا یوسف صاحب کو اپنا امیر بنایا۔ مولانا ظفر احمد صاحب، مولانا منظور صاحب، مولانا زکریا صاحب قدوسی مولوی امیر احمد صاحب پروفیسر مہاراجہ کالج سبے پور، محترم مولوی سید عزیز الرحمن صاحب اور لکھنؤ کی جماعت کے افراد ہمراہ تھے۔ راستہ بھر ذکر، کچھ تذکیر اور کچھ ہی مذاکرہ میں گزرا 12 بجے کے قریب نوح پہنچے اور اسی وقت جلسہ شروع ہوگیا، مولانا کا لگایا ہوا باغ سامنے تھا اور خوب کھلا ہوا تھا۔ باغبان ہی نہ تھا اور سب تھے۔

رات کو پھر جلسہ شروع ہوا، جلسہ کے اثناء میں نوح کے انگریزی ہائی اسکول کے دارالاقامہ کی ایک عمارت میں آگ لگ گئی، جلسہ آگ بجھانے میں مشغول ہوگیا، بڑی مشکل سے آگ پر قابو پایا گیا۔ عمارت کا بڑا نقصان ہوا۔

آج کی رات مسجد کا وہ گوشہ سونا تھا جس میں ہمیشہ مولانا کی چارپائی ہوتی تھی اور میوات کے پروانے اس شمع کے گرد جمع رہتے تھے۔ آخیر جون کی گرمی تھی مگر نوح کی فضاء میں اور لوگوں کے دلوں میں وہ حرارت نہ تھی جو مولانا کی گفتگو اور نماز کے بعد کی والہانہ اور خود فراموشی کی دعاؤں اور اس مسلسل اضطراب اور بے چینی سے پیدا ہوتی تھی جو میوات کے قیام اور جلسہ کے ایام میں برابر رہتی تھی۔

نوح سے واپسی پر مولانا نے جلسہ کی روداد سنی۔ آگ لگنے کا واقعہ سنا تو فرمایا تم نے ذکر میں کمی کی شیاطین کو موقع مل گیا۔

ایک صاحب نے اس پر کچھ مسرت کا اظہار کیا کہ انگریزی کے مدرسہ میں آگ لگ گئی، مولانا نے اپنے سامنے اس وقت تو کچھ نہیں کہا مگر مسلمانوں سے تعلق رکھنے والی چیز کے نقصان پر خوشی

مولانا کو بڑا ناگوار ہوئی۔ دوسرے موقع پر فرمایا کہ مجھے یہ بات بہت ناپسند ہوئی۔ اس پر خوشی کا کوئی موقع نہ تھا۔

مولوی یوسف صاحب سے فرمایا کہ تبلیغی وفود کی روانگی کا منظر بھی تم نے مولانا ظفر احمد صاحب کو دکھایا، انہوں نے کہا نہیں! فرمایا بڑی غلطی کی، یہی تو دیکھنے کی چیز تھی کہ رسول کریم ﷺ کے عہد مبارک میں مسلمانوں کے وفود کس طرح روانہ ہوتے تھے۔

خطرہ کا قرب:

مولانا کو اس کا بھی طرح احساس تھا کہ خطرہ قریب ہے اور وقت مقررہ ٹل نہیں سکتا۔ بعض موقع پر کسی دینی مصلحت سے یا کام کی سرگرمی بڑھانے کے لئے اس کا اظہار بھی فرما دیا کرتے تھے۔ مولانا ظفر احمد صاحب ملنے آئے تو فرمایا تم نے مجھے وقت دینے کا وعدہ کیا تھا، ابھی تک اپنا وعدہ وفا نہیں کیا، مولانا نے کہا کہ آج کل تو گرمی بہت ہے ان شاء اللہ رمضان کی تعطیل میں آؤں گا اور کچھ وقت صرف کروں گا۔ فرمایا تم رمضان کہتے ہو، مجھے شعبان پکڑنے کی بھی امید نہیں۔ مولانا ظفر احمد صاحب نے قیام کا فیصلہ کر لیا۔

چودھری نواز خاں سے فرمایا، بھائی تم کہیں پڑے رہو، بیس دن کا حساب و کتاب ہے ادھر یا ادھر ہو جائے گا۔ (اللہ کی شان اس فرمانے سے بیس ہی دن بعد آپ کا وصال ہو گیا)

خاکسار سے بھی کئی مرتبہ فرمایا کہ مجھے اپنے جانبر ہونے کی امید نہیں۔ اس مرض سے بچتا نظر نہیں آتا، یوں اللہ کی قدرت میں سب کچھ عجیب بھی کچھ نہیں ہے۔ لیکن کبھی کبھی ایسے فقرے بھی فرما دیتے کہ تیمارداروں کی آس بندھ جاتی اور وہ صحت کی طرف سے پُر امید ہو جاتے۔

علاج کی تبدیلی:

ابتداء سے حکیم کریم بخش صاحب (پہاڑ گنج) کا علاج تھا، یونانی علاج تبدیل ہوا تو مولانا ظفر احمد کے مشورہ سے بایو کیمک علاج شروع ہوا۔ آخر میں دہلی کے مشہور معالج ڈاکٹر عبداللطیف صاحب کا علاج شروع ہوا، مرض بہت بڑھ چکا تھا، ڈاکٹر شوکت اللہ صاحب انصاری کی تشخیص شروع سے آنتوں کی دق کی تھی اور وہ تقریباً مایوسی ظاہر کر چکے تھے۔ انہوں نے غالباً پانی کی تجویز کی تھی، ان دنوں میں برابر حرارت رہنے لگی تھی، آخر میں ڈاکٹر صاحب نے انجکشن تجویز کئے

اور بڑی اُمیدواروں اور دعاؤں سے بیا بخشش دینے کے شکر کا مورد ہے۔

تیماردار اور خاص خدمت گزار:

مولوی اکرام الحسن صاحب کاندھلوی مولانا کے بھانجے دوا پلانے کے ذمہ دار تھے۔ غذا کے مہتمم مولوی لطیف صاحب تھے۔ مولانا ظفر احمد صاحب اور مولانا احتشام الحسن صاحب کا عام مشورہ اور نگرانی رہا کرتی تھی۔ مولوی واصف علی صاحب وضو اور نماز کے منتظم تھے۔ چودھری نواز خاں نمبردار محراب خاں اور خصوصیت کے ساتھ اُمید خاں، رحیم خاں، رحیم بخش، سلیمان بڑی دلسوزی جانفشانی سے خدمت کر رہے تھے۔ محمد یوسف صاحب تاجر کشن گنج گھنٹوں رات کو جاگ کر سر پر مالش کرتے تھے۔ مولانا اپنے سب خدمت گزاروں کے اور مخلصین کے بڑے ممنون تھے۔ فرماتے تھے کہ میرے خادموں کو خدوم نہ سمجھو یہ مخدوم ہیں۔ ان لوگوں نے حقیقت میں بڑی دولت کمائی۔

دہلی کے تاجر:

دہلی کے سوداگر اپنے تعلق کے مطابق مولانا کی اس نازک حالت سے بڑے دلگیر اور رنجیدہ رہتے تھے، بہت سے لوگوں نے باریاں مقرر کر لی تھیں، اکثر وہ دو تین تین روز کے لئے آ کر پڑ جاتے تھے اور حسب مقدور خدمت کی کوشش کرتے تھے۔

محض جسمانی خدمت اور ذاتی تعلق سے خفگی:

مولانا کو اگر کسی بات سے یہ اندازہ ہوتا کہ کسی شخص کو محض میری ذات سے تعلق ہے تو بہت ناراض ہوتے اور فرماتے تھے کہ دین سے تعلق ہونا چاہیے، کسی ایسے شخص کی خدمت قبول کرنے اور اس سے راحت حاصل کرنے کے روادار نہ تھے جو محض جسمانی خدمت پر اکتفا کرتا۔ ایک مرتبہ ایک میواتی سر پر تیل کی مالش کر رہے تھے تھوڑی دیر بعد ان پر نظر پڑی، پہچان لیا فرمایا تم کبھی تبلیغ میں حصہ نہیں لیتے، میں تم سے کام نہیں لے سکتا، چھوڑ دو۔ ایک مرتبہ ایک میرٹھ کے بڑے مولانا منظور صاحب سے فرمایا کہ ان کو مجھ سے بہت تعلق ہے مگر کبھی انہوں نے میری بات نہیں مانی اور میری دعوت قبول نہیں کی۔ یہاں دس دن سے میری خدمت کے لئے حاضر ہیں، آپ ان کو لے جا کر سمجھائیے کہ اس کام میں حصہ لیں، اس کے بغیر مجھے تکلیف ہوتی ہے، مولانا کا

لے گئے اور ان سے گفتگو کی، انہوں نے کہا میں تہیہ کر کے آیا ہوں کہ اب حصہ لوں گا۔ مولانا نے جا کر اطلاع کی، آپ نے اجازت دی اور ان کے ہاتھ چوم لئے۔

باہر کام کا فروغ:

باہر سے جو خطوط آتے تھے ان سے معلوم ہوتا تھا کہ اس زمانے میں کام بڑے جوش وخروش سے ہو رہا ہے۔ جن شہروں اور مقامات پر مدت سے افسردگی تھی، اور وہاں کام بڑا مشکل معلوم ہوتا تھا، وہاں خلاف توقع آسانیاں پیدا ہو گئی تھیں اور نئی روح پیدا ہو گئی تھی، اس زمانہ علالت میں بعض نئے مرکزوں میں کام کی داغ بیل پڑی، مولوی عبدالرشید صاحب مسکین کی طلب وخواہش پر بھوپال ایک بڑی جماعت گئی جس میں جناب مفتی کفایت اللہ صاحب بھی تشریف لے گئے، مولوی عبدالرشید صاحب نعمانی اور پروفیسر عبدالمغنی صاحب کی تحریک پر دو مرتبہ جماعتیں جے پور گئیں۔ سب سے پہلے زیادہ کام کا جوش نئے مقامات میں سے مراد آباد میں تھا جہاں سے کام کی برابر خبریں آرہی تھیں اور کئی بار وفود بھی آئے۔

دعوت کی سرگرمی:

جس قدر وقت موعود قریب آتا جاتا تھا، طبیعت کی نزاکت اور بے تابی اور کام کی سرگرمی بڑھتی جاتی تھی۔ دعوت کے سوا کسی کے سننے اور دیکھنے کا تحمل جاتا رہا تھا، انتہائی ضعف اور ناطاقتی کے باوجود بستر علالت پر پڑے ہوئے پورے کام کی نگرانی خود فرما رہے تھے اور برابر دن رات میں کئی کئی بار بلا کر اس کے متعلق جزوی ہدایات اور لوگوں کے نام پیغامات دیتے رہتے تھے۔ اس کا بھی اندازہ لگاتے تھے اور برابر خیال رکھتے تھے، کہ مجلسوں میں، حلقۂ درس اور دسترخوان پر تبلیغ ودعوت کے سوا کوئی اور گفتگو تو نہیں ہوتی۔ اگر کبھی اس کا علم ہو جاتا تو طبع نازک پر بڑا گراں گزرتا، ذکر، تعلیم میں مصروف رہنے کی تاکید فرماتے رہتے اور بجائے زجر وتنبیہ اور ملامت کے وعظ وترغیب سے کام لیتے اور اکثر کسی واسطہ اور کنایہ سے فرماتے اور متوجہ کرتے، ایک مرتبہ ظہر کے بعد علماء کی مجلس درس میں شرکت میں غفلت ہو گئی، نہایت لطیف طریقہ پر پیغام بھیجا جس سے متنبہ ہوا۔ خواص میں ایک عالم اپنی مشغولیت کی وجہ سے غیر حاضر رہتے، ایک روز بلا کر ارشاد فرمایا کہ اپنی طرف سے ان کے نہ ہونے پر اظہار تعجب کیجئے۔

بعض چیزوں کی طرف توجہ دلانے کے لئے یہ طریقہ اختیار فرماتے کہ ان کے فضائل و ترغیبات بیان کرنے کا حکم دیتے جس سے خود ان کی اہمیت کا احساس ہوتا۔

جلسوں کی کارروائی اور تبلیغ کام کی روداد کا بے چینی سے منتظر رہتا۔ ایک رات میرٹھ کے جلسہ کے بعد سواری نہ مل سکی اور رات کو نظام الدین پہنچنا نہ ہوا، رات کو کئی بار دریافت فرمایا۔ صبح جاتے ہی پورا حال سنا اور اطمینان ہوا۔

ضعف کی وجہ سے طبیعت کی نزاکت اور دینی چیز کا غلبہ اتنا بڑھ گیا تھا کہ پہلے جن چیزوں کا تحمل فرما لیتے تھے اب ان کے سننے کی قوت نہیں رہی تھی۔ غیر موضوع کی بات کا تحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک مرتبہ صحن مدرسہ میں کوئی تاریخی موضوع چھڑ گیا اور شاہان اسلام پر تنقید شروع ہو گئی، لوگوں نے اس میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ اللہ جانے مولانا کو کس طرح اس کی اطلاع پہنچی، مولوی معین اللہ یہ پیام لائے کہ روئے سخن فوراً بدل دو۔ وعظ و تقریر کے لئے بھی تاکید تھی کہ اصل پیغام اور دین کے اصول پر کچھ تقریر کی مقدار زیادہ نہ ہو، کیفیت وہ ہو جو رسول ﷺ کے خطبہ دیتے وقت ہوتی تھی کہ انه منذر جيش يقول صبحكم و مساكم معلوم ہوتا تھا کہ کسی لشکر کے خطرہ کا اعلان فرما رہے ہیں اور بتلا رہے ہیں کہ صبح و شام سر پر آیا چاہتا ہے۔ تقریر میں لطائف و قصص اور امثال و اشعار سننے کی تاب نہیں تھی، جہاں کسی مقرر نے اپنے بیان میں کچھ وسعت اختیار کی اور خطابت اور وعظ کے طرز پر تنوع اور تکلف کیا مولانا کو گرانی شروع ہوئی اور تقاضا فرمایا کہ یا تو مطلب کی بات کہو یا ختم کرو۔ فرماتے ہمیں وعظ تھوڑی کہلانے ہیں، وعظ تو جلسوں اور مدرسوں میں ہوتے ہی ہیں، اس وجہ سے تیماردار اکثر اہتمام کرتے کہ مقرر کی آواز مولانا تک نہ پہنچنے پائے تا کہ وہ اپنی بات کہہ بھی سکے اور مولانا کو کوفت نہ ہو۔

ایک جمعہ کی صبح کو بڑا مجمع تھا، مراد آباد کی جماعت اور کچھ علماء آئے ہوتے تھے۔ کہنے کے لئے اس خاکسار کا انتخاب ہوا، میں نے تقریر، تقریر کے انداز پر شروع کی، اور مضمون کو پھیلایا، کچھ دیر کے بعد مولانا کا حکم پہنچا کہ اصل موضوع پر آؤ اور پیغام پہنچاؤ۔ چار پانچ مرتبہ یہ حکم پہنچا گیا اور میں نے اصل بات کہہ کر تقریر ختم کی۔ عصر کو معمولاً مجمع ہو جاتا اور عموماً مولانا حاضرین کے نام کوئی پیغام دیتے جو لوگوں کو سنا دیا جاتا، اس روز حرارت تیز بھی تھی اور نقاہت تھی کہ کچھ فرما نہ سکے۔ میں صبح کا ڈرا ہوا تھا، شیخ الحدیث صاحب نے فرمایا بھی، مگر میں نے کہا کہ کیا کہوں۔ تقریر تو مقصود

نہیں اور اس وقت کچھ کوئی خاص بات معلوم نہیں ہوتی۔ ہوش آیا تو فرمایا آج صبح سے خطاب کیوں نہیں ہوا؟ وقت کیوں ضائع کردیا گیا، عرض کیا گیا جناب نے پوچھتے کو فرمایا نہیں، ارشاد ہوا مجھ سے پوچھا کیوں نہیں؟ جواب دیا، جناب کو تیز حرارت تھی، ایسی حالت میں تکلیف دینا مناسب نہ معلوم ہوا، فرمایا تم نے مجھے دین پر مقدم کیوں رکھا، میری تکلیف کا کیوں خیال کیا؟ وقت کے نکل جانے پر بہت افسوس فرماتے رہے۔

میری طبیعت کچھ متاثر تھی، مغرب کی نماز بڑی بے لطفی میں پڑھی، خیالات اور وساوس کا ہجوم تھا، طبیعت پست ہو رہی تھی۔ سلام پھیرتے ہی طلبی ہوئی، نہایت شفقت سے سر پر ہاتھ رکھا اور بڑے الطاف فرمائے۔ فرمایا پست ہمت ہو گئے، تھک گئے؟ ہمت بلند کرو، پھر فرمایا گھبراؤ کوئی حرج نہیں، پھر فرمایا مولوی یوسف، مولوی سعید خان اور مولوی عبید اللہ ہیں۔

خصوصی اہتمام۔

ان دنوں میں چند باتوں کا زندگی بھر سے زیادہ اہتمام رہا، اول اور سب سے زیادہ علم و ذکر کی تاکید و ترغیب، اس تصور سے کہ یہ کام عام عصری تحریکات کی طرح محض ایک بے روح ڈھانچہ، قواعد و ضوابط کا مجموعہ اور ایک مادی نظام بن کر نہ رہ جائے، آپ برابر اس سے ترساں و لرزاں رہتے تھے اور طبیعت پر اس کا ایک بوجھ تھا، بار بار اس سے ڈراتے تھے، بار بار علم و ذکر کے اہتمام کی تاکید فرماتے تھے، بار بار کہتے تھے اور کہلواتے تھے کہ علم و ذکر اس گاڑی کے دو پہیے ہیں جن کے بغیر یہ گاڑی نہیں چل سکتی، دو بازو ہیں جن کے بغیر اس کی پرواز نہیں، علم کے لئے ذکر اور ذکر کے لئے علم کی ضرورت ہے، علم بغیر ذکر کے ظلمت ہے، ذکر بغیر علم کے فتنہ ہے اور یہ تحریک ان دونوں کے بغیر سراسر مادیت ہے۔

دوسرے مسلمانوں کے پست درجے والے طبقہ پر رحم و شفقت اور ان کی تعلیم و تبلیغ کی فکر اور اس بڑے اہتمام سے ایک مکتب سڑک کے کنارے تھا اور ایک مکتب آگے بڑھ کر چوراہے پر قائم کرایا[1]۔

---

[1] (مکتب کے لفظ سے غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے، عام طور پر مروجہ قسم کا مکتب یہ مدرسہ نہ تھا۔ اس کی حقیقت یہ ہوتی تھی کہ [illegible] قسم کا کوئی فرش ایک درخت کے نیچے بچھا دیا گیا، وہ تبلیغ میں کام کرنے والوں کی ایک جماعت وہاں [illegible] کے طور پر بیٹھے اور لکھنے کا کام میں مشغول ہوگئی۔ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اس میں حقہ پانی کا اہتمام کرایا............. اور شہری اور میواتی مبلغین کو تاکید کی وہاں بیٹھیں اور آتے جاتے راہ گیر مسلمانوں کو محبت و شفقت سے بلائیں۔ حقہ پانی سے ان کی تواضع کریں، ان کا کلمہ سنیں اور ان کو کلمہ خیر سنائیں اور دین سیکھنے کا شوق دلائیں۔ اس کا مولانا کو اتنا اہتمام تھا کہ آدمیوں کو وہاں بھیجتے تھے، وہاں کے حالات کی تفتیش و تجسس رکھتے تھے۔ ان کے حقہ پانی کے اہتمام کی فضیلت اور ثواب بیان کرتے تھے۔ یہ زمانہ اجمیر کے عرس کا تھا۔ ہندوستان کے اکناف و اطراف کے بکثرت غریب مسلمان حضرت نظام الدین اولیاء کی زیارت کے لئے آتے اور راستہ میں تازہ حقہ ٹھنڈا پانی اور گھنا سایہ دیکھ کر دم لینے کے لئے ٹھہر جاتے اور اتنی دیر میں مبلغین اپنا کام کر جاتے، کبھی ان کو نرمی اور ملاطفت سے بلا لاتے اور اپنا پیغام سنا دیتے۔ اس طرح صدہا جاہل مسلمانوں کے کان میں دین کی بات پڑ گئی اور اللہ ہی کو علم ہے کہ اس کے کتنے بندوں کے لئے راستہ چلتے ہدایت کا سبب بن گئی، بعض اوقات صبح کی نماز سے پہلے بعض علماء کو متھرا جانے والی سڑک پر بھیجتے کہ گاڑی بانوں اور شتربانوں کو تبلیغ کریں۔

تیسرے زکوٰۃ ادا کرنے اور راہ خدا میں خرچ کرنے کے صحیح شرعی طریقے اور آداب کی تلقین کی، مولانا کو اپنی زندگی میں اس کی طرف خاطر خواہ توجہ کی نوبت نہیں آئی تھی، لیکن ان دنوں اس کی طرف بڑی توجہ تھی، تجار اور اہل ثروت کا مجمع رہتا تھا۔ مولانا نے یہ مضمون بار بار بیان فرمایا اور دوسروں سے کہلوایا کہ آدمی کو اپنی زکوٰۃ کا اہتمام اپنی عبادت کی طرح کرنا چاہیے، اس کے مستحقین کو خود تلاش کرنا چاہیے، اس کو ادا کرتے وقت خود ممنون ہونا چاہیے، مولانا ظفر احمد صاحب اور دوسرے حضرات نے اس پر بار بار تقریریں کیں۔

چوتھے ڈاک کا اہتمام، تاکید تھی کہ روزانہ صبح کی نماز کے بعد آئی ہوئی تبلیغی ڈاک مجمع کو سنائی جائے، حاضرین سے جوابات کے لئے مشورہ کیا جائے، وسائل و حالات جو خطوط میں درج ہیں، حاضرین کے سامنے پیش کئے جائیں اور ان پر ان سے مشورہ لیا جائے ڈاک پیش کرنے سے پہلے ایک مختصر تقریر کرنی ہوتی تھی کہ یہ ڈاک اس لئے آپ کے سامنے پیش کی جاتی ہے تاکہ

(بقیہ حاشیہ) ساتھ ہی حقہ پانی کے انتظام کے ذریعہ راہ گیر مسلمانوں سے تبلیغی باتیں کرنا اور حسب ضرورت ان کو دین کی تلقین کرنا بھی ان کا کام تھا بلکہ سرا و ان کمتبوں کی یہی غرض و غایت تھی)

آپ ان حالات و مسائل پر غور کریں اور دینی باتوں پر غور کرنے کی عادت ڈالیں۔ اپنی قوت فکر یہ کہ جو ابھی تک دنیاوی امور و مسائل میں صرف ہوتی رہی ہے، دین کے امور و مسائل پر صرف کرنے کی ابتدا کریں۔ ان خطوط میں اکثر وہ باتیں جن میں دہلی اور میوات کے تجربہ کار مبلغین کے مشورہ کی ضرورت ہوتی اور ان کی باہمی گفتگو اور تبادلہ خیال سے وہ مسائل طے ہوتے، کہیں کام کی مشکلات کا ذکر ہوتا یہ حضرات اپنے تجربہ سے ان کا حل پیش کرتے۔ کہیں اپنے طریق کار کی تفصیل ہوتی۔ اس میں اگر کوئی کوتاہی ہوتی جس کی وجہ سے دقتیں پیش آرہی ہوتیں تو متنبہ کرتے۔ کہیں سے جماعتوں کی فرمائش ہوتی اور اس کا امراء جماعت اور منتظمین انتظام کرتے اور اسی مجمع میں اس کی تدبیر کی جاتی۔

ابتداء میں یہ خطوط مولانا کی موجودگی میں پیش کئے جاتے لیکن عموماً مولانا کو بولنا پڑتا جس سے ضعف و تعب بڑھ جاتا، اس لئے آخر میں کچھ فاصلے سے مشورہ ہوتا۔ یہ خدمت اس عاجز کے سپرد تھی، دن میں کسی وقت حاضری کا موقع ہوتا تو دریافت فرماتے کہ آج ڈاک میں کیا تھا اور مجمع نے کیا طے کیا؟ غلطیوں کی اصلاح اور اپنی رائے کا اظہار فرماتے۔ پھر وہ دوسرے روز مجمع کو سنائی جاتی۔

اس طرح گویا مولانا اپنے بعد کام کو جاری رکھنے اور اس کا نشیب و فراز سمجھا جانے کی مشق کرا رہے تھے، اور کوئی شبہ نہیں کہ یہ مشورہ بڑا سبق آموز اور مفید ہوتا۔

دہلی کے جلسے:

مولانا اہل دہلی اور تجار سے تقاضا فرماتے رہتے تھے کہ وہ مولانا ظفر احمد صاحب کی موجودگی سے فائدہ اٹھائیں، جلسے کریں اور مولانا سے تقریر کرائیں۔ ان حضرات کے اہتمام سے شہر میں کئی جلسے ہوئے۔ آخری چہار شنبہ کے جامع مسجد والے جلسے کے علاوہ حوض والی مسجد، کالی مسجد (ترکمان دروازہ) کی سرائے والی مسجد قصاب پورہ اور جامعہ ملیہ میں جلسے ہوئے۔ مولانا ظفر احمد صاحب اور دوسرے مقررین نے تقریریں کیں۔ سب سے زیادہ مولانا کو میر درد روڈ کے اتوار والے جلسے اور گشت کا اہتمام رہتا جس کو آپ نئی دہلی کا تبلیغی مرکز سمجھتے تھے، اکثر اس خاکسار و برادر عزیز مولوی معین الدین اور مولوی واصف علی صاحب کے حصہ میں یہ سعادت آتی تھی۔

مجمع کی زیادتی اور ہجوم:

مجمع روز افزوں تھا۔ ایک ایک وقت میں دو دو سو اور تین تین سو آدمی وہیں کھانا کھاتے اور رات کو سوتے۔ نظام الدین کی مسجد اور دارالاقامہ کے چپہ چپہ پر آدمی ہی آدمی نظر آتے۔ ہر طرف حرکت اور چہل پہل رہتی۔ نمازوں میں اندر اور باہر صفیں ہوتیں۔ آدمی ذرا تاخیر کر دے تو جگہ پانی مشکل اور رات کو غفلت ہو جائے تو سونے کے لئے بھی جگہ ملنی مشکل۔

میں کبھی کبھی اس مجمع کو دیکھتا اور سمجھتا کہ یہ ساری رونق اور بہار اس شخص کے دم سے ہے جو ایک طرف بستر پر پڑا ہوا سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ سینکڑوں آدمی اس کے دسترخوان پر کھانا کھا رہے ہیں اور خود اس کے پیٹ میں بہت تھوڑی سی غذا پہنچی ہے۔ یہ درس کے حلقے یہ ذکر کی صدائیں، یہ نورانی شکلیں، یہ رکوع وسجود کی کثرت یہ چمکیلے چہروں کی رونق کب تک ہے، اس ساری بہار کو دیکھتا اور کہتا۔

اللہ رکھے آباداں ساقی تری محفل کو

مولانا عبدالقادر صاحب کی آمد:

شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب چند دنوں کے لئے اسباق کا انتظام کرنے سہارنپور تشریف لے گئے تھے، اب آئے تو مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری بھی ساتھ تشریف لائے، مولانا اس آمد سے بے حد مسرور ہوئے اور شیخ الحدیث کا بڑا شکریہ ادا کیا اور دعائیں دیں کہ مولانا کی تشریف آوری کا سبب بنے۔

مولانا کے ساتھ ان کے مخلصین اور اہل ذکر کی ایک جماعت تھی جس سے یہاں کی دینی رونق اور برکت دوبالا ہوگئی۔

غلط خبر:

مولانا کی علالت کی نزاکت کی اطلاع اہل شہر کو تھی۔ روزانہ بس اور تانگوں سے لوگ آتے جاتے رہتے تھے۔ رات کے رہنے والے صبح کو جاتے تو ان کے دوست احباب خیریت دریافت کرتے۔ اس اثناء میں اللہ جانے کس طرح غلط خبر مشہور ہوگئی اور بجلی کی طرح سارے شہر میں دوڑ گئی۔ تانگے اور سواریوں کا تانتا لگ گیا۔ ہر بس سے لوگ اترتے تھے اور خیریت معلوم کر کے

واپس چلے جاتے تھے۔ ٹیلی فون پر لوگ دریافت کر رہے تھے، خبر کی تردید کی گئی مگر بروقت موثر نہیں ہوئی اور بڑا مجمع ہو گیا۔ یہ سنت بھی ادا ہو گئی۔ مولانا منظور صاحب نے مسجد کے نیچے درخت کے تلے و ما محمد الا رسول قد خلت من قبل الرسل کے مضمون پر ایک برمحل اور موثر تقریر کی۔ یہ اہل شہر کے لئے ایک تازیانہ اور تنبیہ تھی کہ جن لوگوں نے ابھی تک توجہ نہیں کی ہے اور ان کے مشاغل اور مصروفیتوں نے ان کو اس کی مہلت نہیں دی کہ وہ مولانا کی دعوت کی طرف ان کی زندگی میں متوجہ ہوں، وہ اب بھی توجہ کر سکتے ہیں ورنہ آج تو یہ خبر غلط ہے، کسی نہ کسی دن سچ ہو کر رہے گی۔

و ما کان النفس ان تموت الا باذن اللہ کتابا مؤجلا ط

آخری ایام وفات:

وفات سے دو تین روز پہلے کچھ بارش ہو گئی تھی اور ہوا میں کسی وقت خنکی آجاتی تھی۔ مولانا کو مرض کے آخری ایام میں گرمی بہت محسوس ہوتی تھی۔ آپ کے اصرار سے دیر تک چارپائی باہر رہتی۔ ان ہی دنوں میں نمونیہ کا حملہ ہوا اور اس کا علم نہ ہو سکا۔ بہت دیر میں اس کا اندازہ ہوا۔ پلاسٹر لگایا گیا اور احتیاط کی گئی۔

محفل جلد تاریک ہونے والی تھی، اس لئے شمع بھڑک بھڑک کر جل رہی تھی، دماغ بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ جلد جلد پیغام دے رہے تھے۔

8 جولائی کی شب کو 12 بجے رات کے قریب میں چورا ہے کی طرف ٹہلنے چلا گیا تھا۔ واپس ہوا تو جو شخص ملا اس نے کہا تمہاری تلاش میں آدمی دوڑ رہے تھے، مولانا نے یاد فرمایا تھا۔ حاضر ہوا۔ کان ہونٹوں کے قریب لے گیا تو پہلی دفعہ آواز کا ارتعاش محسوس ہوا، بیچ بیچ میں غوطہ ہو جاتے تھے۔ دو دو تین تین مرتبہ بمشکل الفاظ ادا کر کے بات پوری کی، لوگوں کو ذکر کی تاکید تھی اور مولانا عبدالقادر صاحب کی مجلس میں بیٹھنے کی ہدایت۔ پوری بات اس وقت یاد نہیں، صبح پھر طلبی ہوئی اور کوئی پیغام کہا۔

9 جولائی کو رات کے ایک بجے کے قریب حجرے کے سامنے سے گزرا تو دیکھا کہ مولانا بیدار ہیں اور کچھ تیماردار بھی موجود ہیں، جو کسی اہتمام میں ہیں، میں بھی جا کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر غفلت کے بعد ایک صاحب کا ذکر فرمایا اور ارشاد ہوا کہ کیا وہ اپنے وطن میں جا کر کام شروع کریں گے؟

عرض کیا انشاء اللہ ضرور اور مزید خوشی کے لئے یہ بھی عرض کیا کہ الحمد للہ وہ صاحب اثر ہیں، انشاء اللہ ان کی بات کا اثر ہوگا، فرمایا جی ہاں اہل اللہ کا اثر ہوتا ہی ہے۔ اس کے بعد پھر غفلت ہوگئی، تھوڑی دیر کے بعد آنکھیں کھولیں اور فرمایا، مولوی طیب صاحب (رامپور منہاران) مولوی ظہیر الحسن صاحب (کاندھلہ) اور حافظ عثمان صاحب پروفیسر اسلامیہ کالج پشاور کی مدد سے اگر بانپت میں جلسہ ہو سکے تو بہت اچھا ہے۔

10 جولائی کی شام کو غفلت سے ہوشیار ہو کر علماء کو اپنی سطح کے مطابق اعتدال کی تاکید فرمائی۔

11 جولائی کی صبح کو آب زمزم پیتے ہوئے حضرت عمرؓ کی یہ دعا اللہ سے مانگی۔

اللھم ارزقنی الشھادۃ فی سبیلک واجعل موتی ببلد رسولک۔

(اے اللہ مجھے اپنے راستہ میں شہادت نصیب فرما اور میری موت اپنے رسولؐ کے شہر (مدینہ) میں مقدر فرما۔

اسی دن ایک صاحب کو دیکھ کر فرمایا کہ ان سے دریافت کرو کہ اپنی قوم میں اس دعوت کو پیش کیا، اور اس کا کیا انتظام کیا؟ اسی روز حافظ عثمان صاحب آئے۔ مولانا نے مجھے پیغام بھیجا کہ حافظ عثمان میرے عزیز ہیں ان کا خاص اکرام کیجئے۔

آخری ایام میں ایک دن معالج ڈاکٹر نے کہا کہ ان کے تمام اعضاء ایک ایک کر کے ماؤف ہو چکے ہیں، صرف قلب کی طاقت ہے جو ان کے تھامے ہوئے ہے، یہ بھی کہا کہ ان کی حالت کو اپنے اوپر قیاس نہ کیجئے، جو کچھ آپ دیکھ رہے ہیں جسمانی طاقت نہیں ہے، یہ روحانی قوت ہے جس کو عام لوگ نہیں سمجھتے۔

12 جولائی چہارشنبہ کے دن شیخ الحدیث، مولانا عبدالقادر صاحب اور مولانا ظفر احمد صاحب کو یہ پیغام پہنچا کہ مجھے اپنے آدمیوں میں سے چند پر اعتبار ہے، آپ لوگ جسے مناسب سمجھیں اس کے ہاتھ پر ان لوگوں کو بیعت کرا دیں جو مجھ سے بیعت ہونا چاہتے ہیں۔ حافظ مقبول حسن صاحب، قادری داؤد صاحب، مولوی احتشام الحسن صاحب، مولوی یوسف صاحب، مولوی انعام الحسن صاحب، مولوی سید رضا حسن صاحب۔

ان حضرات نے دوبارہ مشورہ کر کے مولانا کی خدمت میں عرض کیا کہ مولوی محمد یوسف صاحب ماشاء اللہ ہر طرح اہل ہیں۔ حضرت شاہ ولیؒ نے خلافت کے لئے القول الجمیل میں جو شرائط لکھے

ہیں، وہ سب بحمد اللہ ان میں پائے جاتے ہیں۔ عالم میں، متورع ہیں اور علوم دینیہ سے اشتغال رکھتے ہیں، فرمایا اگر تم نے یہی انتخاب کیا ہے تو اللہ اسی میں خیر و برکت دے گا، مجھے منظور ہے، یہ بھی فرمایا کہ پہلے مجھے بڑا کھٹکا اور بے اطمینانی تھی، اب اطمینان ہو گیا ہے، امید ہے کہ انشاء اللہ میرے بعد کام چلے گا۔

شام کو فرمایا کہ جس کو مجھ سے بیعت کرنا ہے بیعت کر لے۔ مشورہ ہوا کہ اس وقت تکان بہت ہے کل پر موخر رکھا جائے۔ و کان امر اللہ قدرا مقدورا۔

آخری شب:

رات کے سفر کا اہتمام تھا، پوچھا کہ کیا کل جمعرات ہے؟ عرض کیا گیا جی ہاں! فرمایا کہ میرے کپڑوں کو دیکھ لو کہیں کوئی نجاست تو نہیں ہے؟ یہ معلوم کر کے کہ نہیں ہے اطمینان و خوشی ہوئی۔ چارپائی سے اتر کر وضو کے ساتھ نماز پڑھنے کی خواہش کی مگر تیمارداروں نے منع کیا۔ جماعت کے ساتھ عشاء کی نماز شروع کی گئی مگر قضائے حاجت کی ضرورت پیش آگئی، بعد میں دوسری جماعت سے حجرہ میں نماز پڑھی۔ فرمایا آج کی رات دعا اور دم کثرت سے کراؤ۔ یہ بھی فرمایا کہ آج میرے پاس ایسے لوگ رہنے چاہئیں جو شیاطین اور ملائکہ کے اثرات میں امتیاز کر سکیں۔ مولوی انعام الحسن صاحب سے پوچھا کہ وہ دعا کس طرح ہے۔ اللھم ان مغفرتک انہوں نے پوری دعا یاد دلائی: اللھم ان مغفرتک اوسع من ذنوبی و رحمتک ارجیٰ عندی من عملی (اے اللہ! تیری مغفرت میرے گناہوں سے زیادہ وسیع ہے اور مجھے عمل سے زیادہ تیری رحمت کا آسرا ہے) یہ ورد زبان رہی۔ فرمایا آج یوں جی چاہتا ہے کہ مجھے غسل کرا دو اور نیچے اتار دو۔ دو رکعت نماز پڑھ لوں۔ دیکھو نماز کیا رنگ لاتی ہے۔

12 بجے گھبراہٹ کا ایک دورہ پڑا جس پر ڈاکٹر کو فون کیا گیا۔ ڈاکٹر آئے اور گولی دی، رات کو بار بار اللہ اکبر اللہ اکبر کی آواز آتی رہی۔ پچھلے پہر مولوی یوسف صاحب اور مولوی اکرام الحسن صاحب کو یاد فرمایا۔ مولوی یوسف صاحب سے فرمایا، آ مل لے، ہم تو چلے اور صبح کی اذان سے پہلے جان جاں آفریں کے سپرد کر دی اور عمر بھر کا تھکا مسافر جو شاید کبھی اطمینان کی نیند سویا ہو، منزل پر پہنچ کر میٹھی نیند سویا۔

یاایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ فادخلی فی عبادی

وادخلی جنتی

صبح کی نماز کے بعد بہتے ہوئے آنسوؤں کے درمیان مولوی یوسف صاحب کی جانشینی عمل میں آئی اور مولانا کا عمامہ ان کے سر پر باندھا گیا۔

غسل وتجہیز وتکفین:

اس کے بعد غسل ہوا علماء وفقہاء نے اپنے ہاتھوں سے غسل دیا اور تمام سنن ومستحبات کا التزام کیا گیا۔

مساجد (اعضاء سجود) پر جب خوشبو لگانے لگے تو حاجی عبدالرحمن صاحب نے فرمایا کہ پیشانی پر اچھی طرح خوشبو لگا دو یہ گھنٹوں سجدے میں لگی رہتی تھی۔

شہر میں عام اطلاع ہو گئی تھی اور لوگوں کی آمد صبح سے شروع ہو گئی تھی۔ تھوڑی دیر میں مجمع بڑا گیا۔ وہ مجمع جس کو مولانا کبھی فارغ نہیں دیکھ سکتے تھے۔ شیخ الحدیث صاحب اور مولانا محمد یوسف صاحب کا حکم ہوا کہ لوگوں کو نیچے میدان میں جمع کیا جائے اور ان سے خطاب کیا جائے۔ وما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل کے مضمون سے بڑھ کر اس موقع کے لئے تعزیت اور موعظت کیا ہو سکتی تھی۔ مولانا ظفر احمد صاحب اور مفتی کفایت اللہ صاحب نے بھی لوگوں کو صبر کی تلقین کی اور نصائح فرمائے۔

مجمع برابر بڑھ رہا تھا، ظہر کی نماز کے وقت بے اندازہ مجمع تھا، حوض کا پانی وضو کرنے والوں کی کثرت سے نیچا ہو گیا۔ مسجد کی تمام وسعتیں زیریں وبالائی حصے بالکل بھر گئے، جنازہ نماز پڑھنے کے لئے باہر لایا گیا، مجمع قابو اور نظم وضبط سے باہر تھا، بلیاں باندھ دی گئی تھیں، تا کہ لوگ کاندھا دے سکیں۔ بڑی کش مکش کے بعد جنازہ درختوں کے نیچے لایا گیا۔ شیخ الحدیث صاحب نے نماز پڑھائی اور دفن کے لئے جنازہ واپس ہوا۔ مسجد کے اندر پہنچنا مشکل تھا۔ بہت سے لوگ رسیاں ڈال ڈال کر اندر پہنچے۔ مسجد کے جنوبی مشرقی گوشے میں باپ اور بھائی کے پہلو میں لحد تیار تھی، بڑی مشکل اور کش مکش سے جنازہ قبر تک پہنچا۔ نعش قبر میں اتاری گئی اور دین کی یہ امانت خاک کے سپرد کی گئی۔ سورج جب غروب ہوا تو دین کا یہ آفتاب جس کی تابش سے ہزاروں خاک کے ذرے چمک اٹھے تھے اور دور دور تک دین کی حرارت پیدا ہو گئی تھی خاک میں اوجھل ہو چکا تھا۔

پس ماندگان:

مولانا نے صرف ایک صاحبزادہ مولانا محمد یوسف اور ایک صاحبزادی (اہلیہ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب، متع اللہ المسلمین بحیاتہ) چھوڑیں۔ خود شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب مولانا کے حقیقی بھتیجے، محبوب بھائی کے فرزند، مولانا کے داماد اور شاگرد، مولانا کے محبوب و معتمد اور ان کی یادگار ہیں۔

وما مات من كانت بقاياه مثلهم
شباب تسامى للعلى وكهول

ان حقیقی جانشینوں کے علاوہ وابستگان کا پورا حلقہ اور بالخصوص اہل میوات آپ کی جیتی جاگتی یادگار ہیں۔ انتقال سے ایک روز پہلے فرمایا کہ لوگ آدمی چھوڑ کر جاتے ہیں، میں بچے بچے الحمد للہ پورا ملک چھوڑ کر جا رہا ہوں۔

حلیہ:

رنگ گندمی۔ قد پستہ، جسم نہایت نحیف مگر نہایت چاق و چست، سستی کا نام و نشان تک نہیں تھا، داڑھی گھنی اور سیاہ، چند بال سفید جو صرف قریب سے دیکھے جاتے تھے۔ صورت سے تفکر، چہرہ سے ریاضت اور مجاہدہ، پیشانی سے عالی ہمتی اور بلند نظری نمایاں تھی۔ زبان میں کچھ لکنت لیکن آواز میں قوت اور جوش تھا اور اسی جوش سے اکثر گفتگو کا سیل رواں لکنت کی رکاوٹوں سے ٹکرا کر ایک آبشار کی صورت اختیار کر لیتا تھا۔

باب ہفتم

خصوصی صفات و امتیازات

ایمان واحتساب:

مولانا کی ایک امتیازی صفت جوان کی عملی زندگی پر حاوی اور ان کے اعمال کی روح رواں تھی ایمان واحتساب ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ کو اللہ سمجھتے ہوئے، اس کے حکم کو اس کا حکم سمجھتے ہوئے اس کے وعدوں پر پورے یقین ووثوق کے ساتھ اور اس کی رضاء اور اس کے موعود اجرو انعام کے شوق وطمع میں کام کیا جائے۔ حدیث میں آیا ہے۔

من صام رمضان ایمانا واحتسابا غفرله ما تقدم من ذنبه (بخاری)	جو رمضان کے روزے اللہ کے وعدوں پر یقین کرتے ہوئے اور اس کے اجر وانعام کے شوق میں رکھے گا اس کے سب پچھلے گناہ معاف ہو جائیں گے
من قام ليلة القدر ايمانا واحتسابا غفرله ما تقدم من ذنبه (بخاری)	جو شب قدر میں ایمانا احتسابا شب بیداری کرے گا اس کے سب پچھلے گناہ معاف ہو جائیں گے

یہی عمل کی روح ہے جس سے عمل دفعتاً فرش سے عرش تک پہنچ جاتا ہے اور اس کے بغیر بڑے سے بڑا عمل پرواز کی طاقت نہیں رکھتا۔ ایک حدیث سے اس کی مزید توضیح ہوتی ہے۔

عن عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم اربعون خصلہ اعلاھا منیحۃ العنز ما من عامل یعمل بخصلہ منھا رجاء ثوابھا و تصدیق موعودھا الاادخلہ اللہ بھا الجنۃ (بخاری)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا چالیس باتیں ہیں جن میں چوٹی کی بات یہ ہے کہ بکری کسی کو دے دے کہ اس کے دودھ سے

فائدہ اٹھائے پھر واپس کردے جو شخص ان میں سے کسی بات پر بھی اس کے ثواب کی امید میں اور اس پر جو اللہ کا وعدہ ہے اس کے یقین اور تصدیق کے ساتھ عمل کرے گا اللہ اس کی وجہ سے اس کو جنت میں داخل کرے گا۔

مولانا نے اس کی بڑی اہمیت سمجھی اور اس کو زندہ کرنے کی پوری کوشش کی۔ مندرجہ ذیل اقتباسات سے جو ان کے خطوط سے لئے گئے ہیں اندازہ ہوگا کہ ان کے ذہن میں اس کی کس قدر اہمیت تھی۔

1- باطن مذہب ایمان و احتساب ہے، بہت سے اعمال میں مصرح ذکر کیا جاتا ہے، ایمانا و احتسابا، لہذا ہر عمل کے بارہ میں جو خطابات وارد ہوئے ہیں ان میں دھیان کرنا اور اس کے ذریعہ حق تعالیٰ کی عظمت، اس کی بڑائی اور اس کے قریب و یقین کو بڑھانا اور ان اعمال پر جو دینی و دنیوی مصالح اور انعامات وعطیات کا وعدہ فرمایا گیا ہے ان کو بطور عطا کے نہ بطور معاوضہ کے یقین کرنا یہ باطن ہے۔

2- اعمال اپنی ذات سے کوئی قیمت نہیں رکھتے، ان کے اندر جو قیمت آتی ہے وہ اللہ کے حکم کے امتثال کے ذریعہ اس ذات عالی سے وابستگی سے آتی ہے تو جس قدر وجہ وابستگی پر قابو ہوگا اور وہ ملکہ قوی ہوگا اور جتنا بھی عمل زیادہ طمانیت اور دل سے اور قوت سے ہوگا، ان اعمال کی اصلی قدر و قیمت اسی قدر ہوگی۔

3- جناب عالی نے جذبہ اور ولولہ نہ ہونے کا تذکرہ فرمایا ہے۔ مجھے اس پر بڑا ہی رشک ہے۔ مومن کے لئے اللہ کے امتثال امر کی اصلیت یہ ہے کہ حکم کے یقین اور اس کی عظمت سے اتنا دبا ہوا ہو کہ وہ ولولہ کو دبادے، ولولہ طبیعت سے پیدا ہوتا ہے ولولہ اگر ہو تو یہ حب طبعی ہوئی اور جب تعمیل حکم کی عظمت سے اور فرضیت کے احساس سے ہو تو یہ حب عقلی اور حب ایمانی ہے۔

4- بسا اوقات تھوڑے سے کئے ہوئے کو دیکھ کر ان پر خوش ہو جانا باقیوں کی کوتاہیوں کے محسوس ہونے سے حجاب ہو جاتا ہے، اور وہ اپنے اس مطالعہ سے بچنے کی بہت زیادہ فکر رکھیں۔ کرنے والوں کو دیکھ کر ان کی خوشی کا صرف اتنا ہی اثر لیں کہ فطرۃ اپنی غلطی سے اثرات مرتب ہونے کو جو ہم اپنی کامیابی سمجھتے ہیں وہ نہ ہونی چاہیے۔ اصل کامیابی کوشش میں لگ جانا ہے، نہ کہ ثمرات کا

مرتب ہونا، چنانچہ دینی امور کا اصل ثمرہ اجر وثواب ہے، وہ محض کام میں مشغول ہونے سے تعلق رکھتا ہے دنیاوی اثرات سے اس کو کیا علاقہ۔ بہرحال اگر اثرات مرتب ہو رہے ہیں تو ان سے صرف اتنا ہی اثر لیں کہ ہم غلطی سے جن اثرات کو دنیا میں ڈھونڈتے ہیں وہ بھی ہو رہے ہیں۔ اثرات مرتب نہ ہونے پر بھی کوشش چاہیے تھی۔ اثرات مرتب ہونے پر بھی کوشش میں کمی کرنا بڑی غلطی ہے، بس اتنا محسوس کر کے اپنی اصل توجہ کو صرف کوتاہی اور نقصان کے محسوس کرنے میں متوجہ کریں۔

5- ''عبادات واذکار'' کے بارے میں جو نصوص وارد ہوئے ہیں ان نصوص کو دیکھتے رہنا اور ان کے پڑھنے پر جو وعدے فرمائے گئے ہیں ان کا یقین کرنا اور اس کی کوشش کرتے ہوئے ان سب اوراد کو نبھانا چاہیے، بڑی چیز ان وعدوں پر یقین کی کوشش ہے۔ یہ یقین چونکہ قلب سے تعلق رکھتا ہے، لہذا ایمان عبادات کے قلب کا درجہ رکھتا ہے اور دعا نیت کی امید اسی سے وابستہ ہوتی ہے

6- ''ہر وقت کے لئے ان کے اپنے وقتوں کی عظمت اور حرمت میں آئی ہوئی تعریفیں اور فضیلتیں حدیثوں میں الگ الگ وارد ہیں اور ہر ایک کے الگ الگ برکات ہیں اور انوار ہیں۔ ہم جیسے عامی لوگوں کے لئے بس اتنا ہی کافی ہے کہ ہر وقت کی نماز ادا کرتے وقت یہ طمع رہے کہ ہر وقت کے جو برکات اور انوار ہیں ان کا اللہ تعالیٰ ہمیں حصہ نصیب کرے''۔

7- ''جی لگنے اور مزہ آنے کا دھیان نہ کریں بلکہ اللہ اور رسول کا حکم سمجھتے ہوئے کرتے رہیں اور ان کی اقتداء و تعلیم سمجھیں۔ فرمان کی تعمیل اور امر کی اقتداء بہت بڑی چیز ہے''۔

مولانا کی پوری تحریک دعوت اسی ''ایمان واحتساب'' پر تھی، یعنی اس کے ذریعے اللہ کو راضی کرنا، رسول اللہ ﷺ کا اتباع، دلالت علی الخیر (بھلائی کی طرف رہنمائی) کے طویل اور مسلسل اجر وثواب کا مستحق بننا اور مرنے کے بعد زندگی کے لئے سامان کرنا۔

ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

تبلیغ کا طریقہ کچھ دل سے متعلق ہے کچھ جوارح سے۔ دل سے جو متعلق ہے وہ چند امور ہیں۔

1- اس کام کے لئے پھرنے میں انبیاء علیہم السلام اور سب نبیوں کے سردار محمد ﷺ کا اتباع اور اس پاک دولت سے اللہ کو راضی کرنا ہے۔

2- الدال علی الخیر کفاعلہ (بھلائی کی طرف راہنمائی کرنے والا خود عمل کرنے والے کی طرح ہے) کے مضمون کو قوت کے ساتھ دھیان میں رکھتے ہوئے اپنی کوشش سے جتنا بھی کوئی نماز، قرآن اور ذکر وغیرہ میں مصروف ہو ان میں سے ہر ایک کے کئے ہوئے کو اپنے لئے ذخیرہ آخرت یقین کرتا ہے اور ان میں سے ہر ایک کے تفصیلی ثواب کو دھیان میں رکھتا ہے۔

3- اللہ جل جلالہ و عم نوالہ کی طرف دعا و التجا کی قوت پیدا کرنی، قدم قدم پر اللہ کے فضل اور اس کے حاضر و ناظر ہونے کو یقین کرتے ہوئے اس کی رضا کو اور تبلیغ کی کامیابی کو مانگنا رہے۔

4- اس کار خیر کے لئے قدم اٹھانے کو محض غیبی فضل سمجھ کر اس کے شکر کا دھیان رہے۔

5- مسلمان کی خوشامد اور اس کے ساتھ ساتھ تواضع اور نرمی کی دل سے مشق کرنی ایک دوسرے گرامی نامہ میں فرماتے ہیں:

"دین کے کام اس وقت پائیدار اور جاری رہتے ہیں کہ آدمی قیامت کے منظر کو سامنے رکھے اور قیامت میں کام دینے والے ان کارناموں کو جو آدمی نے یہاں کئے ہیں۔ حضور ﷺ کی بڑائی کو ذہن نشین کرتے ہوئے اور ان کارناموں کے اس معاوضہ کو جو حضور ﷺ نے بتلایا ہے (بشرطیکہ اللہ کے ہاں قبول ہو گئے ہوں) اپنے لئے ذخیرہ تصور کرے۔

جوں جوں یہ تصور رہے گا حق تعالیٰ سبحانہ تصدیقی ایمان کی حلاوت نصیب کرے گا اور جوں جوں حلاوت نصیب ہوگی شوق بڑھے گا اور شوق میں برکت ہوگی۔ مثلاً تمہاری وجہ سے جتنے بے نمازی نمازی ہو گئے، تلاش کرو کہ شریعت میں اس کا کتنا ثواب ہے۔ فی نماز شریعت نے جتنا ثواب بتایا ہے خوب دھیان جماؤ کہ وہ سب ذخیرہ تجھے ملے گا۔

ایک دوسرے موقع پر تحریر فرمایا:

کلمۃ اللہ کے اعلاء و ترقی کے فکر میں سعی اور کوشش خالص اپنے مولیٰ کو مولیٰ سمجھ کر اس کی رضا کے لئے ہو اور موت کے بعد کے سامان کے یقین کے ساتھ حق تعالیٰ کے یہاں سے فیضان موعود ای زندگی کے ساتھ ہے جس پر اولئک یرجون رحمۃ اللہ کا حصر شاہد عدل نہیں بلکہ بیسیوں آیات قرآنیہ سے مؤید ہے۔

''اپنے نفس کو تجربہ سے ایسا گندہ، متعفن، خود غرض، دور کام کا بگاڑ دینے والا دل سے یقین کرے کہ الطاف خداوندی کا قصور تو کجا اور ہے، یہ صورت تک راست ہوتا نظر نہیں آتا، لہٰذا اسی نیت سے سعی کرے اور حضور ﷺ کی باتیں دوسروں میں پھیلاوے کہ میرے علاوہ اللہ کے سب بندے جو اپنی ذات سے نیک طینت اور پاک نفس ہیں دین کے جس کام کو کریں گے وہ ظاہر و باطن میں اچھا عمل ہوگا۔ حق تعالیٰ بقاعدہ الدال علی الخیر کفاعلہ اپنے الطاف سے ان پاک ہستیوں کی برکت سے مجھے بھی اس سے حصہ عطا فرما دے''۔

فکر کی تاکید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''فکر کوئی بڑی چیز نہیں ہے، تنہائیوں میں بیٹھ کر اپنے نفس سے یہ کہنا کہ یہ چیز قطعاً اللہ کو راضی کرنے والی ہے اور موت جو یقیناً ایک آنے والا وقت ہے میری نفسانی زندگی کو قطعاً درست کرنے والا ہے اور الدال علی الخیر کفاعلہ کو سمجھ کر اس نکلنے کی وجہ سے جتنی نیکیاں وجود میں آئی ہیں، یا آ سکنے والی ہوں ان سب کو جمع کر کے اللہ کی خوشنودی کو ان سے بے تکلف یقین کے ساتھ وابستہ کرنا بس یہی فکر ہے''۔

مولانا یہ چاہتے تھے کہ جو لوگ اللہ کے دین کو لئے ہوئے اللہ کے راستے میں نکلے ہوئے ہوں ان کے اعزہ و متعلقین بھی اپنی خوش دلی، صبر، ہمت افزائی اور قدر دانی سے ان کا اس کام اور اجر و ثواب میں شریک ہوں۔ مولانا پوری امت کے دل میں اس اجر و ثواب کا شوق اور ایمان و احتساب پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اس کی ابتدا آپ نے اپنے گھر سے کی۔ حجاز سے آپ نے گھر کو حسب ذیل خط لکھا:

''تم خیال کر کے دیکھو کہ دنیوی غرض کی وجہ سے لوگ اپنے اہل و عیال کو کتنی مدت کے لئے چھوڑتے ہیں، دنیا پر تو کر کے دیکھو کہ اس وقت بھی کفر کے لشکر میں ہزاروں مسلمان سر بکف جان خطرہ میں محض ایک پیٹ کے کاران ہر وقت سدا کو دیا ہے۔ چلے جانے کے لئے موت کے کنارہ پر ہیں۔ ایسی کم ہمتی ہرگز نہیں چاہیے۔ تم ہمت اور جواں مردی کے ساتھ خوشی سے میرے دین کی خدمت کے لئے ہجر اور فرقت پر راضی ہو کر چھوڑ دے رکھو تو خوشی کے بقدر اجر و ثواب میں شریک ہوگی۔ دنیا میں غنیمت سمجھو

کہ تمہارے عمر والے دین کی خدمت کے لئے تکلیف اٹھا رہے ہیں۔ شکر کرو اس تکلیف کا جب اجر وثواب ملے گا تو کبھی ختم نہ ہوگا۔ ایک ایک صدمہ پر ناخ دا بہو کر ملے گا۔"

مولانا کے نزدیک عاجز وضعیف اور مشغول انسان کے لئے اس محدود اور مختصر زندگی میں اپنی مجبوریوں اور کمزوریوں کے ساتھ طویل ترین، کثیر ترین اور مسلسل اجر وثواب اور ذخیرۂ عمل کی صورت اخلاص واحتساب کے ساتھ اس دلالت علی الخیر اور تبلیغ میں مشغولی کے سوا کچھ نہ تھی۔ اگر کوئی شخص دن بھر روزہ رکھے اور رات بھر نفلیں پڑھے اور ایک قرآن مجید روزانہ ختم کرے یا لاکھوں روپے روزانہ صدقہ وخیرات کرے تو بھی کثرت میں، نورانیت اور قبولیت میں ان لوگوں کے اجر کو نہیں پہنچ سکتا جن کو ان کی دلالت علی الخیر کی وجہ سے ہزاروں لاکھوں انسانوں کی فرض نمازوں، ارکان اور ایمان کا ثواب رات دن کے ہر لمحہ میں پہنچ رہا ہے اور ان کی روح پر اجر وانعام اور انوار وبرکات کی صدیوں سے مسلسل بارشیں ہو رہی ہیں۔ ایک شخص کا عمل اس کی طاقت اور اس کا اخلاص سینکڑوں آدمیوں کے عمل وطاقت اور اخلاص وشغف وانہماک کا ہم پلہ نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے مولانا شخصی عبادات اور نوافل پر (ان میں پورے طور پر خود منہمک رہنے اور ان کی انتہائی حرص وشوق رکھنے کے باوجود) اس متعدی خیر اور دلالت علی الخیر کو ترجیح دیتے تھے اور اس کو زیادہ امید کی چیز سمجھتے تھے۔ ایک بزرگ جو اپنی عمر میں بڑے بڑے کام کر چکے تھے اور اب جسمانی انحطاط وتنزل کے دور میں تھے ان کے ایک دوست کے ذریعہ یہی کا مشورہ دیا کہ اب آپ میں خود کرنے کی زیادہ طاقت نہیں رہی، وقت کم اور کام بہت زیادہ ہے اس لئے مصلحت اندیشی اور وقت شناسی کا تقاضا اور عقل اور حکمت دین یہ ہے کہ دوسروں کے اعمال کا ذریعہ بننے کی کوشش کیجئے۔ تقریر وتحریر، خطوط وترغیب کے ذریعہ اپنے دوستوں اور بیعت ماننے والوں کو اس دعوت وتبلیغ کی طرف متوجہ کیجئے اور ان کے اجر وثواب میں شریک ہو جائیے۔

یہ تحریک ودعوت تو مولانا کے نزدیک ایمان واحتساب کا سب سے سہل اور قوی ذریعہ تھا۔ یوں عام طور پر بھی آپ پر ایمان واحتساب کا ایسا غلبہ تھا کہ مشکل سے کوئی قدم ثواب کی نیت اور دینی نفع کی توقع کے بغیر اٹھتا ہوگا اور کوئی کام محض نفس کے تقاضے سے ہوتا ہوگا۔ گویا لا یتکلم الا فیما رجا ثوابہ (شمائل ترمذی)[1] (دنیا کے سوا) آپ کا حال تھا، ان کی ہر نقل وحرکت دینی

اور شرکت کا محرک اور باعث، اجر اور دینی نفع کی امید اور طمع تھی اسی لئے گفتگو فرماتے تھے۔ اسی لئے تقریبوں میں شرکت کرتے تھے اور اسی بناء پر غصہ آتا تھا اور پھر اسی لئے راضی ہو جاتے تھے، جو چیز اس مقصد اور اس اُمید سے خالی ہو اس سے ان کو دلچسپی اور تعلق نہیں ہوتا تھا، چھوٹے چھوٹے روزمرہ کے کاموں میں بھی یہی حال تھا، بقول مولانا محمد منظور صاحب نعمانی کے شاید بغیر نیت کے ایک چائے کی پیالی بھی نہیں پیتے تھے اور نہ کسی کو پیش کرتے تھے۔

ہر کام میں اور ہر موقع پر اس کے بہترین دینی منافع او برکات حاصل کرنے کے لئے اور اس کو تقرب الی اللہ کا ذریعہ بنانے کے لئے اس کی خصوصی نیت کرتے اور اس عمل کا رُخ بڑی لطافت کے ساتھ عادت سے عبادت کی طرف پھیر دیتے۔ اس بارہ میں ان کی قوت فکریہ اور ذکاوت کتابی علم کی سطح سے اونچی ہو کر حکمت و تفقہ کے بلند درجہ تک پہنچ گئی تھی، وہ اس بارے میں اتنے باریک بین اور حاضر دماغ تھے کہ ایک ہی کام میں الگ الگ نیتوں کے ذریعہ ہر شخص کی سطح کے مطابق خصوصی فائدہ اور اجر وثواب کی رہنمائی کرتے تھے۔ مولانا محمد منظور نعمانی صاحب نے ایک لطیف واقعہ لکھا ہے جس سے اس کا اندازہ ہوگا۔

> ''اخیر زمانہ علالت میں جبکہ حضرت اُٹھ بیٹھ نہیں سکتے تھے، ایک روز دوپہر میں نظام الدین پہنچا، ظہر کی نماز کے لئے بعض میواتی خدام حضرت کو وضو کرا رہے تھے۔ اس وقت مجھ پر حضرت کی نظر پڑی۔ اشارہ سے بلایا اور فرمایا:
>
> ''مولوی صاحب! حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے باوجودیکہ حضور ﷺ کو برسوں وضو فرماتے ہوئے دیکھا تھا اور ایسے ہی حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو بھی دیکھا تھا پھر بھی وہ معلمانہ طور پر حضرت علیؓ کو وضو فرماتے ہوئے دیکھتے تھے''۔

حضرت کا یہ ارشاد سُننے کے بعد جب اس نظرے میں نے حضرت کو وضو فرماتے ہوئے دیکھا تو محسوس کیا کہ فی الحقیقت ایسی بیماری کی حالت میں وضو کے لئے ہمیں حضرت کے وضو سے بہت کچھ سبق حاصل ہو سکتا ہے۔

حضرت کو جو تین چار خادم وضو کرا رہے تھے، یہ سب میواتی تھے۔ ان کی طرف اشارہ فرماتے

1 (رسول کریم ﷺ صرف اس معاملہ پر گفتگو فرماتے ہیں جس میں آپ کو ثواب کی امید ہوتی (حدیث)

ہوئے ارشاد فرمایا:

"یہ بے چارے مجھے وضو کراتے ہیں۔ میں ان سے کہہ رہا ہوں کہ تم لوگ اللہ کے لئے مجھ سے محبت اور میری خدمت کرتے ہو اور تمہارا یہ گمان ہے کہ میں نماز اچھی پڑھتا ہوں جیسی تم نہیں پڑھ سکتے، لہٰذا مجھے وضو اس نیت سے کرادیا کرو کہ میری نماز کے اجر میں تمہارا حصہ ہو جائے اور اللہ سے یوں عرض کرو کہ اے اللہ۔۔۔۔۔۔۔۔ ہمارا گمان ہے کہ تیرے اس بندہ کی نماز اچھی ہوتی ہے جیسی کہ ہماری نہیں ہوتی ہے۔ اس لئے ہم اس کے وضو میں مدد دیتے ہیں تاکہ تو اس کی نماز کے اجر میں ہمارا بھی حصہ کردے"۔

اور میں یہ دعا کرتا ہوں کہ اے اللہ تیرے یہ سادے اور بھولے بندے میرے متعلق ایسا گمان کرتے ہیں، ان کے گمان کی لاج رکھ لے اور میری نماز قبول فرما کر انہیں بھی اس میں شریک فرمادے۔

فرمایا اگر میں سمجھنے لگوں کہ میری نماز ان سے اچھی ہوتی ہے تو اللہ کے یہاں مردود ہو جاؤں، میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ اللہ پاک اپنے ان سادہ دل بندوں ہی کی وجہ سے میری نمازوں کو رد نہ فرمائے گا"

دیکھئے اس ایک وضو میں مختلف احوال کے تین فریقوں کے لئے محض ایک نیت سے دولت دین حاصل کرنے کے کیسے راستے کھول دیئے۔ مولانا منظور صاحب کے لئے تعلیم کی مستقل فضیلت، سنتوں کا تتبع اور اس ذریعہ سے اپنے وضو کی تکمیل و ترقی کی نیت کا مستقل ثواب، میواتیوں کے لئے دربہ احسان کی نماز کے ثواب اور قبولیت میں شرکت اور خود اپنے لئے ان کے حسن ظن کے ذریعہ نماز کی مقبولیت۔

ان مختلف نیتوں اور ایمان و احتساب کے بغیر یہ ایک روزمرہ کا وضو تھا۔ ایک شخص وضو کر رہا تھا، چند آدمی خادمانہ حیثیت سے وضو کرا رہے تھے۔ ایک شخص بغیر کسی دھیان اور مقصد کے دیکھ رہا تھا۔

احسانی کیفیت:

حدیث میں صفت احسان کی حقیقت یہ بیان کی گئی ہے کہ:

"ان تعبد اللہ کانک تراہ" (و فی روایۃ) ان تخشی اللہ کانک تراہ (یعنی اللہ کی عبادت و اطاعت اور اس کا خوف ایسا ہو کہ گویا وہ آنکھوں کے سامنے ہے) حضرت مولانا محمد

الیاسؒ اس کا مجسم نمونہ تھے، جلوت میں بھی اکثر حالت ایسی رہتی تھی کہ گویا وہ اللہ کے حضور میں ہیں۔ مولانا محمد منظور صاحب نعمانی نے بالکل صحیح لکھا ہے اور خاکسار کا بھی مشاہدہ ہے کہ:

اللہ کی تسبیح و تحمید و تمجید اور توبہ و استغفار اور استغاثہ و استمداد کا جامع کلمہ سبحانک اللھم و بحمدک اشھد ان لا الہ الا انت وحدک لا شریک لک استغفرک واتوب الیک یا حی یا قیوم برحمتک استغیث اصلح لی شانی کلہ و لا تکلنی الی نفسی طرفۃ عین۔ جو اکثر ورد زبان رہتا تھا بعض اوقات ایسے حال اور ایسے انداز سے کہتے کہ گویا اللہ پاک کے عرش جلال کے سامنے حاضر ہو کر عرض کر رہے ہیں۔

قیامت کا استحضار اور آخرت کا تمثل:

اسی قبیل کی ایک چیز یہ تھی کہ قیامت کا استحضار اور آخرت کا تمثل (آنکھوں کے سامنے تصویر کی طرح رہنا) ایسا بڑھا ہوا تھا کہ اکثر حضرت حسن بصریؒ کا یہ قول یاد آجاتا تھا کانھم رای عین (صحابہ کرامؓ کے سامنے آخرت ایسی رہتی تھی گویا آنکھوں دیکھی چیز ہے) ایک مرتبہ ایک میواتی سے دریافت فرمایا کہ دہلی کیوں آئے؟ سادہ دل میواتی نے جواب دیا کہ دہلی دیکھنے کے لئے، پھر مولانا کے انداز سے اس کو اپنی غلطی محسوس ہوئی فوراً کہا کہ جامع مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے، پھر بدل کر کہا کہ آپ کی زیارت کے لئے اس پر مولانا نے فرمایا کہ دہلی اور جامع مسجد کی جنت کے سامنے کیا حقیقت ہے اور میں کیا ہوں جس کی زیارت کے لئے تم آئے، سڑگل جانے والا ایک جسم، پھر جنت کا جو ذکر کرنا شروع کیا تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ جنت سامنے ہے۔

اس زندگی کی ناپائیداری اور آخرت کی زندگی کے جاوداں اور اصلی ہونے کا یقین اس طرح طبیعت بن گیا تھا کہ روزمرہ کی باتوں اور خطوط سے صاف عیاں ہوتا تھا۔

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کو ایک خط میں لکھا کہ مولانا عبدالقادر صاحب سے کہو کہ "اس آنی جانی دنیا میں ایک آدھ دن کے لئے تو نظام الدین تشریف لے آئیں۔

ایک مرتبہ مجھ سے فرمایا کہ کہ لکھنؤ میں ملاقات ہوگی، پھر فرمایا کہ حضرت سفر میں کیا ملنا انشاء اللہ آخرت میں ملیں گے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ریل کا ایک مسافر دوسرے مسافر سے کہتا ہے کہ گاڑی کی ملاقات کیا گھر پر ملیں گے، وہی یقین وہی سادگی۔

مولانا سید ظہور صاحب سے ان کی اہلیہ کی تعزیت کرتے ہوئے فرمایا" دنیا کی زندگی ہی اس سے

زیادہ وہ بساط نہیں کہ کسی دروازہ کا ایک پٹ پہلے بند کیا پھر دوسرا پٹ۔ اسی طرح انسان آگے پیچھے دنیا سے چلا جاتا ہے۔

کامل یکسوئی اور انہماک:

مولانا نے اپنے کام اور اپنی دعوت کے لئے برسوں سے اپنے کو کامل طور پر یکسو کر لیا تھا اور خلاف مقصد اور غیر متعلق چیزوں سے کوئی تعلق نہیں رکھا تھا۔ بہت عرصہ پہلے شیخ الحدیث کو ایک خط میں تحریر فرمایا تھا:

> ''میرے دل کی تمنا ہے کہ کم سے کم میرا دماغ اور خیال اور وقت اور قوت اس امر کے سوا ہر چیز سے فارغ رہے''۔

فرماتے تھے کہ ''میرے لئے کسی دوسری چیز سے اشتغال کب جائز ہے جبکہ میں دیکھتا ہوں کہ آپ ﷺ کی روح مبارک کو (مسلمانوں کی موجودہ حالت اور دین کے ضعف و تنزل اور کفر کے غلبہ سے) اذیت ہے''۔ ایک روز ایک خادم نے شکایت کی کہ جو شفقت اور نظر خاص پہلے تھی اس میں کمی معلوم ہوتی ہے۔ فرمایا ''میں بہت مشغول ہوں۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ آنحضرت ﷺ کو اذیت ہے، میں کسی اور چیز کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتا''۔ کبھی اپنی مثال اس سپاہی سے دیتے جو چوراہے پر کھڑا سواریوں اور گاڑیوں کو قابو میں رکھتا ہے اور ان کو چلنے اور رکنے کے اشارے کرتا ہے، فرماتے کہ دوسرے کام بھی اہم اور مفید ہیں مگر اس کے لئے اپنی جگہ سے ہٹنا خطرناک اور ممنوع ہے۔ دوسری چیزوں سے ایسی توجہ ہٹائی تھی اور اپنے کام میں ایسے مشغول ہو گئے تھے کہ ماحول کی بہت سی چیزوں کی طرف توجہ کا موقع نہیں ملتا تھا۔ نئی دہلی سے گزرتے وقت محب مکرم مولانا محمد ناظم صاحب ندوی کے ایک اہم عمارت کو دریافت فرمایا........ فرمایا میرے لئے یہ علوم معدوم ہیں۔

مجلسوں میں جب تک مولانا کو اپنی دعوت کے پیش کرنے کا موقع ملنے کی امید ہوتی ان میں شرکت پسند کرتے۔ محض رسماً اخلاقاً شرکت بہت گراں گزرتی۔ فرماتے تھے ''کہیں جاؤ تو اپنی بات لے کر جاؤ اور اس کو پیش کرو اپنی دعوت کو غالب رکھو''۔

ایک مرتبہ میں نے مولانا سید سلیمان صاحب کا ایک فقرہ سنایا جو انہوں نے ایک جلسہ سے واپس آ کر فرمایا تھا کہ اپنی ایک بات کہنے جاؤ تو دوسروں کی دس باتیں (مروۃً) سننی پڑتی ہیں

مولانا دیر تک اس کا لطف لیتے رہے اور فرمایا کہ بڑے درد سے کہا:

خلاف موضوع اور بے مقصد بات کا دیر تک سننا طبیعت پر بہت بار ہوتا تھا، بعض اوقات بے تکلف آدمی کو منع فرما دیتے اور کبھی اگر اکراماً و مروۃً طبیعت پر جبر کر کے سنتے رہتے لیکن جاننے والا جانتا کہ کیسا مجاہدہ فرما رہے ہیں۔ ریل کے ایک سفر میں مولانا کے ایک عزیز رفیق نے دوسرے رفیق سے کوئی بات چھیڑ دی اور سلسلۂ گفتگو شروع ہوا، فرمایا کہیں اور بیٹھ کر باتیں کرو۔ اہل مجلس اور رات دن کے آنے جانے والے اس بات سے واقف تھے اور حتی الامکان اس کا لحاظ رکھتے تھے، لیکن نئے آنے والوں اور بالخصوص علماء کے لئے سب کچھ جائز تھا اور اس کا کشادہ پیشانی سے تحمل فرماتے۔

وطن عزیز کا ندھلہ کے سفر اور عزیزوں سے ملنے میں بھی اپنی دعوت اور بات کو کبھی نہ بھولتے اور کوئی سفر اور کوئی مجلس شائد اس سے خالی ہوتی ہو لیکن اس کے لئے بڑی مناسب اور لطیف تقریب پیدا فرما لیتے اور اکثر کسی مناسبت ہی سے اپنی بات چھیڑتے جو اہل مجلس پر گراں نہ گزرتی اور نکتہ داں لطف لیتے۔

ایک دفعہ دہلی میں کسی مخلص کے یہاں شادی میں آپ کو شرکت کرنی پڑی۔ آپ نے شادی کی خاص مجلس میں بھرے مجمع میں فریقین کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: آج آپ کے یہاں وہ خوشی کا دن ہے جس دن میں کمینوں تک کو خوش کیا جاتا ہے۔ گوارا نہیں ہوتا کہ گھر کی بھنگن بھی ناخوش رہے، بتلایئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خوش کرنے کی بھی کوئی فکر آپ لوگوں کو ہے، پھر آپ نے تبلیغ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کو سرسبز کرنے کی کوشش کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشی کا سب سے بڑا ذریعہ بتلاتے ہوئے اس کے لئے حاضرین کو دعوت دی۔ مولانا اول تو کسی دعوت و تبلیغ کے سوا کسی اور ضرورت سے شاذ و نادر ہی خط لکھتے پھر اگر لکھتے تو پہلے اپنی بات لکھتے پھر کوئی دوسری بات۔ ایک مرتبہ میرے سامنے ایک میواتی طالب علم نے درخواست کی کہ اس کے لئے مولانا طیب صاحبؒ (مہتمم دارالعلوم دیوبند) کو سفارش کا ایک خط لکھ دیا جائے۔ مولانا نے وہ خط لکھوایا۔ سارا تبلیغ کا ذکر تھا آخر میں ایک دو سطروں میں اس کی سفارش تھی۔

خاکسار کبھی اپنے بعض عزیزوں سے ملنے جاتا تو واپسی پر پوچھتے کہ اپنی بات بھی کہی تھی اور ان کو اس کام کی دعوت بھی دی تھی؟ میں نفی میں جواب دیتا تو فرماتے" مولانا تعلقات جب تک

محمد ﷺ کے قدموں کے نیچے نہ آئیں، مردہ ہیں (یعنی جب تک ان کو دین کی تقویت و دعوت کا سبب نہ بنایا جائے، ان میں خیر و برکت اور روح نہیں)۔

تقریبات میں شرکت و دعوت کو صرف اسی مقصد کے لئے درست سمجھتے تھے، اور آپ کے نزدیک ان کا یہی فائدہ تھا۔ خود اپنے گھر کی ایک مجلس عقد کی اطلاع اس طرح دیتے ہیں "اس دور انحطاط میں بندہ ایسے موقعوں کے اجتماع کو مسلمانوں کی بے حسی سمجھتا ہے مگر چونکہ اپنے بزرگ علماء و مشائخ تشریف لا رہے ہیں اس لئے اطلاعاً تحریر ہے تاکہ جملہ احباب تشریف لاکر سعادت دارین حاصل کریں اور بندہ کو اپنے تبلیغی نظام کے پیش کرنے کا موقع دیں۔

لایعنی (جو بات دینی حیثیت سے مفید اور دنیاوی حیثیت سے ضروری نہ ہو) سے بڑی نفرت اور اجتناب تھا اور اس کی دوسروں کو بھی وصیت فرماتے اور تبلیغ میں نکلنے والوں کو بالخصوص تاکید فرماتے۔ فرماتے تھے "لایعنی میں اشتغال کام کی رونق کو کھو دیتا ہے" جس کام میں دین کا فائدہ نہ دیکھتے اس کو تضیع اوقات سمجھتے۔ ایک مرتبہ میں آپ کے پاس کھڑا ہوا ذوق و شوق کے ساتھ مولوی سید رضا حسن صاحب سے کوئی پرانا واقعہ اور کسی تبلیغی سفر کی روداد سن رہا تھا، مولانا نے سنا اور فرمایا کہ یہ تو تاریخ ہوئی، کچھ کام کی بات کیجئے۔

وقت کی بڑی قدر کرتے تھے اور اس کو اپنا سرمایہ سمجھتے تھے، اس کو بیکار صرف کرنے سے بڑا درد ہوتا تھا۔

ایک مرتبہ نئے خطوط دیکھے جا رہے تھے، ایک پرانا لفافہ ملا جو پڑھا جا چکا تھا۔ کچھ منٹ اس کی تحقیق میں صرف ہوئے۔ پھر معلوم ہوا کہ وہ پڑھا جا چکا ہے، فرمایا اس کو پھاڑ ڈالو ورنہ یہ پھر وقت ضائع کرے گا۔ پھر فرمایا یہی وقت تو ہمارا سرمایہ ہے۔

اس سرمایہ کو مولانا نے جس طرح دیکھ بھال کر صرف کیا اور اس کی جیسی قدر و قیمت پہچانی وہ ان کے اس عظیم الشان اور عہد آفریں کام سے ظاہر ہے جو اس وقت دنیا کے سامنے ہے، اتنا بڑا کام اسی وقت انجام پا سکتا تھا کہ وقت بالکل ضائع نہ کیا جائے اور کسی خلاف مقصد اور غیر مفید مطلب بات میں اس کا کوئی حصہ صرف نہ ہو۔

مقصد کا عشق:

مولانا نے ایک مرتبہ عشق کی یہ تعریف کی تھی کہ "آدمی کی لذتیں اور دلچسپیاں جو دنیا کی بہت سی

چیزوں میں بٹی ہوئی ہیں سب نکل کر کسی ایک چیز میں سمٹ آئیں، یہی عشق ہے"۔ مولانا کی یہ تعریف دین کے بارہ میں خود ان پر صادق تھی۔ اس سے ان کی روح کو عشق ہو گیا تھا جس کے سامنے تمام حسی لذتیں اور تاثرات ماند پڑ گئے تھے، اور یہ روحانی لذت ان کے لئے بالکل حسی اور طبعی لذت بن گئی تھی۔ اس سے ان کے وہ قوت و توانائی اور نشاط و تازگی حاصل ہوتی تھی جو لوگوں کو غذا اور دوا سے حاصل ہوتی ہے، چنانچہ ایک کارکن کو (جنہوں نے خستہ تشنگی کی حالت میں اپنی بے چینی کی شکایت لکھی تھی) جواب میں یہی حقیقت لکھی تھی جو کسی اور کے متعلق صحیح ہو یا نہ ہو ان کے متعلق بالکل صحیح تھی۔

"میرے محترم یہ تبلیغی کام در حقیقت انسان کی روح کی غذا ہے جن تعالیٰ نے اپنے فضل سے آپ کو اس غذا سے بہرہ ور فرمایا۔ اب اس کے عارضی فقدان یا کمی پر تشنگی لازمی شے ہے آپ اس سے پریشان خاطر نہ ہوں"۔

بارہا ایسا ہوا کہ کسی خوشخبری کو سن کر یا کسی ایسے آدمی سے مل کر جس کو وہ اپنی دعوت کے لئے مفید سمجھتے تھے، وہ اپنی بیماری بھول گئے طبیعت کو اتنی قوت حاصل ہوئی کہ وہ مرض پر غالب آ گئی۔ دفعتہً صحت ترقی کر گئی۔ اس کے برعکس کسی تشویش یا فکر سے ان کی صحت گر گئی۔ ان کی تمام فکریں اسی فکر میں گم ہو گئی تھیں جیسا کہ ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

"طبیعت میں سوائے تبلیغی درد کے اور خیریت ہے"۔

ان کی ذکاوت حس سب سے منتقل ہو کر اسی ایک چیز میں مرکوز ہو گئی تھی، بعض اوقات فرماتے مجھے مشغولیت کی وجہ سے بھوک کا احساس نہیں ہوتا۔ سب کے ساتھ بیٹھ جاتا ہوں یا کھانے کا وقت آ جاتا ہے تو کھا لیتا ہوں۔

تبلیغی اطلاعات کے خطوط سے ان کو وہ تقویت اور خوشی حاصل ہوتی تھی جو حقیقی عاشق کو مژدۂ وصال اور نامۂ دلبر سے ہوتی ہے، ایک کارکن کو جو کسی تبلیغ کی روداد لکھا کرتے تھے، تحریر فرماتے ہیں۔

"تمہارے خطوط کا خیال ہی گویا زندگی اور روح رواں کی جگہ ہے، میری یہ بات اگر پوری صحیح نہیں تو پوری غلط بھی نہیں، اور میں اپنے عقیدہ میں اس خیال کو جان سے زیادہ سمجھنا فرض سمجھتا ہوں، تم میرے دل کی تسلی سمجھ کر خطوط بھیجنے میں کمی مت کیا کرو"۔

مبلغین کی آمد کا انتظار عید کے چاند کے انتظار سے کم نہیں تھا، ایک کارکن کو جو ایک جماعت لانے والے تھے، لکھتے ہیں:

"جمنا کے کنارہ کنارہ جو مبلغین کی جماعت آوے گی اس کا مجھے ایسا ہی انتظار ہے جیسے عید کے چاند کا ہوتا ہے، بہت اہتمام سے اس جماعت کو لاؤ"۔

آخری علالت میں ضعف کی وجہ سے بعض مرتبہ کسی کسی خوشی کا تحمل نہ ہوتا۔ جنوری 1944ء میں جب لکھنؤ کی جماعت گئی تو ایک دن صبح کی نماز کے بعد مولانا نے مجھ سے فرمایا کہ میرے آنے کے بعد تو کانپور میں کام ختم ہو گیا ہوگا۔ (اس کی اطلاعات غالباً مولانا کو پہنچی تھیں) میں نے عرض کیا کہ لکھنؤ سے ایک جماعت گئی تھی اور الحمد للہ کام پھر شروع ہو گیا ہے۔ حاجی ولی محمد صاحب کی طرف میں نے اشارہ کیا کہ یہ بھی اس جماعت میں تھے مولانا نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھائے اور ان کے ہاتھ چوم لئے اور فرمایا کہ میرا خوشی سے مرنا ہو گیا، مجھے اب بہت خوشی بھی نہ دیجئے، مجھ میں خوشی کا تحمل نہیں رہا ہے۔

اسی طرح بعض اوقات جماعتوں کی کسی بے اصولی اور کوتاہی کا اثر ایسا پڑتا کہ بیمار ہو جاتے۔ ایک مرتبہ حاضر ہوا تو فرمایا کہ میں تو سہارنپور سے آ کر بیمار ہو گیا! میں نے عرض کیا کیا سبب ہوا؟ فرمایا ہر سے جو جماعتیں آئی تھیں انہوں نے اصول کی پابندی نہیں کی لایعنی سے احتراز نہیں کیا، اور شہر میں سیر و تفریح کرتے رہے۔

مولانا کے اس جذبہ و جوش کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباسات سے ہوگا۔

"اس کے اوپر جان و مال کو قربان اور وقف کر کے اس میں اپنی عمروں کو کھوانے والے پیدا کرنے چاہئیں، بے بس و بیکس اس میں اپنی جان کھوا دینی ضروری ہے"۔ (مکاتیب مولانا: ابوالحسن ندوی)

"ہر کوشش کو اس کے درجہ میں رکھتے ہوئے اور لا یضیع اجر المحسنین پر ایمان رکھتے ہوئے بے چون و چرا اپنے اس معاملہ میں مجنون ہونے اور کہلائے جانے کی تمنا رکھتے ہوئے ان کوششوں میں اپنے تن من کو اپنا سمجھتے تو ان کوششوں میں دنیا ہی میں جنت کا مزہ پاتے۔"

مولانا کی کیفیت یہی تھی کہ ان کوششوں میں ان کو جنت کا مزہ آتا تھا، اس راستہ میں گرم لو ان کے لئے نسیم سحری سے زیادہ خوشگوار اور فرحت بخش تھی۔ ایک مرتبہ مئی کی کسی آخری تاریخ میں مولانا، شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب، مولوی اکرام الحسن صاحب ایک کار پر قطب صاحب

گئے ہو کے سخت جھونکے آرہے تھے، مولانا نے فرمایا لو آرہی ہے، کھڑکیاں بند کردو۔ شیخ الحدیث صاحب نے فرمایا جی ہاں! اس وقت تو معلوم ہو رہی ہے۔ کوئی تبلیغی سفر ہوتا تو یہ ہوا گرم نہ معلوم ہوتی۔ فرمایا: بے شک!

اس عشق کا نتیجہ تھا کہ جب کسی میں کوئی خوبی، کمال، جودت طبع، ذہانت یا مہارت ملاحظہ فرماتے تو فوراً ذہن دین کی خدمت کی طرف منتقل ہوتا اور یہ تمنا ہوتی کہ یہ کمال یہ دولت دین کے راستے میں صرف ہوتی اور اپنا رنگ لاتی۔

حجاز سے حضرت شیخ الحدیث کے نام ایک خط میں فرماتے ہیں:

''حکیم رشید کا خط آیا، ان کے خط سے ان کی جودت طبع کو دیکھ کر بہت ہی جی چاہا کہ اللہ نے ہمارے خاندان کو کیسی مکارم اخلاق والی طبیعتیں نصیب فرمائی ہیں اور کیسا صالح معدن بنایا ہے، کاش یہ طبائع استقلال کے ساتھ جہاں کے لئے پیدا ہوئی ہیں، اس میں لگ جائیں تو اللہ چاہے دین میں سبقت کرنے والوں پر سابق ہوں جیسا مضمون میاں فراغت کی نظم پر لکھو''[1]۔

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں فرماتے ہیں کہ علالت کے زمانہ میں ایک مرتبہ پشت پر کچھ نجاست دھلانے میں خطرہ تھا کہ بدن بھیگ جائے اور سردی لگ جائے، کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ بغیر نہلائے کس طرح صفائی ہوسکتی ہے، مولوی یوسف صاحب نے لوٹے کی ٹونٹی سے اس طرح پانی بہایا کہ نجاست دور ہوگئی اور چھینٹ بھیگنے نہیں پائی، نہایت خوش ہوئے اور دعائیں دیں اور فرمایا کہ ذہانت اور سلیقہ دین کی خدمت میں صرف ہونا چاہیے''۔

درد و بے قراری:

مولانا کا سوز و درد اور بے قراری دیکھنے میں نہیں آئی جس شخص نے نہیں دیکھا وہ تصور نہیں کر سکتا بعض اوقات ماہی بے آب کی طرح تڑپتے، آہیں بھرتے اور فرماتے ''میرے اللہ میں کیا کروں کچھ ہوتا نہیں'' کبھی کبھی دین کے اس درد اور اس فکر میں بستر پر کروٹیں بدلتے اور بے چینی بڑھتی تو اٹھ کر ٹہلنے لگتے۔ ایک رات والدہ مولانا یوسف صاحب نے پوچھا کیا آخر کیا بات ہے کہ نیند نہیں آتی، فرمایا کیا بتلاؤں، اگر تم کو وہ بات معلوم ہو جائے تو جاگنے والا ایک نہ

---

[1] 29 ذی الحجہ 57 ہجری

رہے وہ دو ہو جائیں۔ بعض اوقات دیکھنے والوں کو ترس آتا اور تسکین دیتے۔ بعض مرتبہ اس جوش کے ساتھ گفتگو کرتے کہ معلوم ہوتا سینے میں تنور گرم ہے، حمیت اسلامی اور جذبات کا ایک طوفان برپا ہے، زبان ساتھ نہیں دیتی اور الفاظ مساعدت نہیں کرتے۔ بعض مرتبہ چپ ہو کر درد دل کہنے کے بعد غالب کے مشہور شعر کو بڑی لطیف ترنم کے ساتھ پڑھتے۔

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

کبھی سامعین کے اضطراب اور وحشت کا خیال کر کے خاموش ہو جاتے لیکن یہ شعر (جو حضرت مجدد نے بہت سے خطوط کے آخر میں بار بار لکھا ہے) حسب حال ہوتا۔

اندکے پیش تو گفتم غم دل ترسیدم!
کہ تو آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار است

اس کیفیت کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو ان کے زمانہ کے لوگ مجنوں کیوں کہتے تھے اور لعلک باخع نفسک الا یکونوا مومنین کی تفسیر کی یا دبہ ضرورت کیوں پیش آئی تھی۔ اس درد و بے قراری سے عہد سلف کے اولوالعزم انسانوں کے سوز و اضطراب کا اندازہ ہوتا تھا کہ دین کے انحطاط و تنزل اور اپنے زمانے کی ویرانی کا ان کو کیسا احساس تھا اور دین کی وہ کیا غیرت و حمیت تھی جس نے حضرت مجدد الف ثانی کے قلم سے یہ پُر درد شعر لکھوایا۔

آنچہ من گم کردہ ام گر از سلیمان گم شدے
ہم سلیمان ہم پری ہم اہرمن بگریستے

اور یہ الفاظ ان کے قلم سے نکلے۔ واویلاہ واحسرتاہ وامصیبتاہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو محبوب رب العالمین است اتباع او ذلیل و خوار اند و دشمنان او باعزت و اعتبار۔

مولانا پوری کوشش کے بعد بھی جب اس کام کی ضرورت اور تحریک کی حقیقت کے مقابلہ میں اس مساعی کو دیکھتے تھے جو دین کے فروغ کے سلسلہ میں اس وقت ہو رہی ہیں تو ان کو بہت ناکافی سمجھتے تھے اور ذاتی تقصیر و کوتاہی پر مواخذہ کا خوف طاری ہو جاتا تھا اور یہی ان کے درد و بے قراری کا سبب تھا۔ ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

”جس قدر اللہ تعالیٰ نے مجھ پر اس بارے میں حق کا وضوح فرمایا ہے اس کے مقابلہ

میں اپنی مساعی، اپنے درد اور اپنی آواز کی کچھ نسبت نہیں پاتا۔ چنانچہ کرم ہو تو اس کے شایانِ شان ہے اور اگر عدل ہو تو کوئی صورت نجات کی نہیں"۔

اس زمانے کے فتنوں کی تیز رفتاری، لادینیت کے سیلاب اور ملحدانہ اثرات کی طاقت کو دیکھتے اور اس کے مقابلہ میں دینی کوششوں کی سست رفتاری کو دیکھتے تو طبیعت پر افسردگی طاری ہو جاتی اور کام کی خوش کن خبریں خوش نہ کر سکتیں۔ ایک گرامی نامہ میں تحریر فرماتے ہیں:

"کئی روز ہوئے گرامی نامہ پہنچا چاہیے تھا۔ آپ دل کو بڑی زندگی اور چمن بخشنے میں میرے بزرگ، دوست، ایمان سوز، جذبات کش، نفس مطلب کی رفتار ڈاک گاڑی سے بھی زیادہ تیز ہے اور اس کا مقابل (یہ تبلیغی تحریک) جو صرف وحی ظلمت کو نور سے بدلنے والی ہے اس کی رفتار چیونٹی سے بھی زیادہ ضعیف ہے، تقدیر کی روانی دیکھ کر یہ مقدار یں کچھ بیان کے سمجھنے کے لئے کافی نہیں ہیں[1]۔

میواتی جماعتیں اور قافلے باہر نکلتے، لوگ ان کی تعداد اور ہمت دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے مگر مولانا کا پرسوز اور مضطرب دل کچھ اور چاہتا۔ آپ کی مجلس نگاہیں اور اعمال ٹٹولتیں، اگر ان کے جذبات میں ذرا بھی خامی اور ان کے پائے ثبات میں کچھ لغزش اور گھروں کو لوٹنے کا شوق و تقاضا دیکھتے تو دل بجھ جاتا اور مسرت حسرت سے بدل جاتی۔

ایک خط میں چند تبلیغی خوشخبریوں کے جواب میں لکھتے ہیں:

"(آپ کے خط میں) تبلیغ کی سرگرمیوں کا ذکر ہے، اس میں ذکر ہے کہ 80 آدمی یہاں تبلیغ کے لئے آئے اور 35 آدمیوں کی جماعت تیار ہے، پہلی خبر الحمد للہ ثم الحمد للہ، اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل و کرم و احسان اور نعمت جلیلہ ہے کہ اس نے 80 آدمیوں کی مقدار ایسے نازک زمانہ میں کہ جہاں اس عمل کو حقارت سے دیکھا جا رہا ہے اور اس کی ناقدری کی جا رہی ہے، ایسے زمانہ میں دین کے فروغ دینے کے لئے گھر سے نکلے۔ مگر میرے عزیز اللہ کا شکر بجا لانے کے بعد اپنی کوتاہی پر ندامت کے ساتھ ایک گہری نظر ڈالنی چاہیے کہ چند سالہ کوشش کے بعد تبلیغ کے یہ انوارات، یہ برکات اور عزت

---

[1] بنام مولانا عبدالغفار صاحب بھدرسی ندوی

اور یہ دنیا کے اندر تمام آوردی اور بے ہر طرح کی خود رائیت اور بیہودگی کھلی آنکھوں محسوس کرتے ہوئے پھر کل ۱۱۰ آدمیوں کی تعداد نکلی تو اتنے لاکھ مقدار میں کتنی قلیل ہے اور پھر نکل لینے کے بعد گھر واپس جانے کو ایسی بے قراری کہ ان کا تھامنا مشکل، گھر سے نکلنا تو مشکل ہے اور نکلنے کے بعد یہ ختم ہونے والا گھر اپنی طرف کھینچتا رہے تو یہ دین کا گھر کس طرح آباد ہوگا۔ جب تک گھروں پر رہنا اتنا دشوار نہ ہونے لگے جیسا اس وقت تبلیغ کے لئے نکلنا دشوار ہے اور جب تبلیغ کے لئے چار چار مہینے ملک در ملک پھرنے کو اپنی قوم میں جزو زندگی بنانے کی کوشش کے لئے پورے اہتمام کے ساتھ آپ لوگ کھڑے نہیں ہوں گے اس وقت تک تو میت کی دینداری کا مزہ نہیں چکھے گی اور حقیقی ایمان کا ذائقہ بھی نصیب نہیں ہوگا"۔[1]

وہی مکتوب الیہ کو ایک دوسرے خط میں تحریر فرماتے ہیں:

"عزیز دوست میں اس کا دکھ کیا ذکر کروں کہ سالہا سال کی کوششوں کے بعد نکلتے ہیں اور مہینوں بھی نہیں نکلتے۔ دینی کوشش کے اندر چند مہینے بھی نہیں گزار سکتے۔ میرا مقصد ہے کہ جب تک فی گھر ایک آدمی ہمیشہ باہر دین کا گھر بنانے کے اہتمام کو یعنی تبلیغ میں باری باری سے نکلنے کو لازمی نہیں کرے گا اس وقت دین کے ساتھ انس اور پائیداری پیدا نہیں ہوسکتی"۔

"عیسیٰ! تم غور کرو کہ دنیا فانی میں کام کے لئے تو گھر کے سارے افراد ہوں اور اس کے لئے صرف ایک کو کہا جاوے، اور اس پر بھی نباہ نہ ہو تو آخرت کو دنیا سے گھٹایا یا نہیں گھٹایا وہ جماعتیں جنہیں دیکھ لو کہ خط لکھے ہوئے کئی دن ہوئے وہ سب واپس ہی ہو گئے، جماعتوں کے نکلنے پر خوش نہیں ہونے پاتا کہ واپسی کی آوازیں آجاتی ہیں"۔[2]

کبھی کسی دقیق مضمون کو الفاظ میں ادا نہ کر سکتے اور جذبات کہنا چاہتے تھے، اس کے لئے الفاظ نہ ملتے تو اس سے ایک بے چینی پیدا ہو جاتی تھی۔ ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

"بندہ ناچیز اس تبلیغ کے سلسلہ میں ایک تحیر کی حالت میں ہے، اپنے میں معنوی بات

---

1 + 2 بنام میاں محمد عیسیٰ فیروز پوری مرحوم

ادا کرنے کی اہلیت بھی نہیں، عمل تو در کنار، اور عادت خداوندی یہ ہے کہ ان کی نصرت اور رحمت اسی راستہ میں ہے"۔

ایک خط میں یہ مضمون لکھاتے ہوئے کہ دین کو فروغ دینے کی کوشش میں لگنا ہی بلاؤں کو ٹال سکتا ہے اور مقاصد کو تر و تازہ کرتا ہے، اور اس طرز زندگی سے غافل ہوتے ہوئے مجبوری کا اظہار اور بلاؤں کے کم ہونے کا وہم ایک بھونا پن اور غلط خیالی ہے، بے اختیار جملہ ان الفاظ پر ختم کرتے ہیں:

"یہ مضمون لکھاتے ہوئے طبیعت بے چین ہوگئی الحمد ﷲ اسی پر اکتفا کرتا ہوں"۔

دل کی اس تپش اور حرارت کے ساتھ اور طبیعت کی اس بے چینی اور بے قراری کے ساتھ یہ انہیں کا ظرف و حوصلہ تھا کہ چلتے پھرتے بولتے بھی تھے، لوگوں کا اکرام بھی کرتے تھے اور یہ شعلہ جانسوز جس کو برسوں سے سینے میں لئے ہوئے تھے، کسی اور کام کا نہ رکھتا تو تعجب نہ تھا اور بالآخر اس کے سوز سے شمع کی طرح پگھلتے پگھلتے شب عمر سحر کردی۔

ہمچو شبنم دیدۂ گریاں شدم	تا امین آتش پنہاں شدم
شمع را سوز عیاں آموختم	خود نہاں از چشم عالم سوختم
شعلہ ہا آخر ز ہر مویم دمید	از رگ اندیشہ ام آتش چکید

جہد و مشقت:

دین کی دعوت اور تبلیغ و ہدایت کے لئے زبان و قلم سے زیادہ سے زیادہ کام لینے کا دستور بھی تھا، لیکن اس مقصد کے لئے محنت و مشقت اور دوڑ دھوپ کو زیادہ اہمیت دینا اور اس کی مقدار کو زبان و قلم کی حرکت کی مقدار سے بڑھانے کو ضروری سمجھنا اس زمانہ میں مولانا کا امتیاز تھا اور اللہ تعالی نے یہ علم آپ کے قلب میں بڑی قوت سے منکشف کیا تھا۔ آپ اپنے رفقاء کو اس اصول پر مضبوطی سے قائم رہنے کے لئے ہدایتیں فرماتے تھے، خود دعائیں کرتے تھے اور اللہ کے مقبول بندوں سے اس مقصد کے لئے دعائیں کرانا چاہتے تھے، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کو ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

"میں بہت ہی دل و ایمان سے متمنی ہوں کہ بہت ہی اہتمام کے ساتھ ہمت کو لگا کر یہ دعا کریں کہ میری یہ تحریک سراسر عمل ہو، اقوال کی کثرت اس کے عمل کو مکدر نہ کرے

بلکہ قول اور تقریر قدر ضرورت اور امانت کے درجہ میں رہے۔ و ما ذلک علی اللہ بعزیز فرمایا کرتے تھے کہ "دین کے فروغ کے لئے جان دینے کے شوق کا زندہ کرنا اور جان کو بے قیمت کر دینا ہماری تحریک کا مقصود اور خلاصہ ہے۔ طبعی ضعف اور لاغری کے باوجود آپ نے ابتداء سے میوات کے دوروں اور تبلیغ کے سفروں میں ایسی محنت کی جو اچھے جفاکش اور توانا آدمیوں کے لئے مشکل ہے۔ اپنے مقصد کے پیچھے اپنا آرام، کھانا پینا بھول جاتے تھے۔ خلاف عادت 24...24 میل پیدل چلے، خلاف طبیعت کھانا کھایا اور کئی کئی وقت بھوکے رہے، کبھی کھانا موجود ہونے کے باوجود بھی 38،36 اور 48،48 گھنٹے کھانا کھانے کی نوبت نہ آئی۔ کئی بار ایسا ہوا کہ جمعہ کی شب کو یا جمعہ کی صبح کو نظام الدین سے کھانا کھا کر روانہ ہوئے اور اتوار کو نظام الدین واپس آ کر کھانا کھایا، راتوں کو جاگے، پہاڑیاں عبور کیں، دشوار سے دشوار گزار راستے طے کئے۔ مئی، جون کی تپتی لو، اور پھر میوات کے ریگستانی علاقہ کی گرم لو کے جھونکے اور دسمبر، جنوری میں کھلے میدان کی ہوا کے سرد جھونکے یکساں برداشت کئے اور ساتھیوں سے یہ کہہ کر ان کا دل بڑھاتے رہے کہ "جتنی جہد (محنت و تکلیف) کے برتی طرف خدا ہے جس کا جی چاہے مل لے"۔

بعض اوقات میں میوات کا سفر گرمی کی ایسی شدت اور صحت کی ایسی کمزوری کی حالت میں کیا ہے کہ زندگی کا اطمینان کم اور موت کا خطرہ زیادہ تھا مگر راہ خدا کے اس سفر کو سفر جہاد اور میوات کی زمین کو میدان کارزار سمجھتے ہوئے تکالیف و خطرات سے بے پرواہ ہو کر قدم اٹھایا۔

16 مئی 36ء کو ایک سفر میوات کے موقع پر شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب دامت برکاتہم اور مولانا محمد یوسف صاحب کو تحریر فرمایا:

"اس قدر ضعف ہے کہ خلاف طبع ابھی ہوئی بات سے اختلاج اور نقصان ہوتا ہے اور آرام کے ساتھ موٹر سے دہلی تک کی سواری سے بخار آتا ہے۔ اس پر بحمد للہ ثم الحمد للہ ایک مہینہ کی مسافت کے لئے میوات کی سخت ترین بادسموم اور نہایت جلا دینے والی لو میں کے الجھاؤ کا نشانہ بن کر موت کے لئے اپنی جان کو پیش کرنے کی نیت سے اس سفر کو کارزار کا میدان تصور کرتے ہوئے مصمم ارادہ سفر ہے گویا یہ سفر جہاد ہے مگر اپنے

ضعف سے اور اپنی مجربہ کم ہمتی سے نہایت خوف ہے۔ کسی جگہ یہ نفس شریر کرب و شدائد کے مقابلہ سے فرار کر کے نامرادی سے واپس ہوگا۔ دعا کرو کہ جان کے جانے تک تحمل میں حق تعالیٰ شانہ شدائد و کرب کا نصیب کریں۔ وما ذلك على الله بعزیز۔ اور یا کام کو پورا کر کے سلامتی کے ساتھ بغنیمت عود نصیب فرمائیں۔ اپنے اس سفر کو، اہم فریضہ اور صحت کی رعایت کو سنگین ترین معصیت سمجھ کر اپنی زندگی سے مایوس ہو کر سفر کر رہا ہوں"۔

گلناج پور میں پہاڑ کی چڑھائی تھی۔ بیل گاڑی کا سفر تھا۔ گاڑی راستہ میں الٹ گئی۔ لوگوں کو چوٹ آئی۔ خدا خدا کر کے لوگ اوپر پہنچے لیکن نہایت خستہ گرد آلود، بعض وہ علماء بھی ساتھ تھے جو تکلیفوں کے عادی نہیں تھے، لیکن قبل اس کے کہ لوگ تکان اور تکلیف اور خستگی کی شکایت کریں مولانا نے یہ کہہ کر ان کی طبیعت کا رخ بدل دیا کہ دوستو! ساری عمر میں آج ایک دن تم کو جو ذرا کی چڑھائی پیش آگئی بتاؤ وہ رسول اللہ ﷺ کو کتنی بار پیش آئی تھی، ہمیں اپنی اس محرومی اور کوتاہی پر شرمندہ ہونا چاہئے۔ اب کون تھا کہ حرف شکایت زبان پر لاتا۔

مولانا جب کسی کام کا عزم فرما لیتے تو پھر کسی زحمت کا خیال مانع نہیں ہوتا تھا۔ مولانا کے نزدیک دنیا کی بہت تھوڑی چیزیں ناممکن تھیں۔ یاس و ناامیدی کا ان کے یہاں بہت کم گزر تھا، جس بات کا خیال آتا تو فوراً ارادہ فرما لیتے۔ ایسا ہوا کہ نوح کے لوگوں سے کوئی بات کہنا ضروری معلوم ہوئی۔ رات کے چار بجے نظام الدین سے پیدل روانہ ہوئے، دہلی میں حاجی نسیم صاحب کے یہاں پہنچ کر کار لی اور سحر کے وقت نوح پہنچے۔ سب کو سوتا پایا

مقصود و مدعا کہا پھر فجر کی نماز پڑھتے ہی واپس آگئے۔ کبھی ایسا ہوا کہ بارش کا پانی جمع ہے اور سڑک پر نالہ بہہ رہا ہے، میوات کا سفر ہے، کسی مقام کا قصد فرمایا۔ لوگوں نے کہا تانگہ لے آئیں، فرمایا ضرورت نہیں، اور گھٹنوں گھٹنوں پانی میں چل دیئے۔

مولانا محمد منظور صاحب نعمانی نے بالکل صحیح لکھا ہے:

"جسمانی لحاظ سے اگرچہ نہایت ضعیف و ناتواں تھے مگر اس مقدس مقصد کے لئے ایسی ان تھک اور اس قدر بے پناہ جدوجہد کر کے دکھا گئے کہ میرا اندازہ ہے کہ اگر بالفرض کسی شخص کے سامنے جنت اپنی ساری نعمتوں اور دلفریبیوں کے ساتھ اور جہنم اپنی

ساری ہولناکیوں سمیت منکشف کردی جائے اور ان سے کہا جائے کہ یہ کام کرو گے تو
یہ جنت ملے گی اور نہیں کرو گے تو اس جہنم میں ڈالے جاؤ گے تو شاید اس کی سعی و
جہد اس سے زیادہ نہ ہو سکے گی جو مولانا محمد الیاسؒ کی بالخصوص آخری زمانہ میں تھی"۔

(میری زندگی کے تجربات از مولانا محمد منظور صاحب نعمانی)

اس کے باوجود رفقاء کی راحت و عافیت کا بہت اہتمام فرماتے، ان کو خواہ مخواہ تکلیف میں نہ ڈالتے، ان کے لئے ضروری راحت کی تدبیریں سوچتے اور اس کا سامان بڑی کوشش سے بہم پہنچاتے لیکن ان کو جدوجہد کے لئے تیار کرتے۔

ایک مرتبہ میوات کے ایک سفر میں چند رفیقوں سے جو آپ کے بعد میوات میں کچھ دن رہنے والے تھے فرمایا کہ آپ جہد کی کوشش کیجئے گا اور میواتی رفقاء سے فرمایا آپ ان کو راحت پہنچانے کی کوشش کیجئے گا، پھر ان مہمانوں سے فرمایا اگر آپ کے جسم کو صرف راحت آئی تو آپ ہارے۔ خود بھی اللہ کے دیئے ہوئے سامان راحت کو نہ ٹھکراتے اور اس کی ناقدری نہ کرتے بلکہ اللہ کا عطیہ اور نعمت سمجھتے، اپنے لئے نہ اس کی فکر میں رہتے نہ ملتا ہوا رد کرتے۔

لا یتکلف غائباً و لا یرد موجوداً اصول تھا۔

طبیعت میں خواہ مخواہ کی مشکل پسندی اور دشوار طلبی نہ تھی، البتہ دین کے لئے حوصلوں کے بلند کرنے کی ترغیب دیتے رہتے۔ میواتی مبلغین کو باہر جاتے ہوئے وصیت فرماتے کہ اپنی سادگی اور جفاکشی کی خو نہ چھوڑیں کہ یہاں کا جوہر ہے اور شہریوں کی راحت پسندی اور تکلفات کو اختیار نہ کریں کہ یہاں کا بڑا فرض ہے، سادہ کھانا کھائیں، زمین پر سوئیں اور مشقت برداشت کرنے کے عادی رہیں، اس سے ڈرتے رہتے تھے کہ یہ شہروں میں جا کر شہریوں کے عادات و اطوار اختیار نہ کرلیں اور ان کی پر راحت اور پر تکلف زندگی کا ان کو چسکا نہ لگ جائے۔

مولانا فرماتے تھے کہ انسان کے لئے مشقت فطری امر ہے لقد خلقنا الانسان فی کبد اگر وہ دین کے کام میں مشقت نہ برداشت کرے گا تو دنیا کے بے ثواب کاموں میں مشقت کرے گا جیسا کہ اس وقت ہو رہا ہے۔ جہاں دنیا اپنے موہوم مقاصد کے لئے اور دنیاوی زندگی کی حقیر چیزوں کے لئے جان توڑ کوششیں کر رہی ہے وہاں دین جیسی قیمتی اور ثواب آخرت جیسی قیمتی چیز کے لئے تھوڑی سی تکلیف برداشت کر لینا کیا وقعت رکھتا ہے، ایک صاحب کو بیماری کے متعلق

فرمایا:

"ایسے زمانہ میں کہ رونقوں کے واسطے چیزیں جا رہی ہوں دین کی کوشش میں خسارہ کا آجانا کچھ بڑی بات نہیں"۔

ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

"دنیاوی معیشت کے اندر کے اسباب کی کوشش اور سعی کو جب تک دین کے درست کرنے والی چیزوں میں کوششوں اور سعی سے مغلوب نہیں کیا جاوے گا اس وقت تک غیرت خداوندی دین کی دولت سے مالا مال نہیں کر سکتی۔ (مکتوب بنام [illegible])

ایک دوسرے مکتوب میں ارشاد فرماتے ہیں:

"عادات خداوندی عموماً دین میں اپنی جہد کی مقدار کے ساتھ وابستہ ہیں۔ آدمی کسی مقصد کے لئے جتنا اپنے آپ کو ذلیل کرتا ہے اور تکالیف کو جھیلنے کے ذریعہ اپنے حالات، جوارح، قلب اور قوتوں کی شکستگی اور تعب وانکسار کو پہنچتا ہے اتنی ہی حق تعالیٰ کی رحمت کے نزول کا سبب ہوتا ہے"۔

"انا عند المنکسرۃ قلوبھم" "والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا"۔

(کسی راہ کی ذلت اٹھائے بغیر اس کی عزت کو پہنچنا عادتاً ہوتا نہیں)

لیکن اس زمانہ کے بعد اور اہل زمانہ کی پست ہمتی کو دیکھتے ہوئے اگر کوئی اس راستہ میں ایک قدم بھی اٹھاتا تو اس کی بڑی قدر فرماتے اور کوئی اس راستہ میں ذرا سی بھی تکلیف گوارا کرتا تو اس کو بہت محسوس کرتے اور شکر گزار ہوتے۔ احسان مندی اور قدر افزائی کا یہی شیوہ تھا جس سے پست ہمت اور تن آسان رفقاء کار کے حوصلے بھی بلند تھے اور وہ [illegible] اس راستے پر چلتے جا رہے تھے۔ اس نیاز مندی کو اس کی ایک مثال میں (جو ایک تبلیغی سفر میں پیش آئی تھی) تحریر فرماتے ہیں:

"میرا تو جی چاہتا ہے اس پر مبارکباد دوں کہ اس چودھویں صدی میں تحقیقی جہد فی سبیل اللہ والا سفر مرض کا سبب ہوا۔

هل انت الا اصبع دميت

وفي سبيل الله ما لقيت

صورۃً بیماری اس سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی کہ دنیا میں جیسے ہزاروں کو بخار آتے ہیں ایک آپ کو بھی آگیا۔ لیکن یہ بخار اس نسبت سے روئے زمین پر غالباً ممتاز ہوگا کہ بظاہر اس کا سبب ایک ایسی چیز کے لئے قدم اٹھانا ہے کہ وہ طرز زندگی اگر رائج ہو جائے اور جا میں جا کر بھی یہ راستہ کھل جائے تو اُمت محمدیؐ کے نہایت مشغول رہنے والیا ور اپنے مشاغل سے فارغ نہ ہو سکنے والے افرادو کورشدو ہدایت سے پورا پورا حصہ ملنے کا مردہ طریق زندہ اور پائیدار ہو جائے گا۔

ایک دوسرے گرامی نامہ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

''جس مذہب کے لئے ہزاروں جانوں کا طیب خاطر سے پیش کر دینا اس کی قیمت کیلئے کافی نہیں ہو سکتا اور جس مذہب کی اصل قیمت سوزش جگر اور خون دیدہ بہانا تھی اس کے لئے ہمارا برائے نام قدموں کا اُٹھانا اور اس قدر ضعیف اور کم مقدار اپنی محنتوں کا وابستہ رکھنا اصلی طریقہ سے کچھ نسبت نہیں رکھتا، لیکن خدائے پاک کی ذرہ نوازی اور مراحم خسروانہ اور اس اخیر زمانہ کے لئے ان کی مساعی پر صحابہ کے پچاس کے برابر اجرو ثواب کے ملنے کی خوش خبریاں اور سچے وعدے اور لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا کی جیسی بشارتیں ہماری ان مساعی کے بارے میں بڑی اُمید دلا رہی ہیں''۔

تحریص اور تالیف قلب دونوں کے مولانا نے جمع کر رکھا تھا، تحریض و دعوت کے وقت انتہائی بات فرماتے، لیکن کم سے کم عمل کو بھی شکریہ کے ساتھ قبول فرما لیتے اور اس کی انتہائی قدر دانی فرماتے مگر سامنے بلند منتہا ہی رکھتے جس کو دیکھ دیکھ کر عمل کرنے والا اپنے عمل پر اترا نہ سکتا اور اس کو کمال نہ سمجھتا۔

علو ہمت:

مولانا کی زندگی کا خاص جوہر اور ان کی امتیازی صفت بلند ہمتی اور عالی حوصلگی تھی جس کی شہادت ان کی پوری زندگی، ان کے خطوط اور ان کے ارشادات ہیں، انہوں نے جس کام کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا تھا اور جس کی دعوت دی تھی وہ ان کے ماحول سے بالکل مناسبت نہیں رکھتا تھا اور اس زمانہ اور گردوپیش کی سطح سے بہت بلند تھا، اس لئے بلند عزائم اور اپنے دلی حوصلوں کا اظہار بہت کرتے تھے۔

پر عمل تھا۔ پھر بھی کبھی کبھی اس کا ترشح ہو جاتا۔ ایک مرتبہ عزیز مولوی ظہیر الحسن صاحب ایم اے علیگ سے فرمایا جو ایک وسیع النظر عالم ہیں۔

''ظہیر الحسن میرا مدعا کوئی پاتا نہیں، لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ تحریک صلاۃ ہے، میں قسم سے کہتا ہوں کہ ہرگز تحریک صلاۃ نہیں''۔

ایک روز بڑی حسرت سے فرمایا ''میاں اظہر الحسن ایک نئی قوم پیدا کرنی ہے''۔

مولانا دین کی اس دعوت کو ایک وقتی اور ہنگامی تحریک نہیں سمجھتے تھے اور اپنی عالی ہمتی اور بلند حوصلگی سے اس پر بھی قانع نہیں تھے کہ دو چار صدیوں تک اس کا اثر رہے، وہ اس کے ایک لازوال تجدید دین ہونے کی اللہ سے تمنا رکھتے تھے۔ ان کی اس بلند ہمتی کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباس سے ہوگا:

خاکسار کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''گرامی نامہ عالی ہمت بہت خوشیوں کو لئے ہوئے آرائش مجلس ہوا، لیکن خبروں کو اللہ تعالیٰ واقعات پر منتج فرمادیں اور ان خبروں اور واقعات کو اپنی اس قدرت سے کہ جس پر تن تنہا بلا کسی سہارے کے یہ ساتوں زمین اور آسمان تھمے ہوئے ہیں اپنے فضل سے اور رحمت سے اپنی ذاتی قدرت کے ساتھ ایسا پائیدار بنادیں کہ یہ تحریک مدتوں چلنے والی ہو۔ یہ محض ایک ابال اور سطحی نہ رہے کہ جو دو چار صدیوں میں ختم ہو جائے۔ بنا کے مستحکم ہونے کی بہت ہی دعا فرماتے رہیں''۔

منشی نصر اللہ صاحب راوی ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے عرض کیا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ آپ مجدد وقت ہیں، فرمایا تم سے کون کہتا ہے' میں نے کہا لوگوں میں چرچا ہے! فرمایا نہیں میری جماعت مجدد ہے۔ (یعنی اس دور کے علماء و صالحین کی وہ جماعت جس سے مولانا کا تعلق تھا)

مولانا کی آرزو تھی کہ اس تحریک دعوت میں کوئی ایسی چیز نہ ہو جس کی وجہ سے وہ ان کی ذات اور ان کے دور کے ساتھ مخصوص سمجھ لی جائے اور ان کے بعد عام مسلمانوں کو اس میں جدوجہد کرنے کی ہمت نہ ہو، اسی بناء پر اس کی نسبت اپنی طرف پسند نہیں کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ یہ مسلمانوں کی عمومی اور مشترک دعوت ہو جو ان کے ساتھ مخصوص نہ سمجھی جائے، اس لئے تمام علماء کو اس میں شرکت کی دعوت دیتے تھے، تا کہ وہ صرف انہیں کی تحریک نہ کہلائے۔ اسی سلسلہ کی یہ

بات ہے کہ ایک مرتبہ فرمایا کہ میں نے اللہ سے دعا کی ہے کہ ہماری یہ تحریک کراماتوں سے نہ چلے۔ ایک صاحب کے استفسار پر ایک رفیق نے اس کی مصلحت بتلاتے ہوئے عرض کیا" تا کہ لوگوں کو ہر زمانہ میں اس کو چلانے کی ہمت ہو اور اس میں جدوجہد کریں۔ اگر کراماتوں سے چلے گی تو لوگ ایک ذات اور ایک دور کی خصوصیت سمجھ لیں گے، مولانا نے اس کی تصویب فرمائی۔

مولانا کے نزدیک چند آدمیوں کا تبلیغ اور علم دین حاصل کرنے کے لئے گھر سے باہر نکلنا اور شہر شہر پھرنا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ ان کی ہمت تو چاہتی تھی کہ:

"کاش ایسا وقت ہو جائے کہ قوم کے لاکھوں باہر گئے ہوں، قوم کے لاکھوں آدمیوں کا باہر پھرتے رہنا جزو زندگی بنا دیا جائے[1]"۔

ان کے نزدیک میوات کے اخلاق و عادات کا بدل جانا کافی نہ تھا، وہ ملک کی زبان تک بدل دینا چاہتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ سارے ملک میوات کی زبان عربی ہو جائے اور ان کے نزدیک اللہ کی مدد اور انسان کی (اللہ کی توفیق سے) کوشش کے سامنے دنیا کی کوئی چیز بھی ناممکن نہ تھی۔ ان کی خواہش تھی کہ کم از کم عربی مدارس کے حلقہ میں ضرور عربی زبان کا احیاء ہو۔ خاکسار کے نام ایک گرامی نامہ میں تحریر ہے۔

"بندہ ناچیز کے دماغ میں کچھ ایسے ایسے خیالات ہیں کہ قبل از وقت ہونے کی بناء پر زبان سے نکالتے کو جی نہیں چاہتا۔ اگر اس زمانہ تبلیغ میں طلبہ کی باہمی تکلم کے عربی ہونے سے لازمی ہونے کا اہتمام اور التزام ہو سکتا ہو تو اس پر بھی نظر غائر فرمالیں"۔

اور جب ان کی اطلاع دی گئی کہ اس پر عمل ہوا تو نہایت مسرور ہو کر تحریر فرمایا:۔

"زبان عربی کے احیاء سنت سے مسرت ہوئی، حق تعالیٰ دیگر اہل مدارس کی توجہ کے میلان کا ذریعہ بنائیں"۔

مولانا کی ہمت عالی اس کام کو صرف ہندوستان کے حدود کے اندر محصور و محدود دیکھنے پر راضی نہ تھی، وہ اپنے ذہن میں اس پیغام اور نظام عمل کو ساری دنیا میں اور بالخصوص تمام ممالک اسلامیہ اور بالخصوص ممالک عربیہ میں پہنچانے کا پورا نقشہ رکھتے تھے اور کبھی کبھی اس آرزو کا بڑے جوش اور

---

[1] (بنام میاں محمد عیسیٰ (فیروز پور نمک)

درد سے اظہار کرتے تھے، ان کے اس کام کے سلسلے میں اس کے اثرات برکات اور نتائج کے متعلق بڑے بڑے حوصلے اور خیالات تھے۔ ان کے یہاں ناممکنات ومحالات کی فہرست اتنی طویل نہ تھی جتنی کوتاہ ہمت فرضی طور پر بنا لیتے ہیں۔ وہ دل کھول کر پورے وثوق اور یقین کے ساتھ کوشش کرتے اور دل کھول کر پورے وثوق اور یقین کے ساتھ اللہ سے مانگتے اور کسی چیز کو بھی اس کی رحمت، قدرت اور نصرت سے بعید نہ سمجھتے۔ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کو ایک خط میں بڑے جذبہ اور درد سے لکھتے ہیں:

"بہت لجاحت اور عزم کے ساتھ میں آپ پر اللہ اور رسول کا واسطہ دے کر عرض کرتا ہوں کہ اس امر کے ساتھ اس کے دشوار ہونے اور ناممکن الوجود ہونے کا خیال کو بہ نظر انا عند ظن عبدی بی اور بہ نظر قدرت الٰہیہ نہایت سہولت کے ساتھ ہونے والی چیز کے ہونے کے خیال سے اپنے اس خیال کو ضرور بالضرور بدل دیجئے۔ میرے دوستو! اللہ اور زمانہ اور خالق اور مخلوق کے درمیان دائر ہونے والے امر میں خالق کی قدرت پر نظر کرنے کے بجائے زمانہ پر نظر کرنا اور ہاتھ توڑ کر بیٹھ رہنے والے اسباب پر نظر کر کے ہمت بڑھانے والے خطابات خداوندانہ پر نظر نہ کرنا اولوالابصار کی بصیرت کے شایان شان نہیں ہے۔ خدائے قدوس جل مجدہ کے قوانین ازلیہ بہ بانگ دہل صدائے بلند دے رہے ہیں کہ اللہ سے جو کچھ مانگو گے اور جس چیز کی اُمید کرو گے وہی حاصل ہوگا، پھر کیوں نہ تم جیسے فہیم جذبات محمدیہؐ کے اوپر نظر لڑا کر دربار خداوندیہ میں اڑ بیٹھو۔

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ تو سمجھے خدا کرے کوئی

"مجھے اپنے غلبہ جنون میں آسمان منزلت بزرگوں کے منصب بھی نظر میں نہیں رہتے۔ اُمید ہے کہ عفو کو کار فرما کر دعائے خیر سے امداد فرمائیں گے"۔

لیکن جو ہمت اور وسعت نظر بادشاہوں اور فاتحین کے یہاں مورخین کی زبان "میں عزم ملوکانہ" اور "ہمت جہاں کشا" کے الفاظ سے تعبیر کی جاتی ہے، افسوس ایک درویش بے نوا کے یہاں جذب وحال کہہ کر اس کی اہمیت گھٹا دی جاتی ہے

؎ چوں نہ دیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

دینی حمیت:

مولانا کی فطرت میں دین کی حمیت وغیرت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ ان کی اس دعوت میں ایک بڑی محرک طاقت اور ان کے اس سوز و دردمندی اور بے قراری کی ایک بڑی وجہ جو ان کو کسی کل اور کسی پل چین نہیں لینے دیتی۔ دین کا یہی بڑھتا ہوا تنزل وانحطاط اور کفر کا روز افزوں غلبہ و اقتدار تھا جس کو ان کی حساس اور بیدار فطرت اور ان کا غیور مزاج ایک لمحہ کے لئے برداشت نہیں کر سکتا تھا، مگر اللہ کی توفیق اور دین کی گہری نظر کی بنا پر انہوں نے دین کے کام کی جو ترتیب اپنے ذہن میں قائم کر لی تھی اس میں کسی فوری تاثر اور جذبہ کی وجہ سے وہ ترمیم اور تغیر نہیں کرنا چاہتے تھے اور اپنی عالی ظرفی اور خداداد ضبط و تحمل سے دوسری چیزوں کو اس طرح برداشت کرتے تھے گویا ان کو اس کی طرف توجہ ہی نہیں یا ان کا سرے سے علم ہی نہیں، لیکن کبھی کبھی پیمانہ ضبط سے کچھ قطرے چھلک کر گرتے اور دل کی انگیٹھی کے کچھ شرارے بھڑک کر اڑتے تو پاس والوں کو بھی محسوس ہوتا کہ دینی حمیت کے کس طوفان کو مولانا نے دل کے کوزہ میں بند کر رکھا ہے۔

ایک دن خاکسار راقم نے لال قلعہ کے پاس گزرتے ہوئے پوچھا کہ کبھی جناب نے لال قلعہ بھی دیکھا ہے؟ فرمایا میں لال قلعہ کی سیر کو بے غیرتی سمجھتا ہوں، ہاں میں نے بچپن میں اس وقت دیکھا ہے جب دکھانے والے رو رو کر دکھایا کرتے تھے۔

غیر مسلم اہل شوکت کے مقامات و مرکزوں کے متعلق فرماتے تھے کہ اگر کوئی شخص ان جگہوں سے قنوت نازلہ پڑھے بغیر گزرے تو سلب ایمان کا خطرہ ہے۔

مولانا کو سرکاری یونیورسٹیوں کے مشرقی امتحانات سے بڑی کوفت تھی، فرماتے تھے کہ اس سے نسبت بدل جاتی ہے یعنی علم دین کا تعلق اللہ کے بجائے دنیا اور مادیت سے قائم ہو جاتا ہے اور برکت اور نورانیت ختم ہو جاتی ہے۔

مولانا پر بہت گراں تھا کہ عربی زبان اور دینی علوم میں بھی مسلمان غیروں کے دست نگر اور ماتحت ہوں، غالباً مولانا حافظ عبداللطیف صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"حافظ صاحب مجھے بڑی غیرت آتی ہے کہ مسلمانوں کی عربیت کی جانچ کرنے والے کفار ہوں"۔

مولانا اپنے بعض نامور معاصرین کو جو اشداء علی الکفار کا مظہر ہیں، البغض للہ کے فن کا امام سمجھتے تھے، ان کی فضیلت کے قائل تھے اور فرماتے تھے کہ یہ چیز ان سے سیکھنے کی ہے۔

کسی حکم شرعی کو نہ ماننا یا احکام شریعت میں سے کسی کو معیوب سمجھنا مولانا کی برداشت سے باہر تھا، بے اختیار ان کی رگ صدیقی اس دینی قطع و برید پر حرکت میں آجاتی [1] اور بعض اوقات کوئی مصلحت اس کے انکار و مذمت سے مانع نہ ہوتی۔

مولانا عبداللطیف صاحب ناظم مدرسہ مظاہر العلوم کو ایک ایسے ہی موقع پر میوات کے لئے تحریر فرماتے ہیں:

"زیادہ زور اس بات پر دیا جائے کہ قوم اپنی پنچائتیں اور سب کاروبار اور سب فیصلے شریعت کے موافق کرنے ہی کو اسلام سمجھے، ورنہ اسلام نہایت ناقص ہے بلکہ بسا اوقات احکام شرعیہ کے بے وقعتی اور بے رخی اور توہین کی بدولت اسلام جاتا رہتا ہے اور یقیناً کفر ہو جاتا ہے"۔ اسی میں سے باہمی نکاح کا استنکاف [2] ہے جس کو پہلے تو سنا ہے کہ حرام اور کفر سمجھتے تھے۔ اب زبان سے تو حلال اور جائز کہتے ہیں کہ مگر معاملہ وہی ہے چنانچہ موضع اٹا اور تحصیل نوح کے ایک مرد و عورت نے باہمی راضی رضا ہو کر اس خیال سے کہ اگر یہاں نکاح ہو گیا تو قوم سخت ستا دے گی ملک سے نکل کر نکاح کر لیا اور ضلع گوڑگانواں میں بود و باش اختیار کر لی تھی مگر افسوس کہ جاہل قوم نے دولہا کو (جس کا نکاح رمضان المبارک کے اخیر جمعہ کو ہوا تھا) عید کے تیسرے دن جمعہ کے روز قتل کر کے ہاتھ پیر توڑ کر مٹی کے تیل سے جل کر راکھ کو دریا میں بہا دیا۔ یہ مضمون بہت زور سے بیان کرنے کے قابل ہے کہ کفر و شرک کو زنا اور کسی اکبر الکبائر کو ایسا معیوب اور قبیح نہ سمجھیں اور اللہ کے حلال کردہ کو اس قدر معیوب سمجھیں۔ آپ ضرور بیان

---

[1] (حضرت ابوبکر صدیقؓ کے اس جملہ کی طرف اشارہ ہے جو انہوں مانعین زکوٰۃ کے لئے فرمایا تھا: اینقص الدین و انا حی کیا میرے جیتے جی دین میں قطع و برید ہو سکتی ہے۔ مولانا نسباً صدیقی تھے۔ اس موقع پر حضرت مجددؒ کا جملہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے" بے اختیار رگ فاروقیم در حرکت می آید")

[2] معیوب سمجھنا اور اس سے عار آنا

فرمادیں کہ کس طرح ایمان ان کا باقی رہا اور کیا شکل ان کے ایمان کے باقی رہنے کی ہوسکتی ہے"۔

اسی دینی حمیت کی بناء پر آپ نے ابتداء میں حکومت کی جبری تعلیم کی سخت مخالفت کی اور علماء کو اس طرف متوجہ کیا۔ شدھی سنگھٹن کے زمانہ میں تحریک ارتداد کی طرف پوری طرح متوجہ ہوئے اور وہ میوات میں کامیاب نہیں ہونے پائی۔

اتباعِ سنت:

مولانا کو اتباعِ سنت کا جیسا اہتمام تھا، اس کی نظیر اس زمانہ میں ملنی مشکل ہے۔ ان کے اس اہتمام و التزام سے ائمہ سلف کی یاد تازہ ہوتی تھی۔ چھوٹی چھوٹی سنتوں کی تلاش اور تتبع، پھر ان کی پابندی اور اشاعت کا شوق چھوٹی چھوٹی اور جزئی سنتوں کو بھی عملاً بڑا اور اہم سمجھنا مولانا کا طبعی ذوق تھا۔ آخری دن جو زندگی کا مصروف ترین دن ہوتا ہے شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کو بلا کر بڑے اہتمام سے فرمایا کہ میں تم کو وصیت کرتا ہوں کہ احادیث سے حضور ﷺ کے واقعات و عادات و اخلاق کا تتبع کر کے ان کے پھیلانے کی جتنی سعی کر سکتے ہو کرتے رہیو۔

بعض خدام جو حاضر نہیں تھے حاجی عبدالرحمن صاحب کے ذریعہ ان کو وصیت فرمائی اور ان کے نام پیغام چھوڑا جس میں سب سے زیادہ تاکید اتباعِ سنت کی تھی اور یہ فقہاء کی اصطلاحیں اور تقسیم برحق اور بجائے خود صحیح ہے مگر آپ ﷺ سے جس چیز کی نسبت ہو اس کو عملاً ضروری سمجھنا چاہیے۔

محبت و اتباع کے غلبہ نے عبادات کے علاوہ عام عادات پر بھی اثر کیا تھا۔ عادات و جبلی امور میں آپ ﷺ سے مشابہت کو ان کا جی چاہتا تھا، مرض وفات کے درمیانی زمانہ میں وہ آدمیوں کی مدد سے مسجد میں نماز کے لئے آتے جاتے تھے، اس میں بھی وہی مسنون کیفیت ہو جو آنحضرت ﷺ کے مرض وفات میں مسجد میں آنے کی احادیث میں بیان کی گئی ہے۔

دو آدمیوں کے سہارے تشریف لاتے اور پاؤں پر زور نہیں دے سکتے تھے کبھی کہ اس کے خلاف کیفیت ہوتی تو گرانی ہوتی[1]۔

اتباعِ سنت کا ایک دقیق ایک نہایت لطیف اور بلند درجہ یہ ہے کہ عام انسانی حالات و حوادث

[1] (روایت قاری سید رضا حسن صاحب)

سے حدود شریعت کے اندر طبعی طور پر متاثر ہوا جائے۔ آنحضرت ﷺ کو ان واقعات پر جو بشری طور پر رنج وحزن کا باعث ہیں طبعی طور پر حزن بھی ہوتا تھا اور سرور کے مواقع پر سرور شکر کی کیفیت بھی پیدا ہوتی تھی۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ سلوک وتصوف اور کمال وترقی یہ ہے کہ انسانی احساسات اور بشری تاثرات وکیفیات سے انسان بالکل آزاد ہو جائے، نہ اس پر کبھی حزن طاری ہو نہ کوئی چیز سرور پیدا کر سکے۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ نے ایک کامل بزرگ کے اس واقعہ پر تنقید کی ہے کہ جب ان کو فرزند کے انتقال کی خبر دی گئی تو انہوں نے بہت بے اعتنائی کے ساتھ اپنے عدم تاثر کا اظہار کیا اور ذرا بھی رنج کا اظہار نہیں کیا، مجدد صاحبؒ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے فرزند حضرت ابراہیم کا انتقال ہوا تو آپ ﷺ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ سنے گئے۔

تدمع العين و يحزن القلب	آنکھوں میں نمی ہے، دل میں غم ہے، مگر
نقول الا ما يرضى ربنا	زبان سے وہی نکلے گا جو ہمارے رب کو
وانا بك يا ابراهيم	پسند ہے اور ہمیں اے ابراہیم تمہارا بہت ہی
لمحزونون	رنج ہے

غالباً مولانا کی نظر سے مجدد صاحب کی یہ تنقید کبھی نہیں گزری ہوگی، لیکن ایک بچے کے حادثہ پر اس کے والد کو بالکل یہی مضمون لکھا جو کمال اتباع، فہم شریعت اور تحقیق کا نتیجہ ہے۔

"آپ نے یوسف کو تحریر لکھی اس سے آپ کے رنج کا نہ ہونا ٹپکتا ہے، یہ شرعاً منکر ہے۔ رنج کی باتوں سے واقعی رنجیدہ ہونا یہ انشاء اللہ تمہیں ضرور ہوگا، لیکن رنج سے متاثر ہونے کا اظہار بھی ضروری ہے۔ حق تعالیٰ جیسے تاثرات بھیجیں، ان کے مناسب تاثر اور اس کا اظہار آپ بھی خوب سمجھتے ہیں ضروری ہے"۔

اس طرح ایک بچے کی ولادت کے موقع پر انہی بزرگ عالم کو لکھوایا:

"یہ حق تعالیٰ شانہ کی نعمت عظمیٰ ہے جس پر دل سے خوش ہونا چاہیے اور اگر حقیقی اور قلبی خوشی نہ ہو تو کم سے کم اظہار خوشی، اگر مصنوعی ہو ہونی چاہیے اور شکرانہ میں بطور خوشی آنا چاہیے"۔

حلم و بردباری:

حد درجہ کی ذکاوت حس و لطافت حس کے باوجود بڑے ضابط و حلیم تھے۔ اپنے مذاق اور مقصد کے خلاف سننا اور دیکھنا ان کے لئے بڑا سخت مجاہدہ تھا مگر کام کی مخصوص ساخت اور اس وجہ سے کہ اس کا تعلق دعوت اور اختلاط سے ہے، یہ مجاہدہ ان کو دن رات کرنا پڑتا تھا۔ آخر زمانہ میں اپنے مقصد کے خلاف بات سننا طبیعت کی نزاکت اور مقصد کے غلبہ کی وجہ سے برداشت سے باہر ہو گیا لیکن ساری عمر یہ مجاہدہ کرتے ہی گزری۔

ایک سفر میں ایک صاحب جو ذی علم بھی تھے، راستہ بھر بے عنوانیاں کرتے رہے اور مولانا بڑے ضبط و تحمل سے دیکھتے اور سنتے رہے۔ آخر میں فرمایا کہ:

"تم سمجھتے ہو کہ میرا غصہ اتنا بے قیمت ہے کہ تم پر غصہ کر لوں گا، میں ہرگز تم پر غصہ نہیں کروں گا[1]"۔

گلاوٹھی تبلیغی جماعت گئی ہوئی تھی، مولانا مسجد میں تھے۔ جماعت گشت کر کے واپس ہوئی تو اپنے ساتھ ایک نوجوان کو لائی۔ مولانا مسجد سے نکل رہے تھے، جماعت کے لوگوں نے کہا حضرت یہ شخص ایک وقت کی بھی نماز نہیں پڑھتا، اور اس کے تمسخر اور استہزاء کی شکایت کی، وہ مولانا کو دیکھ کر بجائے احترام کے زور سے ہنسا، مولانا نے اس کی ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر فرمایا: "اللہ تجھے ہنستا ہی رکھے"۔ اور بڑی سادگی سے نماز کی نصیحت کی۔ اس نے فوراً اقرار کر لیا اور لوگ اسے مسجد میں لے گئے[2]۔

ایک مرتبہ دوران تبلیغ میں آپ نے ایک شخص پر ہاتھ رکھ دیا، وہ آگ بگولہ ہو گیا اور کہنے لگا کہ اگر اب کے تم نے ہاتھ لگایا تو لٹھ ماروں گا۔ آپ نے فوراً اس کے پاؤں پکڑ لئے اور فرمایا کہ "پاؤں کو تو نہیں کہا تھا"۔ اس کا غصہ کافور ہو گیا اور فوراً نرم پڑ گیا[3]۔

ایک سفر میں بیل گاڑی کی سواری تھی۔ لاری کے اڈے پر پہنچنا تھا، لاری کے چھوٹنے کا وقت قریب تھا اور لوگ روکنے کے لئے گئے ہوئے تھے۔ گاڑی بان سے ہر چند کہا گیا کہ تیز چلا مگر

---

[1] (روایت مولانا انعام الحسن صاحب) [2] (روایت منشی محمد احمد صاحب خوشنویس دہلوی)

[3] (از مولانا احتشام الحسن صاحب کاندھلوی)

چھوٹ جائے گی مگر بار بار کے تقاضوں اور منت پر بھی اس نے بیل نہیں ہانکے اور بڑی مستقل مزاجی کے ساتھ آہستہ آہستہ رفتار سے چلاتا رہا، یہاں تک کہ لاری چھوٹ گئی۔ بعض رفقائے سفر نے گاڑی بان کو سخت زجر و توبیخ کی، اور بعض نے فرط غضب میں خلاف عادت سخت سست کہا۔ مولانا نے صرف اتنا فرمایا کہ بھائی اگر تو ان صاحبوں کی بات مان لیتا تو تیرا کیا نقصان تھا؟

ایک مرتبہ ایک صاحب کو جو کسی ملازمت کے سلسلہ میں کسی مسلمان افسر بالا کے زخم خوردہ اور بے روزگاری سے اتنے دل شکستہ تھے کہ توازن ہاتھ کھو چکے تھے۔ مولانا کی خدمت میں آئے اور اس آشفتہ خاطری میں ایسی ناہمواری اور گستاخانہ باتیں کرتے رہے جن کا کوئی مسلمان برداشت نہیں کر سکتا۔ مولانا نے فرمایا یہ اس وقت معذور ہے، ایسے وقت دعا اور وظیفہ بتلانا بھی مناسب نہیں، آپ نے ان سے کہا کہ چند دن قیام کیجئے اور مطمئن ہو کر رہیے۔ چنانچہ وہ رہے، مولانا نے بڑی خاطر اور دل جوئی کی اور ایک دو دن میں ان کی یہ کیفیت جاتی رہی۔

مولانا کبھی کبھی اپنے کام کے سلسلہ میں ان لوگوں پر جن کے خلوص و تعلق پر اعتماد ہوتا تھا سخت غصہ ہوتے تھے، ان لوگوں کو زار و قطار روتے ہوئے دیکھا گیا ہے مگر ان کے تعلق میں اور اضافہ ہو گیا۔ مولانا فرماتے تھے کہ "میں نے اپنے اللہ سے دعا کی ہے کہ میں جس پر غصہ کروں اس کے حق میں میرا غصہ باعث رحمت ہو"۔

رعایت حقوق:

مولانا کو مسلمانوں کے حقوق کا اور پھر ان میں درجہ بدرجہ اہل علم، اہل دین اور اہل شرف کے حقوق کا جیسا اہتمام رہا کرتا تھا اور اس بارے میں ان کی نگاہ جیسی باریک بین اور دقیقہ شناس اور ان کا ذہن جیسا رسا اور مجتہد واقع ہوا تھا، اس کی شہادت اس کتاب کے صفحات پر جابجا موجود ہے۔ جس کو مولانا کے ساتھ چند روز بھی رہنے کا اتفاق ہوا ہے اور وہ فطرتاً احساس و ادراک کی دولت سے محروم نہیں ہے وہ شہادت دے گا کہ مولانا اس فن کے مجتہدین میں سے تھے اور اس آخر زمانہ میں اس شعبہ کے امام اور حکیم تھے، ان کے معاملات حالات و اقوال سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا آدھا سلوک و تصوف معرفت حقوق و ادائے حقوق میں مضمر تھا اور اس کو وہ اہم ترین فرائض میں سمجھتے تھے، ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

"ایک دوسرے کے ساتھ عزت و حرمت و محبت کو ہر چیز سے بہتر سمجھتے رہیں۔ ہزار

مسائل حق کی جماعتوں سے ایک حق کی نگہداشت اور اس پر چلتے جو نقص واقع اور موجب رضا خداوندی ہے"۔

ان خصوصی حقوق کے علاوہ جن کا بے حد اہتمام رہا کرتا تھا، حقوق عامہ اور عام انسانی حقوق کا بھی بڑا اہتمام تھا، وہ یہاں تک کہ کفار و غیر مسلمین تک کی حق تلفی کو گوارا نہیں کر سکتے تھے اور سفر و حضر میں ان حقوق عامہ کی نگہداشت سے غافل نہیں رہتے تھے۔

ریل گاڑی میں ایک مرتبہ ایک رفیق نے سیٹ پر زیادہ جگہ گھیر لی، فرمایا یہ حقوق عامہ میں سے ہے، اس جگہ دوسرے مسافروں کا حق ہے۔

مغرب کے نوافل پڑھتے وقت ایک رفیق نے ریل میں مسافروں کو سامنے سے گزرنے سے روکنے کا انتظام کیا، آپ نے منع فرمایا اور کہا یہ حقوق عامہ ہیں، تم دوسروں کو گزرنے سے نہ روکو بلکہ سترہ کا انتظام کرو۔

ایک مرتبہ موٹر ٹھہرا کر نماز پڑھی۔ بعض ساتھیوں نے نوافل کی نیت، تو منع فرمایا یہ دوسری سواریوں کا زیادہ حق ہے۔

بعض مرتبہ کسی دعوت میں مہمان شوربہ پینے لگتے تو آپ منع فرماتے اور کہتے کہ یہ دیانت کے خلاف ہے، صاحب دعوت نے اس کی اجازت نہیں دی۔

کاندھلہ کے سفر میں ایک مرتبہ کثرت ہجوم کی وجہ سے آپ سیکنڈ کلاس میں بیٹھے اور خیال کیا کہ ٹکٹ چیک کرنے والا آئے گا تو ٹکٹ بنوالیا جائے گا۔ وہ آیا تو اس نے اپنی بے ڈھنگی گفتگو کی کہ مولانا کو غصہ آگیا اور اس کو ڈانٹ دیا۔ ٹکٹ بننے کے بعد وہ چلا گیا تو مولوی ابوالحسن صاحب نے جو ساتھ تھے کہا کہ حضرت اس کو تو کہنے کا حق تھا (جس کا حق آتا ہو وہ کہنے سننے کا مجاز[1] ہے) مولانا نے فوراً ہی اپنی غلطی کا اعتراف کرلیا اور وہیں سے اسٹیشن پر اتر کر اس ٹی ٹی آئی سے معذرت کی اور معافی مانگ لی۔

اخلاق و تواضع:

اخلاق و ظاہرداری کی جنس اس بازار میں نایاب نہیں، لیکن اگر یہ شرط لگا دی جائے کہ اخلاق و

---

1. (حدیث نبوی)

مدارات ایمان و احتساب کے ماتحت ہو، شریعت کے اصول کے مطابق ہو اور سنت کے موافق ہو تو یہ جنس کمیاب ضرور ہو جاتی ہے۔

مولانا کا اخلاق کے متعلق نظریہ تھا کہ اخلاق جب تک جناب محمد ﷺ کے قدموں کے پیچھے نہ آئیں، وہ اخلاق نہیں، کئی بار یہ واقعہ سنایا کہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ مالٹا سے رہا ہو کر تشریف لائے تھے، ایک دعوت میں میں بھی تھا اور حضرت کے پاس بیٹھا تھا، صاحب دعوت دیر تک کسی انگریز افسر کی خوش اخلاقی کا تذکرہ اور اس کے حسن اخلاق کی تعریف بڑے ذوق و محویت کے ساتھ کرتے رہے، مولانا نے دیر تک صبر و ضبط کے ساتھ سنا، مگر طبیعت پر بہت گرانی ہوئی۔ مجھ سے آہستہ سے فرمایا کہ کافر کے بھی اخلاق ہوتے ہیں؟

حدیث پر نظر ہونے کے بعد مولانا کی خدمت میں رہ کر اس کا اندازہ ہو سکتا تھا کہ کن اخلاقی باریکیوں پر مولانا کی نظر ہے، اور روزمرہ کے سلوک و معاملہ اور نشست و برخاست میں کس قدر ان کی رعایت ہے۔ اس خاکسار نے اپنے مدرسہ کے چند طلبہ کو جو مولانا کی خدمت میں ٹھہرے ہوئے تھے لکھا کہ آپ لوگوں نے حدیث پڑھی ہے اب غور سے دیکھئے کہ اخلاق و معاملت کی حدیثوں پر کس طرح عمل ہوتا ہے"۔

مولانا نے ایک دوست کو ایک خط میں لکھا تھا:

"مسلمان کتنے ہی کم درجہ کا ہو عظمت سے اس کی طرف نگاہ کی مشق کرو"۔

یہ مشق مولانا کی اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ بے عمل سے بے عمل اور پست سے پست درجہ کا مسلمان ان کی نگاہوں میں معظم و محترم تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مولانا اس کو اپنے سے افضل اور اللہ کے یہاں زیادہ مقبول سمجھتے ہیں۔ ہر مسلمان سے ملتے وقت ان کی نگاہ ہمیشہ اس کی صفت اسلام اور ذرہ ایمان پر ہوتی تھی اور اس کے سارے عیوب اور کمزوریوں کا احساس اور مشاہدہ اس ایمان کی توقیر اور احترام سے ہمیشہ مغلوب ہو جایا کرتا تھا، ان کی یہ قوت تمیز اس بارہ میں اتنی بڑھ گئی تھی کہ وہ آسانی سے ایک آدمی میں خیر و شر کے شعبوں کو ممتاز کر لیتے اور اپنی نگاہ خیر کے شعبہ پر مرکوز کر کے اس کی توقیر اور احترام کرتے۔ ایک مرتبہ ایک شخص سے ملنے کے بعد فرمایا کہ مجھے معلوم ہے کہ اس شخص نے ایک دینی جماعت اور ادارہ کو نقصان پہنچایا ہے جس کا مجھے سخت درد ہے لیکن میں اس کے علم سے بھی واقف ہوں اور میں نے صرف اس کے علم کی تعظیم کی ہے۔

مولانا کا آیت کل ذی حق حقه [1] اور انزلوا الناس منازلهم [2] پر بڑا عمل تھا۔ اہل فضل اور اہل علم کی حد درجہ توقیر فرماتے اور من لم یوقر کبیرنا و لم یرحم صغیرنا فلیس منا کے ماتحت ان کے اعزاز و اکرام کی بڑی تاکید فرماتے، ان کو ان کے مراتب کے مطابق شایان شان جگہ پر بٹھاتے عام فرش کے باوجود ان کے بیٹھنے کے لئے خاص طور پر کپڑا بچھا دیتے اور کوئی امتیازی سلوک ضرور فرماتے، ان کے سامنے اتنی تواضع فرماتے کہ ناواقف آدمی کو پہچاننا مشکل ہو جاتا۔ باہر سے بڑی بڑی جماعتیں آتیں لیکن مولانا اپنی نگاہ مردم شناس اور ذکاوت حس سے آنے والوں کی حیثیتوں اور فرق مراتب کا احساس کر لیتے یا کسی ذریعے سے اس کا اندازہ ہو جاتا اور ہر ایک کے ساتھ اس کے شایان شان معاملہ فرماتے، بہت کم لوگوں کو اس کی شکایت ہوتی کہ ان کی طرف التفات نہیں ہوا، اس چیز کا اتنا اہتمام تھا کہ آخری علالت میں کہ دل و دماغ کام کی فکروں میں اور جسم بیماریوں اور اس کی تکلیفوں میں مشغول تھا اور کھانے پینے کا بھی پورا حس نہیں تھا، اس بات سے غفلت نہیں تھی۔

حافظ محمد حسین صاحب (اجڑاڑہ والے) ایک معذور سے بزرگ ہیں اور مولانا گنگوہیؒ کے خدام میں سے ہیں، وہ بیماری سن کر تشریف لائے ہوئے تھے اور اکثر روزانہ حجرے میں آ کر دم کرتے تھے، مولانا کو چارپائی کے ہلنے سے تکلیف ہوتی تھی اور اکثر جب نمازوں کے بعد لوگ دم کرنے کے لئے آتے تھے تو دو ایک آدمی چارپائی کے پاس کھڑے ہو جاتے تھے کہ اس کو دھکا نہ لگے اور حرکت نہ ہو، بایں ہمہ مولانا حافظ صاحب کو پائنی چارپائی پر بٹھا لیتے تھے اور لوگ تعجب کرتے تھے کہ یہ کون بزرگ ہیں جو چارپائی پر مولانا کے پاس بیٹھے ہیں۔

ایک مرتبہ باہر حوض کے قریب دسترخوان بچھا تھا حافظ صاحب بھی کھانے میں شریک تھے، مولانا کی چارپائی صحن میں تھی۔ حافظ صاحب ذرا فصل سے جماعت میں بیٹھے ہوئے تھے، ایک آدمی شیخ الحدیث کے نام پیغام لائے کہ مولانا فرماتے ہیں کہ حافظ صاحب کو اپنے اور مولانا عبدالقادر صاحب کے درمیان بٹھاؤ۔

میرے ایک بزرگ عزیز تشریف لائے ہوئے تھے، ان کی بڑی خواہش تھی کہ مولانا سے گفتگو

---

1 ہر حق دار کا حق ادا کرو 2 (لوگوں سے ان کے درجات کے مطابق سلوک کرو)

اور کچھ عرض کرنے کا موقع ملے، لیکن ہجوم کی کثرت اور ضعف کی وجہ سے موقع نہ مل سکا، وہ چلنے لگے تو انہوں نے اس شخص کا پھر اظہار کیا، میں نے مولوی صاحب سے عرض کیا، انہوں نے مولانا سے کہہ کر بلا لیا، مولانا نے ان کا بڑا ہی اکرام فرمایا، ان کے ہاتھ لے کر اپنے سارے بدن پر پھیرے، پھر سادات کے متعلق فرمایا اور کام کے متعلق فرماتے رہے اور وہ روتے رہے، رخصت ہوئے تو صاحبزادہ سے فرمایا کہ میری ذاتی رقم میں سے دس روپے آپ کی خدمت میں ہدیہ کے طور پر پیش کردو۔

نومبر 1944ء میں مولانا سید ظفر صاحب ٹونک سے تشریف لائے تو بے حد اکرام فرمایا، ان کی اہلیہ (میری پھوپھی مرحومہ) کی نہایت عمدہ الفاظ میں تعزیت کی، کھانے کا خصوصی اہتمام فرمایا۔ خود اپنے ہاتھ سے روٹی گرم کرکے دیتے تھے۔ دوسرے روز صبح حضرت سید صاحب کے فضائل و مناقب میں تقریر کی اور اس خاندان کے ایک فرد کی آمد پر بڑی مسرت کا اظہار فرمایا، اس کے بعد میوات کا ایک سفر پیش آیا، مولانا ظفر بھی ساتھ تھے، ہر جگہ ان کے ساتھ خصوصی برتاؤ کرتے۔

اس خصوصی اکرام و مدارات کے علاوہ عمومیت بھی ایسی تھی کہ ہر شخص کو خصوصیت معلوم ہوتی تھی اور حدیث لا یحسب جلیسہ ان احدا اکرم علیہ منہ (کوئی ہم نشیں یہ نہیں سمجھتا کہ کوئی شخص رسول کریم ﷺ میں اس سے زیادہ عزیز ہے) کا مضمون تھا، ہر شخص اپنے واقعات یاد کرکے کہتا تھا کہ جو معاملہ میرے ساتھ تھا وہ شاید کسی کے ساتھ نہ تھا۔

سفر و حضر میں خصوصی رفقاء کے ساتھ مساوات کا پورا اہتمام رہتا اور امتیاز و تشخص ناپسند فرماتے۔ ایک سفر میں چارپائیاں اس طرح بچھائی گئیں کہ مولانا کی چارپائی کا پائتانا ایک رفیق کے سرہانے کی طرف تھا، بڑی ناراضگی فرمائی اور ساتھ رہنے والوں سے فرمایا کہ تم اتنے دن سے ساتھ رہتے ہو مگر تم کو اب تک ان چیزوں کی حس نہیں۔

ایک رفیق نے ایک مرتبہ چلتے وقت جوتا ہاتھ میں اٹھا لیا، اس سے جوتا لے لیا اور اس کے ہاتھ چوم لئے، مہمانوں کی بالخصوص تبلیغ میں آنے والوں اور علماء کی خاطر مدارات اپنے ذمہ فرض سمجھتے تھے اور اس میں طبیعت کسی طرح سیر نہ ہوتی۔ فرماتے حدیث میں مہمان کے اکرام اور خاطر کی بڑی تاکید ہے۔

مولوی معین اللہ ندوی راوی ہیں کہ میں بیمار تھا۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ میرا کھانا جانے لگا مولانا

نفل کے لئے کھڑے ہوئے تھے لڑکے سے کہا کہ کھانا رکھ دو میں لے جاؤں گا۔ وہ سمجھ نہیں، کھانا کوٹھے پر پہنچا دیا، نماز پڑھ کر تشریف لائے اور فرمایا کہ میں نے بچے سے کہا تھا کہ کھانا میں لے جاؤں گا، یہ خود لے آیا، پھر میرے پاس بیٹھے ہوئے دیر تک شفقت و محبت اور دلجوئی کی باتیں کرتے رہے۔

اکرام اور خصوصی برتاؤ کرنے میں بھی بڑا لطیف طریقہ اختیار فرماتے جس سے دوسرے شرکاء حال کو کوئی شکایت اور احساس نہ ہوتا۔

ایک مرتبہ شب عرفہ کو عصر کے وقت ایک پیالی چائے لے کر باورچی خانہ پر تشریف لائے۔ ندوہ کے طلباء کی جماعت کے ۱۰، ۱۲ افراد تھے اور پیالی ایک تھی، فرمایا بھائی اپنی جماعت میں کسی ایک کو منتخب کر لیجئے، میں یہ پیالی اس کو پیش کر دوں، طلباء نے خاکسار کی طرف اشارہ کیا اور مولانا نے وہ پیالی بڑھا دی۔

لکھنؤ کی تشریف آوری کے موقع پر اسٹیشن سے روانہ ہو کر قیصر باغ میں ایک مجرد مزار پر نوافل پڑھے اور دعا فرمائی، ایک رومال بچھا دیا جس پر مولانا نے نماز پڑھی۔ جماعت کے دوسرے افراد قریب کھڑے تھے، مولانا نے جناب حافظ فخر الدین صاحب کو رومال پر بٹھایا، اس کے بعد فرمایا کہ بھائی اہل لکھنؤ کا بھی ایک نمائندہ ہونا چاہئے، جماعت میں لکھنؤ کا میں ہی تھا، میری ہی طرف اشارہ تھا۔ میں نے اتنے معززین کی موجودگی میں خصوصیت کی جگہ بیٹھنے میں تکلف کیا تو فرمایا کہ رومال حضرت سہارنپوری کا ہے، آپ برکت کے لئے بیٹھئے، اس طرح مجھے بھی ہمت ہوئی اور ارشاد کی تعمیل کی۔

ایک مرتبہ قریشی صاحب اور ان کے رفیق کار ملک صاحب کی خواہش و اصرار پر خلاف عادت ایک سفر میں سیکنڈ کلاس میں بیٹھ گئے، فرماتے تھے کہ مجھے وہاں بیٹھ کر تکلیف ہوئی اور دل گھبرایا، اتنے میں ان صاحبوں نے کہا کہ حضرت کچھ تکلیف تو نہیں ہوئی، راحت ملی؟ فرماتے تھے کہ میں نے سوچا اگر کہوں تکلیف ہوئی تو ان کو تکلیف ہوگی اور ان کو افسوس ہوگا کہ ہم نے آرام پہنچانے کے لئے اتنا خرچ کیا اور اس کو تکلیف ہوئی اور اگر کہتا ہوں کہ نہیں حضرت بڑا آرام ملا تو خلاف واقعہ ہے۔ میں نے کہا ہمارے بیٹھنے سے آپ کو خوشی اور راحت ہوئی؟ انہوں نے کہا کیوں نہیں، بہت، میں نے کہا بس آپ کی خوشی اور آرام سے ہم کو بھی آرام ہے۔

تواضع کی بات یہ تھی کہ مولانا اپنے کو حقیقتاً کسی عزت کا مستحق نہیں سمجھتے تھے، اپنے عالم، شیخ اور انکی بڑی جماعت کے مقتدا ہونے کا احساس بالکل نہیں تھا، ایک خط میں ایک مرتبہ اس خاکسار کو تحریر فرمایا تھا:

''بندہ ناچیز کے بارے میں جناب حضور، قبول فرمالیں تو دل چاہتا ہے کہ معمولی نام سے زائد کسی لفظ کا اطلاق الفاظ کی بے قدری ہے''۔

طبیعت کا یہ رنگ ان کے خطوط سے بے تکلف جھلکتا ہے، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب عمر میں چھوٹے، رشتہ میں بھتیجے اور آپ کے شاگرد بھی ہیں، ایک خط میں ان کو تحریر فرماتے ہیں:

''گرامی نامہ موجب مسرت و عزت ہوا، آں عزیز کی تشریف آوری کا بے حد اشتیاق ہے، اگر بقول آپ کے میں حضرت ہوں تو ماشاء اللہ آپ حضرت گر ہیں۔ مجھ نکمے اور ناکارہ کو کون پوچھتا اگر آپ کی توجہ اور کرم نہ ہوتا۔ حضرتؒ کے بعد سب سے پہلے آپ ہی نے الطاف و اکرام فرمایا، پھر شیخ جی نے اظہار تعلق کیا اور یہ سب آپ ہی حضرات کا طفیل ہے''۔

آپ کی تشریف آوری کا جس قدر اشتیاق ہے اسی قدر خیال ہے کہ سامنے ہونے سے میری گندگیاں اور ظاہر ہوں گی مگر اسی اُمید پر جی چاہتا ہے کہ آپ جیسوں کی مجالس اور ہم نشینی سے شاید اپنی بھی کچھ اصلاح ہو جائے۔ لہ

ایک دوسرے خط میں موصوف کو تحریر فرماتے ہیں:

''رمضان المبارک کی دل بستگی اور اس پاک ماہ کی برکات و انوارات سے استفادہ و اہل دل کو مبارک ہو۔ حق تعالیٰ شانہ آں عزیز کو مزید توفیق و کمالات رضا سے کامیاب و فائز المرام کریں اور روز افزوں ترقیات قرب سے بہرہ اندوز رکھیں۔ ہم جیسے ضعفا کا کچھ حال نہ پوچھو، بس جاناں تیز رفتار کی دعا ہمتوں سے حق تعالیٰ اس ضعیف و مسکین کا بھی بیڑہ پار فرمائیں''۔ ٹہ

لہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری

ٹہ حاجی شیخ رشید احمد صاحب

چو با حبیب نشینی و بادہ پیمائی
بیاد آر حریفان بادہ پیما را

آپ نے آخری وقت تک اپنی طرف سے اطمینان نہیں کیا اور نفس کے محاسبہ اور نگرانی سے غافل نہیں ہوئے بلکہ جس قدر لوگوں کا رجوع بڑھتا رہا اپنی طرف سے زیادہ غیر مطمئن اور خائف ہوتے گئے اور احتساب نفس کا کام بڑھاتے رہے۔ بعض اوقات اہل حق اور اہل بصیرت کو بڑی لجاجت سے اس طرف متوجہ فرماتے کہ وہ آپ پر نظر رکھیں اور اگر کہیں عجب کا ذرہ کا شائبہ نظر آئے تو متنبہ کریں۔ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا اور مولانا حافظ عبداللطیف ناظم مدرسہ مظاہر العلوم کو ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

"عزیز محترم حضرت شیخ الحدیث و حضرۃ المحترم جناب ناظم دامت برکاتہم"۔

السلام علیکم۔ امید ہے کہ مزاج سامی بعافیت ہوں گے۔ ایک مضمون جس کا قبل از رمضان مجھے بہت زیادہ اہتمام تھا، اپنی قوت بشریہ کے ضعف وضعف ایمانی کی بنا پر بالکل نسیاً منسیاً ہوگیا۔

وہ یہ کہ حق تعالیٰ کے فضل و کرم سے یہ کام اتنا وسیع ہوگیا ہے کہ اب اس کی روز افزوں ترقی و مقبولیت کو دیکھ کر میں اپنے نفس سے بالکل مامون نہیں ہوں کہ وہ کہیں عجب و کبر میں مبتلا نہ ہو جائے، لہٰذا آپ جیسے اہل حق کی نگرانی کا میں سخت محتاج ہوں اور اپنی نگرانی کا آپ حضرات مجھے ہر وقت محتاج خیال کریں کہ اس میں اس کی خبر پر مجھے جھنجھوڑنے کی تاکید فرمادیں اور اس میں کی شر سے مجھے جھنجھلاہٹ سے منع کردیں۔

(22 رمضان 62ھ 23 ستمبر 43)

مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم مولانا کے تذکرہ (معارف اعظم گڑھ بابت ماہ نومبر ۱۹۴۴ء) میں تحریر فرماتے ہیں:

"لکھنؤ کے قیام میں ایک دفعہ ایک دوست کے یہاں عصر کے وقت چائے کی دعوت تھی، پاس کوئی مسجد نہ تھی، ان کی کوٹھی ہی میں نماز باجماعت کا سامان ہوا، خود کھڑے ہوکر اذان دی۔ اذان کے بعد مجھے ارشاد ہوا کہ نماز پڑھاؤ۔ میں نے معذرت کی تو نماز پڑھائی۔ نماز کے بعد مقتدیوں کی طرف رخ کرکے فرمایا: بھائیو! میں ایک اتنا

میں گرفتار ہوں۔ دُعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس سے نکالیں۔ جب سے میں یہ دعوت لے کر کھڑا ہوا ہوں لوگ مجھ سے محبت کرنے لگے، مجھے یہ خطرہ پیدا ہونے لگا ہے کہ مجھ میں حجاب نفس نہ پیدا ہو جائے، میں بھی اپنے کو بزرگ نہ سمجھنے لگوں، میں ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتا ہوں کہ مجھے اس ابتلا سے بسلامت نکال لیں، آپ بھی میرے حق میں دُعا فرمائیں"۔

ایک مرتبہ ایک صاحب نے ایک قالین ہدیہ کیا، مولانا کی طبیعت پر یہ قیمتی قالین بڑا بار ہوا، اس میں ایک بڑی لطیف تقریر فرمائی اور شہر کے ایک بڑے عالم کی خدمت میں یہ کہہ کر اس کو پیش کر دیا کہ ہدیہ کرنے والے نے مجھ کو عالم سمجھ کر پیش کیا تھا، میں جس کو عالم سمجھتا ہوں اس کی خدمت میں پیش کر کے سبکدوش ہو جاتا ہوں۔

مولانا کو ہٹو بچو سے بڑی نفرت تھی۔ فرماتے تھے کہ ہٹو بچو فرعون وہامان کی سنت ہے، چاہتے تھے کہ بے تکلف رہیں اور چلیں پھریں، کوئی ہٹو بچو نہ کہے۔ میوات کے سفروں اور جلسوں کے موقع پر بھی جہاں ہزاروں آدمیوں کا مجمع ہوتا تھا اور مولانا ہی مرکز توجہ ہوتے تھے، اسی کا اہتمام رکھتے تھے کہ کوئی پابندی اور اہتمام نہ ہو، آخری علالت میں بھی اس کو پسند نہیں کرتے تھے کہ لوگوں کو روکا اور ہٹایا جائے۔

آخری علالت کے آخری ایام میں جبکہ زائرین کی کثرت ہوتی تھی اور حالت کی نزاکت کی وجہ سے مصافحہ سے آپ کو روک دیا گیا تھا، ایک اجنبی شخص ایک دن ملنے آئے اور حاضرین مجلس کے اوپر سے پھلانگتے ہوئے مصافحہ کے لئے بڑھے۔ ایک میواتی خادم نے بڑھ کر ان کو ہاتھ سے روک دیا، جس سے وہ بہت غضبناک ہوئے اور علماء مولویوں کو بُرا بھلا کہتے ہوئے چل دیئے۔ حضرت مولانا نے اس میواتی خادم کو اشارہ سے قریب بلا کر بہت تنبیہ کی اور فرمایا کسی مسلمان کا دل دکھانا اللہ کے یہاں بہت مبغوض ہے، جاؤ اس شخص سے معافی چاہو اور اس کو راضی کر کے واپس آؤ۔ چنانچہ اس بے چارہ نے ایسا ہی کیا، اور راقم سطور نے بھی مسجد سے باہر یہ تماشا دیکھا کہ وہ صاحب بے تکان گالیاں دے رہے ہیں، اور وہ بے چارہ میواتی ہاتھ جوڑے سامنے کھڑا ہے اور صرف یہ کہتا ہے کہ دل میں نے آپ کا دل دکھایا ہے یا تو مجھے اس کی سزا دے کر یا ویسے ہی اللہ واسطے معاف کر دیجئے۔

وسعت قلب:

ہندوستان میں مدت سے دین و علم کے چھوٹے چھوٹے دائرے اور حلقے بن گئے ہیں، ہر حلقہ اور ہر جماعت کے لوگوں نے علم دین کو اپنے اپنے دائرے میں ایسا محصور سمجھ لیا ہے کہ اس کے باہر وہ علم و دین کا تصور نہیں کر سکتے دوسرے دائرے کے لوگوں کے علم و فضل اور دینداری و تقویٰ کا اعتراف کرنا مشکل ہوتا ہے، وہ ان سے مل کر وہ قلبی انبساط و انشراح نہیں ہوتا جو اہل دین اور ہم مذاق لوگوں سے مل کر ہونا چاہیے، یہ بات بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ ایک ہی جماعت اور حلقے کے ایسے دو افراد کے ساتھ محبت و عقیدت رکھنا بعض لوگوں کے نزدیک ناممکن ہو گیا ہے جن کے مذاق طبیعت یا سیاسی خیالات یا مشاغل میں اختلاف ہے اور ان کا ایک قلب میں جمع کرنا جمع بین الاضداد نظر آنے لگا ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ افادہ اور استفادہ کا دائرہ برابر محدود ہوتا چلا جا رہا ہے، بیگانگی اور بُعد بڑھ رہا ہے اور اہل دین اور اہل حق کے درمیان دیواریں کھڑی ہوتی چلی جا رہی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے مولانا کو وسعت قلب کی بڑی طاقت عطا فرمائی تھی اور بڑا وسیع ظرف بخشا تھا جس میں تمام دینی جماعتوں اور ہر قسم کے اختلافات و خصوصیات کے ساتھ تمام اہل حق کی بیک وقت گنجائش تھی۔ ہر شخص کے لئے مرتبہ اور شخصیت کے لحاظ سے الگ خانہ تھا اور قلب میں خاص جگہ تھی۔ عربی شاعر کے بقول۔

لكل امرئ شعب من القلب فارغ
وموضع نجوى لا يرام اطلاعها

مولانا کے نزدیک مسلمانوں کا کوئی طبقہ جو ہر اور مسلمانوں کا کوئی فرد خیر سے خالی نہیں، ہر طبقہ میں کوئی نہ کوئی ایسی صفت ہے جو دوسرے میں نہیں۔
پھر ہر طبقہ کو دوسرے سے اس صفت میں استفادہ کرنا چاہیے۔ مولانا ان تمام طبقوں کی ان امتیازی صفتوں سے اپنی تحریک دعوت میں استفادہ کرنا چاہتے تھے اور اللہ تعالیٰ نے اس کا خاص ملکہ عطا فرمایا تھا کہ ان صلاحیتوں سے وہ اپنے کام میں فائدہ اٹھا لیتے۔
خصوصاً جن لوگوں یا جن طبقوں کو اللہ تعالیٰ نے خاص جوہر یا فطری صلاحیتیں اور دین سے مناسبت عطا فرمائی ہے ان کو دین میں مشغول کرنے اور ان کی اس نجابت و صلاحیت سے استفادہ

کرنے اور دین کے فروغ اور ترقی کا ذریعہ بنانے کا بڑا اشتیاق رکھتے تھے۔

ایک بزرگ کو ایک کارکن کے متعلق لکھتے ہیں:

''سادات کے متوجہ کرنے کی طرف توجہ دلاتے رہیں۔ تعلیم میں بھی اور تبلیغ میں بھی اور یہ یاد رکھیں اور سمجھتے رہیں کہ جو لوگ جس قدر زیادہ اہل ہیں ان کے اصلی مرکز تک پہنچنے میں نزاکتیں بھی بہت زیادہ ہیں''۔

ایک روز میں نے عرض کیا حضرت ندوہ کے لوگوں نے اہل دین کی طرف ہمیشہ عقیدت کا ہاتھ بڑھایا مگر ان کی طرف سے اس کے جواب میں محبت کا ہاتھ نہ بڑھا، ان کو ہمیشہ بیگانگی اور غیرت کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ نے ہمارے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھا اور ہمارے ساتھ یگانگت کا معاملہ کیا، مولانا کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، اور فرمایا آپ کیا فرماتے ہیں، آپ کی جماعت تو اہل دین کی جماعت ہے، میں تو علی گڑھ والوں کو بھی چھوڑنے کا قائل نہیں۔ ان سے بھی بعد اور وحشت صحیح نہیں۔

اسی کا نتیجہ تھا کہ اس دعوت و تحریک میں مظاہر العلوم سہارنپور، دارالعلوم دیو بند، ندوۃ العلماء، جامعہ ملیہ اور ان کے ساتھ انگریزی کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلب اور اساتذہ اور تجارت پیشہ، ملازمت پیشہ اور ہر طرح کے کاروباری مسلمان دوش بدوش ہیں اور کوئی دوسرے سے متوحش نہیں، مولانا ہر ایک کے امتیاز خصوصی کی خصوصی داد دیتے تھے اور تعریف کرتے تھے، کسی کی دینداری کی، کسی کی سلیقہ مندی کی، کسی کی حاضر دماغی اور تجربہ کاری کی۔ ہاں ان کے نزدیک ہر فطری صلاحیت دین کے کام میں لگنی چاہئے تھی، اس کو کسی اور مصرف میں دیکھ کر ان کو بڑا درد ہوتا، ان کے نزدیک جن لوگوں کو اللہ نے اچھا دل و دماغ چستی اور مستعدی اور بلند ہمتی دی ہے، ان کی توجہ کا دین دنیا سے زیادہ مستحق ہے اور ان کی توجہ اور دلچسپی سے دین کا کام بڑی تیزی اور قوت سے ہوسکتا ہے، ایک دیندار معاملہ فہم کامیاب تاجر کو لکھتے ہیں:

''میں آپ جیسے سب احباب اور بزرگوں سے طالب رہا کہ آپ میرے معین اور مددگار بلکہ اس کے اندر ایسی ہمت مردانہ سے کھڑے ہوں کہ آپ ہی اصل ہوں، کیونکہ آپ کی ہمت آپ کا حوصلہ، آپ کی قوت، آپ کی طبیعت، آپ کا دماغ اس قابل تھا اور اس کی اہلیت رکھتا ہے کہ کسی جاندار کام کو آپ اٹھالیں، جاندار کام کے لئے جانداری

اٹھا دیتا"۔

تمام افراد اور جماعتوں کے متعلق مولانا کا یہی خیال تھا۔

اداروں کے علاوہ روحانی سلسلوں اور مشائخ طریقت کے منتسبین کے متعلق بھی مولانا کی وسعت قلب کا یہی حال تھا، کسی شیخ طریقت کے منتسبین اس کام کی طرف توجہ کرتے تو بے حد خوش ہوتے اور ان کا بڑا اکرام کرتے۔ میں نے مجددی طریقہ اور کبھی حضرت مولانا فضل رحمٰن صاحبؒ کے سلسلے سے تعلق رکھنے والوں کا تعارف کرایا تو بہت مسرور ہوئے اور ان کا بڑا اکرام کیا اور فرمایا کہ میں بچپن سے اپنے بزرگوں سے سن رہا ہوں کہ اس زمانے کے دو قطب تھے، پچھم میں حضرت گنگوہیؒ اور پورب میں حضرت مولانا فضل رحمٰن صاحبؒ۔ میری بڑی آرزو ہے کہ مولاناؒ کے لوگ اس طرف متوجہ ہوں، ایک مرتبہ حضرت مولانا فضل رحمٰن صاحبؒ کے اہل تعلق میں سے ایک مشہور ہستی کے متعلق (جن کو دنیاوی وجاہت اور ریاست بھی حاصل ہے اور جن کے دینی و علمی کمالات کے لئے ان کی امارت پردہ بن گئی ہے) فرمایا کہ میں ان کو اہل اللہ میں سے سمجھتا ہوں اور مجھے بار بار اس کام کی طرف ان کی توجہات منعطف کرانے کے لئے متوجہ فرمایا۔

معاصرین اور اہل فضل کے متعلق بھی اظہار خیال فرماتے تو ان کے اخلاقی درجہ کی مرتبہ شناسی، بالغ نظری اور قدردانی کا اندازہ ہوتا۔

اس وسعت قلب اور وسعت نظر کا یہ نتیجہ تھا کہ انہوں نے ایسے لوگوں سے کام لے لیا اور دین اور اہل دین سے ان کا تعلق پیدا کرا دیا اور پھر رفتہ رفتہ ان کی زندگی میں تبدیلی پیدا کر دی جن کے متعلق عام نگاہوں کا فیصلہ یہی ہوتا کہ ان کو قطعاً اس کام سے مناسبت نہیں اور یہ کبھی دین سے قریب نہیں ہو سکتے۔ برابر یہ تماشہ نظر آتا رہتا تھا کہ جن لوگوں کی عدم مناسبت کا قطعی فیصلہ کرتے وہ تھوڑے دنوں میں بڑے کارآمد آدمی بن جاتے، وہ ہر شخص سے ایک ہی درجہ اور ایک ہی مقدار کے کام کرنے کا مطالبہ اور اصرار نہ کرتے، ہر شخص کے حسب حال اور اس کی سطح اور مخصوص حالات اور صلاحیتوں کے مطابق اس سے دین کی نصرت و تائید کا کام لیتے اور اس کے اس کام پر اتنے ہی شکرگزار ہوتے جتنے دوسروں کی انتہائی جدوجہد اور محنت شاقہ پر، اس کے کام کی قیمت کا فراخ دلی سے اعتراف کرتے اور اس کی قدر و قیمت کو بیان کر کے اس کا دل بڑھاتے اور عملی کام کی ہمت دلاتے۔

استقامت:

مولانا نے اس زمانہ میں (جس میں استقامت سے زیادہ کوئی چیز مشکل نہیں) اپنی استقامت سے سلف کبار کی یاد تازہ کردی، چھوٹی چھوٹی سنتوں پر ایسی استقامت تھی جو اس زمانہ میں فرائض وواجبات پر ہونا بھی مشکل ہے۔

آخری علالت کا زمانہ ان کی بے نظیر استقامت کا بہترین نمونہ ہے، اس چھ مہینے کی علالت میں (جس میں قوت میں برابر انحطاط اور ضعف میں روز افزوں ترقی تھی اور ضعف اور سقوط قوت کا یہ عالم تھا کہ بعض دن بجلی پر کان رکھے بغیر آواز سنی مشکل تھی) نماز با جماعت کا وہ اہتمام تھا کہ اس پوری علالت میں غالباً کوئی نماز بے جماعت نہیں پڑھی، آخری عشاء کی نماز میں نماز کے اندر رفع حاجت کی ضرورت پیش آگئی تو حجرہ میں دوسری جماعت کے ساتھ نماز پڑھی، وفات سے تقریباً دو مہینے پہلے تک یہ عجیب وغریب منظر پانچوں وقت نظر آتا تھا کہ خود اٹھنے بیٹھنے کی طاقت نہیں، بیٹھ جاتے تو کھڑے نہیں ہوسکتے تھے، دو آدمی پکڑ کر صف میں کھڑا کردیتے، پھر امام نے اللہ اکبر کہتے ہی ایسی طاقت آجاتی کہ پورے سکون واطمینان کے ساتھ رکوع وسجود اور فجر کی نماز کا قیام (جو نسبتاً طویل ہوتا ہے) کرتے ہیں اور جہاں امام نے سلام پھیرا اور پھر وہ طاقت گویا سلب ہوگئی کہ خود کھڑے نہیں ہوسکتے، پھر دو آدمیوں کے سہارے اپنی جگہ پہنچتے ہیں۔ سنتوں میں ایک آدمی رکوع وسجود کرادیتا ہے، لیکن وتر کی نیت باندھتے ہی از خود رکوع وسجود کرتے اور کسی کی امداد قبول نہ کرتے۔ کھڑے ہونے سے بالکل معذور ہوگئے تو بیٹھ کر جماعت کے ساتھ نماز پڑھتے، اطباء اور علماء کی سخت ممانعت تھی، ورنہ کھڑے ہونے کی ہمت رکھتے تھے اور اگر لوگ اجازت دیتے تو کھڑے ہوکر ہی نماز پڑھتے۔ بیٹھنے سے بھی ضعف اور تعب ہونے لگا، لیٹے لیٹے نماز پڑھنے لگے، چارپائی صف کے ساتھ لگادی جاتی اور جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتے، لیکن وضو ومسواک کا وہی اہتمام رہا جو زندگی میں تھا، پورے آداب وسنن واذکار کے ساتھ وضو کرتے تھے، دو ساتھیوں کی ایک جماعت اس خدمت کے لئے مخصوص تھی، وہ نہایت اہتمام کے ساتھ وضو کراتی، پانی کا استعمال بھی جب مضر ہونے لگا تو علماء نے فتویٰ دیا اور طبیبوں نے تاکید سے تیمم کرنا شروع کیا، لیکن اس طرح کہ سہل انگاری اور سہل پسندی کو اس میں قطعاً دخل نہ تھا بلکہ اللہ کی نعمت سمجھتے ہوئے اور اس نیت کے ساتھ کہ اللہ کی رخصت پر اس کے صحیح موقع پر عمل کرنا بھی عزیمت ہے اور اس کا تقاضا

کفرانِ نعمت۔

سفر و حضر میں اذان و اقامت اور جماعت کا پورا اہتمام رہتا۔ مجھے اس عرصہ میں کہ بارہا ریل، لاری اور گاڑیوں کے سفر میں ہمرکابی کا شرف حاصل ہوا کبھی بے اذان و اقامت اور بے جماعت نماز پڑھنا یاد نہیں، ریل میں خواہ کیسا ہی ہجوم ہوا اذان دیتے اور اقامت و جماعت کے ساتھ کھڑے ہو کر نماز پڑھتے۔ اذان سنتے ہی لوگ جگہ دے دیتے اور مولانا اپنے رفقاء کو قاعدے کے ساتھ کھڑا کر کے نماز ادا کرتے۔

ایک مرتبہ میں ایک سفر سے آیا، میرے ساتھ ایک رفیق اور تھے جن کو ریل پر ہجوم کی وجہ سے نماز پڑھنے کی نوبت نہیں آئی تھی، ملتے ہی دریافت فرمایا، نماز پڑھی؟ عرض کیا کہ میں نے تو پڑھ لی، میرے رفیق پڑھ رہے ہیں، بڑا افسوس کیا اور اس سلسلہ میں فرمایا کہ میں جب سے اس کام میں لگا ہوں (تقریباً تیس سال سے) ریل پر کوئی نماز جماعت کے بغیر نہیں پڑھی، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے تراویح بھی پڑھوا دی، اگرچہ بعض اوقات تراویح دو ہی رکعت پڑھنے کی نوبت آئی، لیکن کلیۃً ترک نہیں ہوئی۔

مولانا امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے بارے میں خاص اصول اور ترتیب و تدریج کے قائل تھے[1] لیکن جب کھلا ہوا منکر پیش آتا تو قطعاً کوئی مداہنت اور رواداری گوارا نہ کرتے۔ فاذا تعدی الحق لم یقم لغضبہ شیٔ[2] پھر اس استقامت اور تورّع کا اظہار فرماتے جو ان کے اسلاف کرام، مشائخ و علماء راسخین کا شیوہ ہے۔

57ھ کے آخری حج میں کراچی کے دو جہازوں میں مقابلہ ہو گیا۔ ایک جہاز نے 55 روپیہ کرایہ کر دیا اس جہاز کے مسافروں کو ایک عورت انجکشن لگا رہی تھی، مولانا نے غصہ میں فرمایا کہ فریضہ ادا کرنے جا رہے ہیں اور حرام کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ میں غیر محرم عورت کے ہاتھ سے ٹیکہ نہیں لگوا سکتا۔ لوگوں نے کہا کہ اگر تجلت نہ لی گئی اور اس سے ٹیکہ لگوا کر اس جہاز پر نہ چڑھ سکے تو 55 کا ٹکٹ 182 کا ہو جائے گا۔ فرمایا چاہے جتنے کا ہو جائے۔ مولانا نے انکار کر دیا اور جماعت

---

۱ (جب کوئی بات حق کے خلاف ہوتی تو پھر رسول اللہ ﷺ کے غصہ کو کوئی چیز نہ روک سکتی)

۲ روایت مولوی نور محمد صاحب رفیق حج

www.besturdubooks.wordpress.com

ساری جمعیت کی بغون پر فون کیا گیا اور ڈاکٹر جھنجھلاتا ہوا آیا اور کہا کہ وہ پیر صاحب کہاں ہیں جو لیڈی ڈاکٹر سے ٹیکہ نہیں لگواتے؟ مولانا نے اس ڈاکٹر سے ٹیکہ لگوایا اور رفقاء نے بھی ٹیکہ لیا اور ٹکٹ بھی ۵۵ ہی کا ملا۔ مولانا نے فرمایا کہ آج تک کسی غیر محرم نے میرے جسم کو مس نہیں کیا، صرف ایک مرتبہ ایک عورت بیمار تھی، میں گیا تو نزع کی سی کیفیت تھی، اس نے جلدی میں میرے ہاتھ میں ہاتھ دینا چاہا۔ میں نے ہاتھ کھینچ لئے صرف میرے پردے سے اس کا ہاتھ لگ گیا۔"[1]

دعا وانابت الی اللہ:

اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع وانابت، دعا اور ذکر کی کثرت مولانا کی زندگی کی روح رواں اور ان کے نزدیک ان کی اس دعوت وتحریک کا قلب تھا، ایک مرتبہ ارشاد فرمایا:

"ہماری اس تحریک کی صحیح ترتیب یہ ہے کہ اس میں سب سے زیادہ کام دل کا ہو (یعنی اللہ پاک کے سامنے تضرع اور اس کی نصرت پر کامل اعتماد کے ساتھ اس سے استعانت اور دنیا اور ما فیہا سے بالکل منقطع ہو کر اسی کی طرف انابت) اس کے بعد دوسرے درجہ میں جوارح کا کام ہو (یعنی اللہ کی مرضیات کے فروغ کے لئے دوڑ دھوپ اور محنت ومشقت) اور تیسرے درجہ میں زبان کا کام ہو (مطلب یہ کہ سب سے کم مقدار تقریر کی ہو، اس سے زیادہ مقدار سعی جد وجہد کی ہو اور سب سے زیادہ مقدار دل کے کام کی ہو، یعنی اللہ کی طرف انابت اور اسی سے استغاثہ واستعانت۔"[2]

اسی پر مولانا کا عمل تھا اور اسی کی دوسروں کو تاکید ووصیت، اس خاکسار کو ایک گرامی نامہ میں تحریر فرمایا:

> "یہ بات ہمیشہ ملحوظ رہے اور کبھی نظر سے غائب نہ کرے کہ مقصود دین کی ہر چیز کو محض قوت دعا کا بڑھانا ہے، اس میں ہر وقت بہت ہی زیادہ سعی کی جاوے۔ اگر جوارح کے کام میں مشغول ہونے کے وقت قلب قوت کے ساتھ دعا میں مشغول رہنے کی برداشت کر سکے تو اس میں بہت کوشش فرماویں، ورنہ اس امر کے لئے مکتوبات[3] اور سحر اور اسی امر

---

۱ (روایت مولوی نور محمد صاحب رفیق حج)

۲ ("نصرت دین اور اصلاح مسلمین کی ایک کوشش" از مولانا محمد منظور صاحب نعمانی)

۳ یعنی فرض نمازوں کے بعد

کے نکلنے کے اطراف [1] اور درمیان کے خالی اوقات کو دعا سے آباد رکھیں۔

نیابت انبیاء کے اس عظیم و جلیل، نازک و لطیف کام کے لئے جس کا طبیعت پر سب سے بڑا بوجھ رہا کرتا تھا، اہل دل سے مضطرب و بے قرار ہو کر دعا کی درخواست فرماتے۔ وہ اسی کو سب سے بڑی قدر تصور فرماتے، شیخ الحدیث کو تحریر فرماتے ہیں:

"شعبان کے سارے مہینے کے ہر جمعہ کو معمولات جاتا ہوا میرے خیال میں ایک بات ہے وہ میری قابلیت، میری حیثیت سے اونچی بہت ہے، عمل میں لانا تو درکنار فہم و ذکاء کی رسائی سے بھی بہت عالی ہے، لیکن باایں ہمہ میری طبیعت اس امر میں کوشش کرنے سے اور اس خیال میں رہنے سے خالی نہیں ہے، اس لئے بوجہ نہایت فوق الطاقۃ ہونے کے اپنے نہایت اعلیٰ اور نازک اور لطیف اور دین کی اشاعت اور ترقی کا محض واحد مدار ہونے کے باعث آپ جیسوں کی ہمت اور توجہ اور دعا کا نہایت مستحق ہے۔ اس لئے اپنی پوری دعوات سے میری مدد فرمانے میں دریغ نہ فرماویں، حق تعالیٰ شانہ کی بارگاہ سے کسی مطلوب کا ملنا عزیز و بعید نہیں ہے، آپ دعا و ہمت اور توجہ کے ساتھ طلب میں کمی نہ فرماویں، میرے دل کی تمنا ہے کہ کم سے کم میرا دماغ اور خیال اور وقت اور قوت اس امر کے سوا ہر چیز سے فارغ رہے، خیر بس زیادہ کیا عرض، مطلب یہ ہے کہ آپ بھی دعا سے مدد فرمادیں اور بھی سب بزرگوں کے یہاں جہاں تک ہو سکے ان سب سے دعا کرانے اور ہمت کو متوجہ کرنے میں آپ وسیلہ اور شفیع ومساعی بنیں"۔

حضرت شیخ ہی کے نام ایک دوسرے خط میں تحریر فرماتے ہیں:

"میرے عزیز! اس تبلیغ کے بوجھ کو بھاری سمجھتے ہوئے بطور اضطرار کے آپ کی خدمت میں دعا اور ہمت کو سائل ہو کر یہ خط لکھ رہا ہوں۔

"میرے عزیز! اس میں شک نہیں کہ آپ کی ہر طرح کی ہمت اور ہر طرح کی شرکت اس کے فروغ کا سبب ہے۔ اللہ جل شانہ نے جو اس تبلیغ کی نہایت فائدہ بخش اور اصول اسلام کو حاوی نہایت سہل اور نہایت عظیم صورت اس ناچیز کو عنایت فرمائی ہے۔ یہ ناچیز

---

[1] یعنی تبلیغ کے لئے نکلنے اور واپس آنے کے وقت

اس نعمت عظمیٰ جلیلہ کی قدر دانی اور شکر گزاری اور تواضع میں اپنے نفس کو بہت کمتر پا کر اس نعمت کے کفران نعمت سے بہت خائف ہے۔ نیز تمہاری اس ہمت کا اظہار بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ بندہ ناچیز کو اس تبلیغ کے اصول قرار دینے میں آپ کی صحبت کا بڑا دخل ہے، حق تعالیٰ مجھے آپ کے شکر کی توفیق بخشیں۔ اللہ کو منظور ہوا اور جیسے کہ آثار ہیں یہ تبلیغ فروغ پکڑ گئی تو انشاء اللہ تمہاری تصانیف اور فیوض ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ عرب و عجم کو سیراب کریں گی۔ اللہ تعالیٰ تمہیں جزائے خیر دیں۔ میری اس میں دعا سے ضروری ہی مدد کیجیو اور میں بھی دعا کرتا ہوں"۔

ایک تیسرے گرامی نامہ میں موصوف کو لکھتے ہیں:

"اس نازک زمانے میں دلوں سے نکل چکنے والے اقدار سے گرے ہوئے، آنکھوں میں حقارت سے گرے ہوئے دین کی بابت کسی آواز کا کسی کان تک پہنچنا، اور زور دار کسی دل کے اندر اترنے کی امید رکھنا محال اور بادہ سست آور دن کے برابر ہے، کتنی ضرورت ہے، اس وقت اس کا استغراق برابر دوش بدوش چل رہا ہے، فضول خیالات میں مرگھوار یا نہایت مرغوب و مستحسن نظر آ رہا ہے۔ تھوڑے سے تھوڑا وقت سلف کے طریقہ میں گزار دینے سے اور پھر اس کے ساتھ ساتھ اپنے اندرونی جذبہ ہمت کا ضعف اور اپنا عجز، عقل و فہم کا قصور اس طرف چھوٹی سے چھوٹی حرکت کرنے سے روکتا ہے، ہاں بہرحق جل علا شانہ کے فرمان عالی کی حقانیت و مواعید کی عظمت اور اس کے وعدہ عظیمہ پر نظر بیٹھنے بھی نہیں دیتی، طرفین کی کشاکش سے ضعیف طبع پر اضمحلال و حیرانی رہتی ہے اس نازک مقام پر کیا کیا جاوے۔ میرا مقصد اس تحریر سے یہ ہے کہ آپ جیسے باہمت اہل دل اصحاب موقع کی نزاکت کے بقدر اور حیثیت کے موافق حق تعالیٰ کے جناب عالی میں تضرع اور زاری کے ساتھ دست بدعا ہوں اور دوسرے دوستوں کو کہیں کہ یہ کام اس زمانہ میں ہم جیسوں کی طاقت سے بہت اونچا ہے چھوڑنا اور بے التفاتی بھی خطرناک ہے اور قدم اٹھانے کا بھی یارا نہیں۔ اللہ ہی بڑا سہارا ہے"۔

اہم مواقع پر (اور مولانا کے نزدیک ہر تبلیغی موقع کی اہمیت تھی) خود بھی دعا کی طرف متوجہ ہوتے اور اہل دل کو بڑے اضطرار کے ساتھ دعا کی طرف متوجہ فرماتے۔ 20 جنوری 39ء کو شیخ

الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کو تحریر فرماتے ہیں:

"اس جلسہ کو طرفین کے مجمعوں میں خاص تبلیغی غرض کے لئے پہاڑ گنج کی جماعتوں کی طرف سے انعقاد جلسہ قرار پایا نہایت فضل عظیم یہ ہے کہ اس کی پہلی شب میں مولانا حسین احمد صاحب مبلغ تحریک قرار پائے ہیں، خدا جانے کیوں میرے دل پر ان کے اس مقصد کے لئے تشریف آوری پہلی مرتبہ ہونے کی بنا پر اثر عظیم کر رہی ہے، اسی اثر کی بنا پر سائل و طالب عاجز ہو کر آپ کی بارگاہ کی طرف ملتجی ہوں کہ اس جلسہ کے مقررین و سامعین کے استقلال و طمانیت کا سامان کام پر جمنے اور نہایت جمنے اور چالو ہونے کے لئے بارگاہ ایزدی میں ملتجی ہو کر خشوع و خضوع بہت استقلال سے دیں اور اس کے لئے پوری طرح صرف ہمت فرما دیں اور جس کو آپ مناسب سمجھیں اور موقع ہو تو اس کی کامیابی کی دعا و صرف ہمت میں مشغول رکھیں۔ ظاہری کوئی تدابیر اس کی تثبیت و تحکیم کی ذہن میں آوے اس میں سعی کریں۔"

مولانا بڑی دیر تک اور بڑی بے قراری اور اضطرار کی کیفیت کے ساتھ دعا فرماتے تھے اور دعا کی حالت میں اکثر ان پر خود فراموشی کی سی کیفیت طاری ہو جاتی اور عجیب عجیب مضامین کا ورود ہوتا۔ پانچوں وقت کی نمازوں کے بعد خصوصاً میوات کے سفروں میں بڑی پُر اثر دعا میں فرماتے اور اکثر وہ مستقل تقریریں ہوتیں، دعا شروع سے دل کھول کر مانگتے اور ہر وقت اپنی طرف سے کئی بار کرتے تقریروں کے درمیان یہ فقرہ ابھی تک سننے والوں کے کانوں میں گونج رہا ہے "مانگو اللہ سے"۔

ادعیہ ماثورہ میں سے یہ دعائیں اکثر خصوصاً اس کام کے سلسلہ میں ورد زبان رہتی تھیں۔

اللهم ان قلوبنا و نواصينا و جوارحنا بيدك لم تملكنا منها شيئا فاذا فعلت ذلك بنا فكن انت ولينا و اهدنا الى سواء السبيل - اللهم اصنع بنا ما انت اهله و لا تصنع بنا ما نحن اهله اللهم لا سهل الا ما جعلته سهلا و انت تجعل الحزن سهلا اذا شئت لا اله الا الله الحكيم الكريم

اے اللہ ہمارے دل ہماری پیشانیوں کے بال اور ہمارے قویٰ و جوارح سب تیرے ہاتھ میں ہیں تو نے ان میں کچھ بھی ہمارے اختیار میں نہیں دیا اور جب تو نے ایسا

کیا ہے تو ہی ہمارا کارساز ہو جا اور ہم کو سیدھے راستے کی طرف ہدایت دے۔ اے اللہ ہمارے ساتھ اپنے شایان شان سلوک فرما اور ہمارے شایان سلوک نہ فرما۔ اے اللہ آسان وہی ہے جس کو تو آسان کردے اور تو دشوار کو بھی آسان کر دیتا ہے جب تو چاہے اللہ حلیم و کریم کے سوا کوئی معبود نہیں

اور یہ دعا تو تھوڑے سے وقفے سے ہمیشہ ورد زبان رہتی

یا حی یا قیوم برحمتک استغیث اصلح لی شانی کله و لا تکلنی الی نفسی طرفة عین فانک ان تکلنی الی نفسی تکلنی الی ضعف و عورة و ذنب و خطیئة انه لا یغفر الذنوب الا انت	اے وہ جو زندہ ہے اور جس کے سہارے زمین و آسمان تھمے ہوئے ہیں میں تیری رحمت سے داد خواہ ہوں میری ساری حالتیں درست کر دے اور مجھے پل بھر بھی اپنے نفس کے حوالے نہ کر اس لئے کہ اگر تو مجھے اپنے نفس کے حوالے کردے گا تو کمزوری، عیب، گناہ اور جرم کے حوالے کرے گا۔ گناہوں کا بخشنے والا تو ہی ہے۔

تبلیغی سفر کے وقت تمام اذکار و ادعیہ ماثورہ کا التزام کرتے اور دعا و ذکر کی بڑی کثرت کرتے، بعض لوگوں کو مستقل دعا اور سورہ یسین کے ختم کی ہدایت کرتے اور بہت ہی اضطرار اور انابت الی اللہ کی کیفیت ہوتی گویا سفر جہاد ہے اور اذا لقیتم فئة فاثبتوا و اذکروا الله کثیرا لعلکم تفلحون کا موقع۔

اللہ سے تعلق اور اس کی طرف رجوع و انابت اور اس کی رحمت پر اعتماد کا نتیجہ تھا کہ اللہ پر پورا بھروسہ تھا اور بڑی سے بڑی اور مشکل سے مشکل بات کے لئے اطمینان تھا کہ ہو سکتی ہے۔ ایک روز اپنے عزیز رفیق سے فرمایا کہ اگر تم کو اصلاح کے سلسلہ میں مکاتب و مدارس ہی پر اعتماد ہے تو میوات میں ایک ہزار مکتبوں کا نظام بناؤ اور اپنی ذمہ داری پر اس کام کو اٹھاؤ، اگر تم اس کے لئے تیار ہو جاؤ میں تمہارے جواب دینے سے دو دن بعد ایک ہزار مکتبوں کا ایک سال کا پورا خرچ (جو

لاکھ روپیہ) ختم کر دے دوں گا مگر شرط یہ ہے کہ میں اس پر اپنا وقت اور اپنی فکر بالکل صرف نہیں کروں گا، تم ہی کو ذمہ داری سنبھالنا ہو گی، میں اسی طرح اپنے کام میں لگا رہوں گا۔ پھر فرمایا کہ تم کو معلوم ہے کہ میرے پاس شاید چھدام بھی نہ نکلیں، لیکن مجھے یقین ہے کہ جس دن اللہ کے کسی کام کا ارادہ کر لیا جائے گا اس کے بقدر روپیہ اللہ تعالیٰ ایک دن میں مہیا کر دے گا۔

ایک روز چندہ کی پیش کش کرنے والے ایک صاحب سے بڑے استغنا اور اعتماد علی اللہ کے ساتھ فرمایا کہ مجھے یقین ہے کہ اگر میں رسول کریم ﷺ کے دین کا کام کروں گا تو اللہ تعالیٰ اس عمارت کو (دارالاقامت کی طرف اشارہ کر کے) سونے چاندی کا بنا دے گا۔

سفروں میں وہ خواہ کیسے ہی تھک کر چور ہو گئے ہوں نوافل کے لئے تازگی اور توانائی پیدا ہو جاتی فرماتے تھے کہ میرا تکان نماز سے دور ہوتا ہے، ایسا ہوا ہے کہ پہاڑی چڑھائی عبور کر کے اور پہنچے ہیں، خوب بے دم ہو کر آرام کے لئے پڑ گئے اور مولانا نے نفل کی نیت باندھ لی دن بھر کے تھکے ہوئے اور رات کے جاگے ہوئے ہیں، مغرب کے بعد دیکھئے تو اوابین پڑھ رہے ہیں اور کئی کئی پارے اس نشاط کے ساتھ پڑھ رہے ہیں گویا تازہ دم ہیں۔

باب ہشتم

مولانا کی دعوت کا ذہنی پس منظر اس کے اصول ومبادی اور اس کی دینی فکری اساس

مسلمانوں میں ایمان ویقین کے تنزل کا احساس:

جس مبارک دینی ماحول میں مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی عمر کا ابتدائی حصہ گزرا تھا، اس کی مخصوص دینی وروحانی فضا کی وجہ سے بمشکل اس بات کا احساس ہوسکتا تھا کہ مسلمانوں سے ایمان ویقین کی دولت سرعت سے نکلتی جارہی ہے۔ دین کی طلب ور قدر سے دل تیزی کے ساتھ خالی ہوتے چلے جارہے ہیں۔ اس ماحول میں چونکہ صرف خواص اہل دین اور اہل طلب سے واسطہ پڑتا تھا، اس لئے مسلمانوں کی دین سے بڑھتی ہوئی بے نیازی اور اس کی ناقدری اور اس کی تحقیر کا کوئی گہرا تجربہ اور احساس نہ ہوتا۔ بے موقع نہ تھا، وہاں رہ کر یہی تصور ہوسکتا تھا کہ مسلمانوں کی زندگی کی دعوت وتبلیغ اور دین کی ابتدائی جدوجہد کی منزل سے آگے بڑھ چکی ہے اور اب صرف مدنی زندگی کے تکمیلی مشاغل کی ضرورت ہے، اس لئے وہاں رہ کر مدارس دینیہ کے قیام واہتمام، کتاب وسنت کی اشاعت، درس حدیث، دینی تصنیف وتالیف، فتوٰی وافتاء، رد بدعات، اہل باطل سے مناظرہ اور احقاق حق اور سلوک وتربیت باطنی کے علاوہ کسی اور طرف ذہن کا منتقل ہونا بہت مشکل تھا، وہاں کام کی نوعیت یہ تھی گویا زمین ہموار تیار ہے، اس پر پودے لگانا اور درخت جمانا ہے اور یہ بات وہاں کے حالات کے لحاظ سے غلط بھی نہ تھی کہ اس محدود حلقہ بزرگان دین کی کوششوں سے یقیناً زمین تیار ہو چکی تھی اور دین کے باغات سرسبز تھے۔

اس ماحول کا طبعی تقاضا یہ تھا کہ آپ بھی انہیں شعبوں میں سے کسی شعبہ کی طرف متوجہ ہوتے اور اپنی خداداد استعداد وصلاحیت سے اس میں کمال پیدا کرتے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس بارہ میں آپ کی خاص رہنمائی فرمائی اور آپ کی بصیرت پر یہ حقیقت منکشف کی جس سرمایہ کے اعتماد پر یہ سارا جمع خرچ ہے وہ سرمایہ ہی مسلمانوں کے ہاتھ سے نکلا جارہا ہے۔ جس زمین پر دین کے یہ درخت

نصب کرتے ہیں وہ زمین ریت کی طرح پاؤں کے نیچے سے کھسکتی جا رہی ہے امہات عقائد میں ضعف پیدا ہو گیا ہے اور بڑھتا جا رہا ہے اور خود مولانا کے تعبیرے الفاظ میں امہات عقائد میں امہات ہونے کی شان نہیں رہی ان میں اثبات عقائد (حکمی و فروعی عقائد کی تربیت و پرورش کی طاقت نہیں رہی، خدا کی خدائی اور محمد ﷺ کی رسالت کا یقین کمزور ہوتا چلا جا رہا ہے، آخرت کی اہمیت کم ہوتی جا رہی ہے، اللہ کی بات کا وقار اور رسول کریم ﷺ کے کلام کا وزن اور دین و شریعت کا احترام کم ہو رہا ہے، اجر و ثواب کا شوق (ایمان و احتساب) دل سے اٹھتا جا رہا ہے۔

زندگی کے رُخ کی تبدیلی:

یہ انکشاف و ادراک اس وضاحت اور قوت کے ساتھ ہوا کہ اس سے مولانا کی زندگی کا رُخ بالکل ہی تبدیل ہو گیا اور طریق کار اصولی طور پر بدل گیا، آپ کی زندگی بھر کی جدوجہد اور دعوت و تحریک کی بنیاد در اصل اسی احساس و ادراک کا اثر تھا کہ مسلمانوں میں دین کی بنیاد متزلزل ہے جاوہ اصل کام اسی کا استحکام ہے، آپ کی ساری جدوجہد کا محور و مرکز یہی خیال تھا جس نے آپ کی توجہ دلچسپی کو ہر رُخ سے ہٹا کر اسی ایک نقطہ پر مرکوز کر دیا۔

مولانا حسین احمد صاحب کو ایک خط میں اپنی اس تحریک کا مقصد اس طرح تحریر فرماتے ہیں۔

> ”نماز، روزہ، قرآن، انقیاد مذہب اور اتباع سنت کا نام لیجئے اور ان چیزوں کا تذکرہ کرنے سے ان چیزوں کے ساتھ عالم اسلام میں تمسخر اور مضحکہ و استخفاف کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رہتا۔ امور مذکورہ کی حرمت و عظمت کی طرف دعوت دیتے ہی پر اس تبلیغ کی تحریک کا دار و مدار ہے اور یہی اس کی بنیاد ہے کہ استخفاف کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رہتا، امور مذکورہ کی حرمت و عظمت کی طرف دعوت دینے ہی پر اس تبلیغ کی تحریک کا دار و مدار ہے اور یہی اس کی بنیاد ہے کہ استخفاف سے تعظیم کی طرف فضائے عالم کے انقلاب کی کوشش کی جائے“۔

مسلمانوں میں دینی طلب اور قدر کا فقدان:

آپ نے یہ اچھی طرح محسوس کر لیا کہ ایسی حالت میں کہ مسلمانوں میں ایمان و یقین رو بہ تنزل ہیں، دین کی قدر و عظمت دلوں سے اٹھتی جا رہی ہے، عام مسلمان دین کی ابتدائی اور بنیادی

چیزوں سے محروم ہوتے جا رہے ہیں لہٰذا ان تکنیکی شعبوں کا قیام جو دین کی جڑ پکڑ جانے کے بعد کی چیزیں ہیں ذرا قبل از وقت ہیں۔ طبائع اور رجحانات کے سیلاب کے رخ کو خداداد فراست و بصیرت سے پہچان کر آپ نے اچھی طرح محسوس کر لیا کہ نئے دینی اداروں کا قیام تو الگ رہا پرانے اداروں اور دینی مرکزوں کی زندگی بھی ایسی حالت میں خطرہ سے باہر نہیں، اس لئے وہ رگیں اور شرائین جن سے ان میں خون زندگی آتا تھا، مسلمانوں کے جسم میں برابر خشک ہوتی جا رہی ہیں، ان کی طلب اور ان کی ضرورت کا احساس اور ان کے قائم ہو جانے کے بعد ان کی قدر اور ان کی خدمت گزاروں کی خدمات کا اعتراف ختم ہو رہا ہے، شیخ حاجی رشید احمد صاحب کے نام (جو متعدد مرکزی دینی مدارس کے معاون و رکن ہیں) ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں

"اب سے چندرہ برس پہلے ہی کو تاہ نظر نے لیکن اللہ کی دی ہوئی بصیرت سے میں نے اہل دنیا کے طبائع کے میل کو بھانپ لیا تھا اور یہ اندازہ لگا چکا تھا کہ یہ رفتار مکاتب اور مدارس کی جو چل رہی ہے یعنی لوگوں کا میلان اور ان کی رغبت (جس کی وجہ سے مکتبوں اور مدرسوں میں طلب کی کوشش کرنے والے کھڑے ہوتے ہیں اور چندہ دینے والے چندہ دیتے ہیں) یہ عنقریب ختم ہونے والی ہے اور آگے چل کر اس کا مسدود ہے"۔

آپ نے ان دینی مدارس کے عین مرکزوں میں رہ کر اپنی ذکاوت حس اور فراست ایمانی سے یہ بھی محسوس کر لیا تھا کہ علوم دینیہ دنیا طلبی کی وجہ سے اور ایمان و اجر طلبی کی کمی کی وجہ سے ان طلبہ کے لئے غیر نافع بلکہ ان کے لئے وبال اور حجت بنتے جا رہے ہیں اور دوسری طرف عام مسلمانوں کی عدم توقیر اور احترام اور ناقدری کی وجہ سے وہ ضائع اور ان کے لئے قہر کا باعث ہوتے جا رہے ہیں۔ ایسی حالت میں ان مدارس کا نفع اور ان علوم کی برکت و تاثیر بھی روز بروز ناقص ہوتی جا رہی ہے۔

اسی مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

"دوسری وجہ یہ ہے کہ علوم جن اغراض کے لئے اور جن اثرات و منافع کے لئے حاصل کئے جاتے تھے ان علوم کے ساتھ وہ اغراض وابستہ نہ رہنے کے باعث عموم بیکار ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اب علوم سے وہ منافع اور اغراض حاصل نہیں ہوتے جن کی وجہ سے توقیر اور تحصیل تھی، ان دو باتوں پر نظر کرتے ہوئے میں نے اس طرز کی

طرف اپنی توجہ کو متوجہ کیا"۔

مولانا مدارس دینیہ کے وجود کو مسلمانوں کے لئے نہایت ضروری سمجھتے تھے اور اس سایۂ رحمت کے مسلمانوں کے سروں سے اٹھ جانے کو موجب وبال اور قہر سمجھتے تھے، لوگوں کی ناقدردانی اور غفلت سے دینی مدارس اور مکاتب کی ایک بڑی تعداد میوات میں معطل ہو گئی تھی حاجی صاحب کو اسی خط میں اس کے متعلق تحریر فرماتے ہیں۔

"لوگوں کو یہ بات ذہن نشین کرانے میں آپ ہمت فرما دیں کہ مکتبوں مدرسوں کا سست پڑ جانا یا بند ہو جانا اس زمانہ کے لئے نہایت وبال اور نہایت بے دینی کا خطرہ رکھتا ہے کہ قرآن دنیا سے مٹ چلا جائے اور ہمارے بچوں میں اس کا کوئی حصہ اور ہمارے دلوں میں اس کا کوئی ورود نہ ہو۔ یہ سب باتیں خطرناک ہیں"۔

لیکن مولانا سمجھتے تھے کہ ان مدارس کا وجود و قیام اس دینی جذبہ پر ہے جو ہم سے اسلاف چھوڑ کر گئے تھے، اصل دین کی تبلیغ اور جدوجہد کی بدولت مسلمانوں میں دین کی جو طلب اور قدر پیدا ہوئی تھی، اسی کا نتیجہ تھا کہ اس دین کو اپنی نسل میں پیدا کرنے کے لئے اور اس کو دنیا میں قائم و باقی رکھنے کے لئے دیندار مسلمانوں نے جابجا یہ مکاتب و مدارس قائم کئے اور ان کی خدمت کو اپنی سعادت سمجھا۔ اسی پچھلی طلب اور قدر کا نتیجہ ہے کہ ابھی تک یہ مدارس چل رہے ہیں اور ان کو طالب علم مل رہے ہیں، لیکن اس سرمایۂ طلب میں برابر کمی آرہی ہے اور اضافہ نہیں ہو رہا ہے۔ یہ صورت حال دین کے مستقبل اور دینی اداروں کے وجود و بقاء کے لئے سخت تشویشناک ہے، جس ذخیرہ اور اندوختہ میں برابر کمی ہو اور اضافہ کبھی نہ ہو (خواہ کمی روزانہ ایک قطرہ کی ہو) وہ اگر سمندر بھی ہو تو ایک روز خشک ہو جائے گا۔

طلب و احساس کی تبلیغ:

مولانا کو اس کا پوری شدت سے احساس ہوا کہ اس وقت سب سے مقدم اور ضروری کام طلب کی تبلیغ اور مسلمانوں میں مسلمان ہونے کا احساس پیدا کرنا ہے اور یہ کہ دین سیکھے بغیر نہیں آتا اور دنیا کے ہنروں سے زیادہ اس کے سیکھنے کی ضرورت ہے، یہ احساس اور طلب اگر پیدا ہو گئی تو باقی مراحل و منازل خود طے ہو جائیں گے، اس وقت کے مسلمانوں کا عمومی مرض بے حسی اور بے طلبی ہے، لوگوں نے غلط فہمی سے سمجھ لیا ہے کہ ایمان تو موجود ہی ہے، اس لئے ایمان کے بعد جن

چیزوں کا درجہ ہے، ان میں مشغول ہو گئے، حالانکہ سرے سے ایمان پیدا کرنے ہی کی ضرورت باقی ہے۔

قرون اولیٰ کے مقابلہ میں تعلیم و تبلیغ و ارشاد و اصلاح میں ایک عظیم تغیر یہ ہوا کہ ان کا دائرہ طالبین کے لئے محدود ہو کر رہ گیا، اہل طلب کے لئے تعلیم و اصلاح اور ہدایت و ارشاد کا پورا انتظام اور اہتمام تھا، لیکن جن کو اپنے مرض کا احساس ہی سرے سے نہیں اور جو طلب سے خالی ہیں ان کی طرف توجہ بالکل ہٹ گئی، حالانکہ ان میں طلب کی تبلیغ کی ضرورت تھی، انبیاء علیہم السلام کی بعثت کے وقت سارا عالم مستغنی اور سود و زیاں سے بے پروا ہوتا ہے۔ یہ حضرات انہی میں طالب علم پیدا کرتے ہیں اور کام کے آدمی حاصل کر لیتے ہیں، بے طلبوں اور بے حسوں میں طلب و احساس پیدا کرنا ہی اصل تبلیغ ہے۔

طریق کار:

اس احساس طلب دین اور اسلام کے اصول و مبادی کی تلقین کا ذریعہ کیا ہے؟ اسلام کا کلمہ طیبہ ہی اللہ کی رسی کا وہ سرا ہوئے جو ہر مسلمان کے ہاتھ میں ہے، اسی سرے کو پکڑ کر اسے پورے دین کی طرف کھینچ سکتے ہیں، وہ کشمکش نہیں کر سکتا، مسلمان جب تک اس کلمہ کا اقرار کرتا ہے اس کو دین کی طرف لے آنے کا موقع باقی ہے۔ اس موقع کے (خدانخواستہ) نکل جانے سے پہلے اس سے فائدہ اٹھا لینا چاہیے۔

اب مسلمانوں کی اس وسیع اور منتشر آبادی میں دین کا احساس و طلب پیدا کرنے کا ذریعہ یہی ہے کہ ان سے اس کلمہ ہی کے ذریعہ تقریب پیدا کی جائے اور اسی کے ذریعہ خطاب کیا جائے کلمہ یاد نہ ہو تو کلمہ یاد کرایا جائے، غلط ہو تو اس کی تصحیح کی جائے، کلمہ کے معنی و مفہوم بتائے جائیں اور سمجھایا جائے کہ اللہ کی بندگی و غلامی اور رسول کی تابعداری کا اقرار ان سے کیا مطالبہ کرتا ہے، اس طرح ان کو اللہ اور رسول کے احکام کی پابندی پر لایا جائے جن میں سب سے عمومی، سب سے مقدم اور سب سے اہم نماز ہے، جس میں اللہ نے یہ قابلیت رکھی ہے کہ وہ سارے دین کی استعداد و قوت پیدا کر دیتی ہے۔ جس بندگی کا کلمہ میں اقرار تھا، اس کا یہ پہلا اور سب سے کھلا ثبوت ہے پھر اس شخص کی مزید ترقی اور استحکام کے لئے اس کو اللہ سے تعلق پیدا کرنے اور اس تعلق کو بڑھانے کی طرف متوجہ کیا جائے اور اللہ کو زیادہ یاد رکھنے اور یاد کرنے کی ترغیب دی

ہے کہ یہ بات اس کے ذہن نشین کی جائے کہ مسلمانوں کی طرح زندگی گزارنے کے لئے اللہ کی مرضی و منشاء اور اس کے احکام و فرائض معلوم کرنے کی ضرورت ہے۔ دنیا کا کوئی ہنر اور کوئی فن بے سیکھے اور کچھ وقت صرف کئے بغیر نہیں آتا، دین بھی بے طلب کے نہیں آتا اور اس کو آیا ہوا سمجھنا غلطی ہے، اس کے لئے اپنے مشاغل سے وقت کا نکالنا ضروری ہے۔

یہ کام اتنا بڑا اور اتنا پھیلا ہوا ہے کہ اس کے لئے چند افراد اور جماعتیں کافی نہیں، اس کے لئے عام مسلمانوں کی مسلمانوں میں کوشش کرنے کی ضرورت ہے۔ اس لئے کہ بقول مولانا محمد الیاس صاحب اگر کروڑوں کے واسطے لاکھوں نہیں اٹھیں گے تو کس طرح کام ہوگا، نہ جاننے والے جتنے کروڑ ہیں جاننے والے اتنے لاکھ نہیں۔

مولانا کے نزدیک اس کام کے لئے عالم اسلام میں ایک عمومی اور دائمی حرکت و جنبش کی ضرورت ہے اور یہ حرکت اور جنبش مسلمانوں کی زندگی میں اصل اور مستقل ہے۔ سکون و توقف اور دنیا کا اشتغال عارضی ہے، دین کے لئے اسی حرکت و جنبش پر مسلمانوں کی جماعت کی بنیاد رکھی گئی اور یہی ان کے ظہور کی غرض و غایت ہے کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف و تنھون عن المنکر و تؤمنون باللہ۔ دنیا کے سکون و مادی انہماک، کاروباری مصروفیت اور شہری زندگی کے کسی ضروری شعبہ میں کوئی ایسی کمی نہ تھی جس کی تکمیل کے لئے ایک نئی امت کی ضرورت ہو۔

مسلمانوں نے جب سے اس جماعتی زندگی اور اصلی کام کو چھوڑ دیا ثانوی درجہ دے دیا اس وقت سے ان کا انحطاط شروع ہو گیا اور جب سے ان کی زندگی میں سکون و استقرار اور پرسکون و معروف شہری زندگی کی کیفیات و خصوصیات پیدا ہو گئیں اور ان کا روحانی تنزل اور اندرونی ضعف شروع ہو گیا جس کا عنوان خلافت راشدہ کا خاتمہ ہے۔ مولانا محمد الیاس صاحب فرماتے ہیں اور تاریخ اس کی لفظ لفظ تائید کرتی ہے اور ان کے ہر دعوے پر شہادتیں پیش کرتی ہیں۔

"ہم نے جماعتیں بنا کر دین کی باتوں کے لئے نکلنا چھوڑ دیا حالانکہ یہی بنیادی اصل تھی۔ حضور کریم ﷺ خود پھرا کرتے تھے اور جس نے ہاتھ میں ہاتھ دیا وہ بھی مجبوراً نہ پھرا کرتا تھا۔ مکہ کے زمانے میں مسلمین کی مقدار افراد کے درجہ میں تھی تو ہر فرد مسلم ہونے کے بعد بطور فردیت و شخصیت کے منفرداً دوسروں پر حق پیش کرنے کے لئے کوشش کرتا رہا۔ مدینہ میں اجتماعی اور متمدن زندگی

تھی، وہاں پہنچتے ہی آپ نے چہار طرف جماعتیں روانہ کرنی شروع کر دیں اور جو بڑھتے گئے وہ عسکریت کی طرف بڑھتے گئے، سکونی زندگی صرف انہیں کو حاصل تھی جو پھرنے والوں کے لئے قد (مرجع) اور پھرتے رہنے کا ذریعہ بن سکیں، غرض پھرنا اور دین کے لئے جدوجہد اور نقل و حرکت میں رہنا اصل تھا، جب یہ چھوٹ گیا جب ہی خلافت ختم ہو گئی۔

نظام کار:

اس کام کے لئے جب مسلمانوں کی جماعتیں نقل و حرکت میں آ جائیں تو ان کے کام کا نظام کیا ہوگا اور ترتیب کیا ہوگی؟ کس چیز کی اور کتنی چیزوں کی دعوت دی جائے گی؟ اس کا جواب مولانا ہی کے الفاظ میں سنئے:

" اصل تبلیغ صرف دو امر کی ہے، باقی اس کی صورت گری اور تشکیل ہے، ان دو چیزوں میں ایک مادی ہے اور ایک روحانی، مادی سے مراد جوارح سے تعلق رکھنے والی۔ سو وہ تو یہ ہے کہ حضورﷺ کی لائی ہوئی باتوں کو پھیلانے کے لئے ملک بہ ملک اور اقلیم بہ اقلیم جماعتیں بنا کر پھرنے کی سنت کو زندہ کرنے کر کے فروغ دینا اور پائیدار کرنا ہے۔ روحانی سے مراد اور جذبات کی تبلیغ یعنی حق تعالیٰ کا حکم پر جان دینے کا رواج ڈالنا جس کو اس آیت میں ارشاد فرمایا

فلا و ربك لا يؤمنون حتى يحكموك فيما شجر بينهم ثم لا يجدوا في انفسهم حرجا مما قضيت و يسلموا تسليما	قسم ہے آپ کے رب کی یہ لوگ ایمان دار ہوں گے جب تک یہ بات نہ ہو کہ ان کے آپس میں جو جھگڑا واقع ہو اس میں آپ سے یہ لوگ تصفیہ کرا دیں، پھر آپ کے تصفیہ سے اپنے دلوں میں تنگی نہ پاویں اور پورا پورا تسلیم کر لیں۔
و ما خلقت الجن و الانس الا ليعبدون	اور میں نے جن و انس کو اسی واسطے پیدا کیا ہے کہ میری عبادت کریں

یعنی اللہ کی باتوں اور اوامر خداوندی میں جان کا بے قیمت اور نفس کا ذلیل ہو جانا۔

1- نکلنے کے بوقت حضور ﷺ کی لائی ہوئی چیزوں میں جو چیز جتنی زیادہ اہم ہے اس میں اسی کی حیثیت سے کوشش کرنا، اس وقت بدقسمتی سے ہم کلمہ تک سے نا آشنا ہو رہے ہیں اس لئے سب سے پہلے اسی کلمہ طیبہ کی تبلیغ ہے جو کہ خدا کی خدائی کا اقرار نامہ ہے یعنی اللہ کے حکم پر جان دینے کے علاوہ در حقیقت ہمارا کوئی بھی مشغلہ نہیں ہوگا۔

2- کلمہ کے لفظوں کی تصحیح کرنے کے بعد نماز کے اندر کی چیزوں کی تصحیح کرنے اور ایمانداروں کو حضور ﷺ کی طرز جیسی نماز بنانے کی کوشش میں لگے رہنا

3- تین وقتوں کو (صبح و شام اور کچھ حصہ شب کا) اپنی حیثیت کے مناسب تحصیل علم و ذکر میں مشغول رکھنا۔

4- ان چیزوں کو پھیلانے کے لئے اصل طریقہ محمدی سمجھ کر نکلنا یعنی ملک بملک روانی دینا۔

5- اس پھرنے میں خلق کی مشق کرنے کی نیت رکھنا، اپنے فرائض (خواہ خالق سے متعلق ہوں یا خلق کے ساتھ) کی ادائیگی کی سرگرمی، کیونکہ ہر شخص سے اپنے ہی متعلق سوال ہوگا۔

6- تصحیح نیت یعنی ہر عمل کے بارے میں اللہ نے جو وعدے وعید فرمائے ہیں ان کے موافق اس امر کی تعمیل کے ذریعہ اللہ کی رضا اور موت کے بعد والی زندگی کی درستی کی کوشش کرنا۔

اس زمانہ میں ایک بڑا فتنہ جو ہزاروں خرابیوں اور فسادات کا سرچشمہ ہے اور جس نے ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کی خوبیوں سے محروم اور اس قوم کو مسلمانوں کی مجموعی خوبیوں اور برکات سے بہت کچھ محروم کر دیا ہے مسلمانوں کی تحقیر ہے۔ ہر مسلمان نے گویا ایک کلیہ کے طور پر طے کر رکھا ہے کہ اس کی ذات مجموعہ محاسن اور دوسرے مسلمانوں کی ذات مجمع معائب ہے، اس لئے وہ خود لائق تسلیم و تعظیم اور دوسرا لائق تنقید و تحقیر ہے۔ یہ ذہنیت، یہ طرز عمل ان تمام فتنوں کا اصلی سبب ہے جو مسلمانوں کی اجتماعی اور مذہبی زندگی میں رونما ہوئے اور جن سے آج مسلمان پریشان ہیں۔

یہ اللہ کی بڑی توفیق اور دستگیری تھی اس نے اس بارہ میں مولانا کو خاص توفیق بخشی، انہوں نے اکرام مسلم کو اپنی تحریک کے اصول و ارکان میں خاص جگہ دی۔ ان کی تحریک کی ساخت اور نوعیت ہی ایسی ہے، ہر قسم کے مسلمانوں سے اس سلسلہ میں اتنا سابقہ اور معاملہ پڑتا ہے اور اتنے دشوار

مرحلے پیش آتے ہیں اگر اس اصول کی پابندی نہ ہو اور اس کے مطابق ذہنی اور اخلاقی تربیت نہ ہوئی تو ہزاروں فتنے اس سے اٹھ سکتے ہیں اور خود مولانا کے قول کے مطابق جو فتنے صدیوں میں آتے اس تحریک کو بے اصولی کے ساتھ لے کر کھڑے ہونے اور خلاف اصول کام کرنے سے ہفتوں اور دنوں میں پیش آجائیں گے۔

مولانا نے اس ترتیب کو "اپنی ذات کو آدمی مجموعہ محاسن اور دوسرے کی ذات کو مجموعہ معائب سمجھے" (جس کا اس زمانہ میں رواج ہے) اس طرح بدل دیا ہے کہ "اپنے عیوب اور کوتاہیوں پر نظر رکھے اور دوسرے کے محاسن اور ہنر پر۔ اس کے ان محاسن سے منتفع ہونے کی کوشش کرے، اس کے عیوب اگر کچھ نظر آئیں تو ان کی پردہ پوشی کرے اور اس کے محاسن کو ان عیوب پر غالب رہ کر مستند کرنے کی کوشش کرے، یہ تمام فتنوں کا سدباب اور تمام امراض کا علاج ہے۔ اپنے ایک گرامی نامہ میں ایک مرتبہ تحریر فرمایا:

"کوئی شخص اور کوئی مسلم ہرگز ایسا نہیں کہ کچھ خوبیوں اور کچھ خرابیوں سے خالی ہو۔ ہر شخص میں یقیناً کچھ خوبیاں اور کچھ خرابیاں ہوتی ہیں۔ اگر خرابیوں کے ساتھ نظر اندازی اور ستر (پردہ پوشی) کا اور خوبیوں کی پسندیدگی اور ان کے اکرام کا ہم مسلمانوں میں رواج ہو جائے تو بہت سے فتنے اور بہت سی خرابیاں اپنے آپ کو دنیا سے اٹھ جائیں اور ہزاروں خوبیوں کی اپنے آپ بنیاد پڑ جائے، مگر دستور اس کے خلاف ہے۔"

مولانا نے نظری طور پر نہیں بلکہ عملی طور پر (اور سب سے پہلے اپنے عمل سے) میواتیوں اور تبلیغی کارکنوں کے دل میں کلمہ کی اتنی توقیر اور کلمہ گو کا ایسا احترام بٹھا دیا کہ اکرام مسلم ان کی زندگی کا جزو اور ان کی طبیعت بن گیا۔ مولانا نے ان کو یہ دین بتا دیا کہ ہر فاسق و فاجر مسلمان سے معاملہ کرتے وقت اور عین تبلیغ کے موقع پر ایمان کی اس چنگاری پر نظر رکھیں جو ہر مسلمان کے دل کی خاکستر میں دبی ہوئی ہے اور اس کو مشتعل کرنے کی کوشش کریں، ان کے امتی ہونے کی اس نسبت کا لحاظ کریں جو رسول اللہ ﷺ سے قائم ہے۔

مولانا نے ان کو وہ خوردبین عطا کر دی جس سے وہ ذرہ ایمان کو بھی بڑی جسامت کے ساتھ دیکھ سکیں، اس رکن سے یہ تحریک بہت سے فتنوں اور شرور و آفات سے محفوظ ہو گئی جو تحریک

جا در یوں میں پھرنے اور نئے نئے شہروں اور مجمعوں میں جانے اور اپنی بات پیش کرنے سے پیش آسکتی تھیں۔

ذکر کی پابندی، علم میں اشتغال، لایعنی اور بے کار باتوں سے اجتناب، امیر کی اطاعت اور جماعتی نظام کے ساتھ اس کام کو کرنے کی تاکید نے ان دوسرے فتنوں اور خرابیوں سے محفوظ کر دیا جو ان شرائط و اوصاف کے بغیر دوسروں کی "اصلاح و تادیب" اور ارشاد و تبلیغ کا کام کرنے سے پیدا ہو جاتی ہیں۔

دینی کاموں کے لئے زمین ہموار کرنے کی ضرورت:

مولانا کے نزدیک زمین مذہب، ایمان اور اصول دین ہیں، اور ان کی تبلیغ اور ان کو مسلمانوں میں پیدا کرنے کے لئے نقل و حرکت، ملک بہ ملک پھرنا اور ان کو عمومی رواج دینے کے لئے جدوجہد (جس کا طریق کار اوپر بیان ہوا) زمین ہموار کرنے اور اس کو سیراب کرنے کے مترادف ہے، باقی دینی ادارے، دین کے شعبے اور مسلمانوں کی دینی زندگی کے دوسرے مظاہر و مناظر یہ باغات کا حکم رکھتے ہیں جو اس زمین پر لگائے جا سکتے ہیں، اور اس زمین کی زرخیزی، شادابی اور خدمت و جدوجہد کے بقدر سرسبز اور بارآور ہوں گے، اس لئے پہلی اور سب سے بڑی ضرورت زمین ہموار تیار کرنے کی ہے۔

مولانا نے میوات کے چند دیداروں کے نام ایک خط میں تحریر فرمایا تھا جس میں اس حقیقت کی وضاحت فرمائی تھی۔

> "دین کے ادارے اور جتنے بھی ضرورت کے امور ہیں ان سب (دینی امور) کے لئے تبلیغ (صحیح اصول کے ساتھ ملک ملک پھرتے ہوئے کوشش کرنا) بمنزلہ زمین ہموار کرنے کے ہے اور بمنزلہ بارش کے ہے اور دیگر جتنے بھی امور ہیں وہ اس زمین مذہب کے اوپر بمنزلہ باغات کی پرورش کرنے کے ہیں۔ باغات کے ہزاروں اقسام ہیں، کوئی کھجوروں کا ہے، کوئی اناروں کا ہے، کوئی سیبوں کا، کسی میں کیلے ہیں اور کوئی پھلواریوں کا باغ ہے۔ باغ ہزاروں چیزوں کے ہو سکتے ہیں لیکن کوئی باغ ان چیزوں کے اندر پوری پوری کوشش کرنے کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ پہلی چیز زمین کا ہموار اور درست ہونا، زمین کے ہموار کرنے میں کوشش کئے بغیر یا زمین میں کوشش کر کے خود

ان باغات کی مستقل پرورش کئے بغیر کس طرح باغات پرورش نہیں پا سکتے۔ موجودہ زمین میں تعمیری امور کی کوشش یہ تو زمین غصب ہے، اور سب اوامر سے باغی ہیں۔ اب تک زمین غصب انہی کا ہوا اور ہر طرح کی پیداوار اور باغات اس قدر نامناسب واقع ہوئی ہے کہ کوئی باغ اس پر نہیں لگا"۔

مولانا کے نزدیک اس زمین کی درستی اور اس بنیاد کے استحکام سے پہلے کسی بعد کی چیز میں مشغول ہو جانا اور اس میں اپنی قوت و ہمت صرف کرنا اور اس سے اچھے نتائج کی امید کرنا غلطی تھی۔ ایک گرامی نامہ میں اپنے اس خیال کو اس طرح ظاہر فرماتے ہیں:

"جس قوم کی ابھی تک لا الٰہ الا اللہ کے لفظوں سے بھی درستی نہ ہوئی ہو وہ ابتدا سے درستی کئے بغیر انتہا کی درستی کے کب قابل ہو سکتی ہے۔ انتہا ابتدا کے درست ہوئے بغیر نہیں ہو سکتی اس لئے میں نے درمیانی اور انتہائی خیالات بالکل نکال دیئے۔ ابتدا درست ہو کر راستے پر پڑ جائیں گے تو انتہا پر خود بھی پہنچ جائیں گے اور ابتدا کے بگڑے ہوئے انتہا کی درستی کا خیال ہوس اور لاحاصلی کے سوا کچھ نہیں۔"

ایک مرتبہ میوات میں بعض اختلافی مسائل پر مناظروں کا سلسلہ شروع ہوا۔ لوگ بڑے ذوق و شوق سے ان کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس موقع پر مولانا نے اہل میوات کو ایک خط لکھا جس میں ہدایت فرمائی۔

"تمام ملک کی جامع مسجدوں اور مجمعوں میں اس مضمون کی اشاعت کا اہتمام کیا جائے کہ جو قوم کلمہ طیبہ اور نماز کی چیزوں کی صحیح اور کلمہ شہادت کے مضمون پر اب تک پوری طرح سے مطلع نہ ہوئی ہو جو اسلام کی بنیادی چیز ہے تو بنیادی چیزیں چھوڑ کر اوپر کی چیز میں مشغول ہونا سخت غلطی ہے۔ اوپر کی چیز بغیر بنیادی چیز کے ٹھیک ہونے کے درست نہیں ہوا کرتی[1]۔"

تحریک ایمان:

اسی بنا پر آپ اپنی اس دعوت و تبلیغ کو (جو مسلمانوں میں ایمان پیدا کرنے اور اصول دین کو

[1] (مکتوب بنام حکیم رشید احمد صاحب مودودی خورجوی صاحب)

رواج دینے کے لئے تھی) تحریک ایمان سے منسوب کرتے تھے اور مذہب کے بقاء کے لئے اس کو ایسا ضروری سمجھتے تھے کہ اس کے لئے ہر قربانی اور ہر طرح کی قدر دانی کو صحیح سمجھتے تھے۔ ایک گرامی نامہ میں تحریر فرماتے ہیں:

"ہماری یہ تحریک ایمان جس کی حقانیت کو اہل جہان تسلیم کر چکے ہیں اس کے عمل میں آنے کی صورت بجز اس کے کہ ہر آدمی لاکھ جان کے ساتھ قربان ہونے کو تیار ہو اور کوئی ذہن میں نہیں آتی[1]"۔

وہ مضمون یعنی مضمون تبلیغ بعنوان دیگر اس خاص طریق کے ساتھ اشاعت اسلام کے لئے جہاد فی سبیل اللہ کا ایک ضروری و لازمی فریضہ ہے جس کی طرف مسلمانوں کو توجہ کرنا فرض اور لازمی ہے اور جو بے شک وشبہ دیگر طرق مروجہ کی نسبت اصلی طریقہ نبوی کے زیادہ اشبہ واقرب ہے[2]"۔

غافلوں اور بے طلبوں کو دعوت:

اور یہی سمجھتے ہوئے کہ ایمان اور اصول دین سے وابستگی ہی زمین مذہب ہے جس پر اس کے سارے باغات اور عمارتوں کا دارومدار ہے اور دین کی طلب اور قدر ہی وہ پونجی اور راس المال ہے جو تمام منافع اور ترقیوں کی اصل ہے" آپ نے اپنی توجہ دین کے تمام بعد کے شعبوں اور تکمیلی کاموں سے ہٹا کر بالآخر اسی بنیادی اور اصلی کام پر مرکوز کر لی اور اس میں کامل یکسوئی پیدا کر لی، آپ کو ان شعبوں کے خیر اور حق ہونے میں ذرہ برابر کلام نہیں تھا اور ان کی خدمت کرنے والوں کی دل میں بڑی قدر اور عظمت تھی اور ان کے لئے دعا گو رہا کرتے تھے لیکن تجربہ کے بعد اپنے متعلق طے کر چکے تھے کہ اب صرف اسی کام سے اشتغال رکھیں گے اور بقول خود اپنے سرمایہ درد، سرمایہ فکر اور اللہ کی دی ہوئی قوت کو اس کے سوا کہیں اور صرف نہیں کریں گے"۔

آخری مرض ہی میں ایک روز مولانا عطاء اللہ شاہ بخاریؒ سے آپ نے فرمایا:

"شاہ صاحب! میں نے شروع میں مدرسہ میں پڑھایا (یعنی مدرسہ میں درس دیا) تو طلبہ کا ہجوم ہوا اور اچھے اچھے صاحب استعداد طلبہ کثرت سے آنے لگے۔ میں نے سوچا کہ ان

---

1 (مکتوب بنام مولوی سلیمان صاحب میواتی) 2 (مکتوب دیگر)

کے ساتھ میری محنت کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہوگا جو لوگ عالم مولوی بننے ہی کے لئے مدرسہ آتے ہیں، مجھ سے پڑھنے کے بعد بھی وہ عالم مولوی تو بن ہی جائیں گے اور پھر ان کے مشاغل وہی ہوں گے جو عام طور سے اختیار کئے جاتے ہیں۔ کوئی طب پڑھ کر مطب کرے گا، کوئی یونیورسٹی کا امتحان دے کر اسکول کالج میں نوکری کرے گا، کوئی مدرسہ میں بیٹھ کر پڑھاتا ہی رہے گا۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہ ہوگا۔ یہ سوچ کر مدرسہ میں پڑھانے سے میرا دل ہٹ گیا۔

اس کے بعد ایک وقت آیا جب کہ میرے حضرت نے مجھ کو اجازت دے دی تھی تو میں نے طالبین کو ذکر کی تلقین شروع کی اور ادھر میری توجہ زیادہ ہوئی۔ اللہ کا کرم آنے والوں پر اتنی جلدی کیفیات اور احوال کا ورود شروع ہوا اور اتنی تیزی کے ساتھ حالات میں ترقی ہوئی کہ خود مجھے حیرت ہوئی اور میں سوچنے لگا کہ یہ کیا ہو رہا ہے اور اس کام میں لگے رہنے کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہ کچھ صاحب احوال اور ذاکر شاغل لوگ پیدا ہو جائیں پھر لوگوں میں ان کی شہرت ہو جائے تو کوئی مقدمہ جیتنے کی دعا کے لئے آئے کوئی دوسرے کام کے لئے تعویذ کی درخواست کرے کوئی تجارت و کاروبار میں ترقی کی دعا۔ اور زیادہ سے زیادہ ان کے ذریعہ بھی آگے یونہی طالبین میں ذکر و تلقین کا سلسلہ چلے، یہ سوچ کر ادھر سے بھی میری توجہ ہٹ گئی اور میں نے یہ سوچا کیا کہ اللہ تعالیٰ نے ظاہر و باطن کی جو قوتیں بخشی ہیں، ان کا صحیح مصرف یہ ہے کہ ان کو اسی کام میں لگایا جائے جس میں حضور ﷺ نے اپنی قوتیں صرف فرمائیں اور وہ کام ہے اللہ کے بندوں کو اور خاص طور سے غافلوں، بے طلبوں کو اللہ کی طرف لانا اور اللہ کی باتوں کو فروغ دینے کے لئے جان کو بے قیمت کرنے کا رواج دینا۔ بس ہماری تحریک یہی ہے کہ اور یہی ہم سب سے کہتے ہیں، یہ کام اگر ہونے لگے تو آج سے ہزاروں گنے زیادہ مدرسے اور ہزاروں گنی زیادہ خانقاہیں قائم ہو جائیں، بلکہ ہر مسلمان مجسم مدرسہ اور خانقاہ ہو جائے اور حضور ﷺ کی لائی ہوئی نعمت اس عمومی انداز سے بٹنے لگے جو اس کے شایان شان ہے[1]۔

[1] (رسالہ الفرقان رجب شعبان ۱۳۶۰ھ)

آخر دور میں کبھی کبھی حضرت خواجہ عبید اللہ احرار کا یہ مقولہ نقل کرتے تھے جو امام ربانی حضرت مجدد الف ثانیؒ نے مکتوبات میں نقل کیا ہے۔

اگر من شیخی کنم ہیچ شیخ در عالم مرید
نیابد اما مرا کار دیگر فرمودہ اند و آں
ترویج شریعت و تائید است

اگر میں پیری مریدی کروں تو کسی پیر کو
دنیا میں مرید نہ ملے لیکن میرے سپرد
ایک دوسرا ہی کام ہے اور وہ ہی شریعت
کو رواج دینا اور دین کو تقویت بخشنا

مجدد صاحب اس کی تفصیل فرماتے ہیں:

لا جرم بصحبت سلاطین می رفتند
بتصرف خود ایشاں را منقاد می ساختند
و بتوسل ایشاں ترویج شریعت می
فرمودند
(مکتوب شصت و پنجم)

چنانچہ آپ بادشاہوں کی صحبت میں
تشریف لے جاتے اور اپنے اثر
سے ان کو مطیع بناتے اور ان کے
ذریعہ شریعت کو رواج دیتے۔
(مکتوب ۶۵)

مولانا نے اپنے کو اس کام کے لئے اتنا یکسو کر لیا کہ اگر کسی نے کسی اور بات کی فرمائش کی یا مشغول کرنا چاہا تو معذرت کی، اور ایک دوست کو جنہوں نے تعویذ کی فرمائش کی تھی تحریر فرمایا:

"بھائی اللہ تمہیں خوش رکھے، میں تعویذ گنڈے، جھاڑ پھونک نہیں جانتا۔ میں نے نہیں سیکھے، مجھ سے اگر مذہب پر مضبوط ہونے کے واسطے تبلیغ سیکھو تو سب سے زیادہ مفید ہے دنیا کی زندگی کو سہل کر دے اور مرنے کے بعد کی زندگی کو تر و تازہ رکھے۔ تبلیغ میں مشغول رہنا چاہتا ہوں، جانتا بھی نہیں"۔

ایک دوسرے خط میں ایک دوسرے طالب کو تحریر فرماتے ہیں:

"تعویذ گنڈا کچھ نہیں جانتا۔ میرے یہاں ہر درد کا مرہم تبلیغ ہے، دین کے فروغ سے اللہ راضی ہوتا ہے اور حضور ﷺ کی روح اقدس میں ٹھنڈک پہنچتی ہے، جب اللہ کی رضا اور رسول کو راحت اور ٹھنڈک ہوگی تو اللہ ہر چیز کو خود بخود درست فرمائیں گے۔"

ایک تیسرے خط میں لکھتے ہیں:

"میرے دوست! نہ میں عامل ہوں نہ میں تعویذوں سے واقف ہوں، نہ میں گنڈوں

سے آشنا ہوں، ایک مسجد میں پڑا ہوا ناواقف آدمی ہوں، اللہ کے فضل سے اور اس کی رحمت سے اور اس کے کرم سے مرنے کے بعد کی زندگی درست کرنے کی کوشش کرنے والا ہوں۔ اللہ تعالیٰ مجھے بھی اس مخلوق میں شامل کر دیں جو حضور ﷺ کی نعمت عظمیٰ سے فائدہ اٹھا رہے ہیں، بس اسی چیز میں لگا رہتا ہوں۔ اگر آپ کو یا آپ کے دوستوں کو اس چیز کی ضرورت ہو تو آپ توجہ کریں، شاید کوئی بات ہاتھ لگ جائے اور پلے پڑ جائے"۔

دین کی جڑ کی توجہ کرنے کی ضرورت۔

آپ نے اس چیز کو اچھی طرح پا لیا تھا کہ دین کی جڑ کے خشک ہونے کی وجہ سے اس کی شاخیں اور پتیاں مرجھائی جا رہی ہیں، ارکان و فرائض دین کے اضمحلال کی وجہ سے نوافل، طاعات کی رونق و تازگی و شادابی رخصت ہو رہی ہے، اعمال کی نورانیت و مقبولیت کم ہو رہی ہے، دعاؤں اور اذکار و وظائف کی طاقت و تاثیر اٹھتی جا رہی ہے۔ اس حقیقت کا اظہار اس طرح فرماتے ہیں:

"میرے حضرت! یہ وظیفہ و وظائف اور یہ اللہ کی بارگاہ میں دعائیں اور دین کی لائن کی ہر چیز در حقیقت ایمان کی پھلجھڑیاں اور اس کے پھول پتے ہیں جو نہ درخت اپنی جڑ سے سوکھ چکا ہو اس کے پھول پتوں میں شادابی کہاں سے ہو سکتی ہے، اس واسطے اس بندہ ناچیز کے نزدیک اس زمانے میں نہ دعا کارگر ہے نہ کوئی عمل نہ وظیفہ بار آور ہے اور نہ کسی کی توجہ اور ہمت کارآمد ہے، حدیث شریف میں ہے کہ جس وقت دین کے فروغ کی کوشش ترک ہو چکی ہوگی جس کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کہتے ہیں اس وقت دعاؤں میں راتیں رو کر گزارنے والوں کی دعا مقبول نہیں ہونے کی، ابواب رحمت بند ہو چکے ہوں گے، ابواب رحمت کھلنے کی کوئی صورت نہ ہوگی۔ مسلم کا فروغ اسلام کے فروغ کی کوشش میں لگنے کے اندر کے علاوہ ہرگز متصور نہیں۔ حق عز وجل نے مومن کے ساتھ رحمت کے ساتھ توجہ کرنے اور کرم و الطاف کے ساتھ برتاؤ کرنے کا ارادہ صرف اسی وقت فرما رکھا ہے کہ جب وہ اسلام کے فروغ میں ہو، اسلام کے فروغ میں اپنی سعی صرف کر رہا ہو"۔

دین کے اس روز افزوں انحطاط، ہندوستان میں اسلام کے زوال، عقائد و ارکان دین کے

ضعف و اضمحلال اور مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی لادینیت اور مادہ پرستی نے مولانا کی حساس اور غیور طبیعت پر یہ اثر کیا کہ ساری عمر وہ اس درد سے بے چین رہتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارک کو امت کی اس حالت سے جو اذیت پہنچ رہی ہے اس کو مولانا گویا اپنے قلب میں محسوس کرتے تھے اور اس کی وجہ سے ایک نہ مٹنے والی بے کلی اور خلش رہتی تھی۔ ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

"میں جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی روح پاک کو بھی اس کام کے زندہ ہونے کے بغیر بے چین پا رہا ہوں اور اس وقت دنیا میں مذہب کی تازگی اور تمام دنیا کی اسلامی مخلوق کی بلاؤں اور آفات کا ذریعہ مجھے کھلی آنکھوں دیکھا اسی تحریک کی تازگی میں منحصر نظر آ رہا ہے۔ الحمد اللہ جل جلالہ وعم نوالہ کی طرف سے اس کی نصرت اور تائید کی کھلی آیات نظر آ رہی ہیں اور امیدیں بہت اونچی کامیابی کی سرسبزیوں سے شاداب ہیں۔ جس اس امر میں سبقت و مسابقت کرنے والوں کے لئے خوش نصیبی اور سعادت کا بہت ہی بڑا حصہ نمایاں دیکھ رہا ہوں لیکن سچی رغبت کے ساتھ مبادرت اور مسابقت کرنے والے بہت ہی کم ہیں"۔

دین کے درد کو مولانا ہر مسلمان کے لئے نہایت ضروری سمجھتے تھے، دین کے فروغ سے غفلت اور خالص دنیاوی انہماک سے ان کے نزدیک اللہ سے بعد اور آخرت کی روسیاہی اور شرمندگی کا قوی خطرہ تھا، دوستوں کو خط میں لکھتے تھے:

"اس بات کا ضرور یقین کرنا چاہیے کہ جو شخص اسلام کے مٹنے کا درد لئے ہوئے بغیر مرے گا اس کی موت بدترین موت ہے، مذہب کے فروغ سے غفلت والا اور اپنی لذت اور دنیاوی زندگی میں مست رہنے والا قیامت کے دن روسیاہ اٹھے گا"۔

میرے دوستو! دین کی کوشش میں لگا ہوا شخص مرنے کے وقت تروتازہ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سرخروئی سے ملا کر سکے گا اور محمدی دین سے غفلت میں مرنے والا روسیاہ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے منہ دکھانے کے ناقابل اور بری موت مرے گا۔ دین کے اندر کی کوشش حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے درد کا مرہم ہے، اتنی بڑی ہستی کے مرہم کی فکر نہ کرنا بڑی جہالت اور سخت دلی کی بات ہے۔

اور دین کے فروغ اور اعلاء کلمۃ اللہ کی کوشش و رواں کے لئے ان سب چیزوں میں حصہ لینے سے مولانا کو قیامت میں بڑی توقعات تھیں اور وہ بڑے بڑے منظر ان کو دکھائی دیتے تھے۔ میوات کے ایک جلسہ کے موقع پر تحریر فرماتے ہیں:

'' جلسہ کی کامیابی کی کوشش کرتے وقت یہ غور کر لو کہ انشاء اللہ جلسہ یا ہمی یہاں کے منظر کو اعزاز کلمۃ اللہ کی مجلس میں بدلنے کی کوشش کی ہے تو انشاء اللہ قیامت کے دن اس بڑے مجمع میں جس میں اولین و آخرین جن و انس اور سب مخلوق انبیاء و ملائکہ کی جماعتیں ہوں گی تو یہ کارنامہ انشاء اللہ بر سر منبر مذکور ہوگا۔ حق تعالیٰ اس دن کی خجلت تم لوگوں کے لئے نہیں جانوں کا دیدار اور مرضیات نصیب فرمائیں۔''

سیاست سے پہلے دعوت:

مولانا دین کے تمام کاموں میں ایمان اور مذہب کے اصول و ارکان کے لئے جدوجہد اور تبلیغ و دعوت کو مقدم سمجھتے تھے اور ان کے نزدیک انہیں چیزوں سے پورے دین کو اخذ کرنے اور پوری شریعت پر عمل کرنے کی قابلیت و قوت ابھرتی ہے، اسی طرح عبادات کی درستی اور حکومت کی قابلیت پیدا ہوتی ہے اور دین کی دعوت کی کامیابی اور اس میں پوری جدوجہد سے سیاست کی قابلیت ابھرتی ہے، جس سیاست کی بنیاد دعوت پر نہیں ہے وہ سیاست بے بنیاد اور جلد زائل ہونے والی ہے۔

سیاست سے یہاں مراد کسی کام کو قوت اور اقتدار سے اور کسی ضابطہ و نظام کے ذریعہ کرانا ہے اور دعوت سے مراد محض تشویق و ترغیب اور کسی چیز کے منافع اور فضائل بتا کر اس پر شوق سے آمادہ کرنا ہے۔

مولانا کا ایک مستقل نظریہ بلکہ اسلامی تاریخ کا مطالعہ کے ذہن میں ایک خلاصہ تھا کہ امت سے صدیوں سے سیاست کی قوت و قابلیت سلب ہو چکی ہے۔

اب مدتوں پورے صبر و ضبط کے ساتھ دعوت کے اصول پر کام کرنے کی ضرورت ہے، اس کے بعد مسلمانوں میں تنظیم و اطاعت کی قابلیت، اپنے نفس خواہشات اور اپنے مصالح و منافع کے برخلاف کسی ضابطہ اور قانون کی پابندی میں کام کرنے کی قوت پیدا ہوگی، سیاست کی تھوڑی سی مقدار کے لئے دعوت کی بہت بڑی مقدار چاہیے۔ دعوت میں جس قدر کمزوری ہوگی اور جس قدر اس مرحلہ میں عجلت و تیز رفتاری سے کام لیا جائے گا، سیاست میں اسی قدر خامی، کھوکھل اور بگاڑ ہو

گا، یہ تو وہ سیاست وجود میں نہ آسکے گی یا وجود میں آجانے کے بعد اس کی عمارت زمین پر آرہے گی۔

واقعہ بھی یہی ہے، خلافت راشدہ کی قوت امر و نظم اور مسلمانوں کا ضبط و نظام اور تعمیل حکم کی قوت نتیجہ تھی اس طویل دعوت کا جو نبوت کے پہلے سے سال شروع ہوکر خلافت راشدہ تک قائم رہی اور بعد کا ضعف اور جماعتی زوال نتیجہ تھا دعوت سے اس تغافل کا جو خلافت بنی امیہ اور بنی عباس میں پیدا ہو گیا تھا۔

مولانا حضرت حسنؓ کا ایک فقرہ اکثر دہراتے تھے جو آپ نے حضرت حسینؓ سے بہ طریق وصیت فرمایا تھا کہ اس امت کا کام بطریق دعوت ہوگا۔

مولانا نے کسی ایسی جماعت میں شرکت نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا جس کا کام محض ضابطہ، سیاست اور افسری و ماتحتی کے اصول سے ہو آپ کے نزدیک موجودہ اختلافات، انتشار اور خرابیوں کا سبب ہی یہ تھا کہ دعوت سے پہلے سیاست شروع کر دی گئی ہے اور دینی کام کو طرزِ سیاست و تنظیم کے طریق سے کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اصلاح کیلئے ماحول اور فضاء کی تبدیلی ضرورت ہے

مولانا نے جس مبارک ماحول میں ابھی تک پرورش پائی تھی وہاں کی دینی غیرت و حمیت، عشق سنت اور جذبہ حفاظت شریعت اس کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ منکر کو زندہ رہنے کی فرصت دی جائے اور کسی چھوٹے معروف کی ترویج میں بھی انتظار و تاخیر سے کام لیا جائے اور حق یہ ہے کہ اسی دینی تصلب اور استقامت کا نتیجہ ہے کہ اس دینی حلقہ کے اندر بیسیوں معروفات کا رواج ہو گیا، بیسیوں منکرات دب گئے اور متعدد و مردہ سنتیں ان حضرات کی جدوجہد اور قربانیوں سے زندہ ہو گئیں۔ فجزاھم اللہ عن الاسلام خیر الجزاء۔

یہ حمیت دینی اور عشق سنت مولانا کے خمیر میں تھا اور اس ماحول میں اس کی مزید پرورش اور استحکام ہوا۔ مگر اس ماحول سے بالکل مختلف اللہ تعالیٰ نے مولانا کی بصیرت پر یہ نکتہ منکشف فرمایا کہ منکرات کے مٹانے کا یہ طریقہ نہیں کہ ایک ایک منکر کے مٹانے کے درپے ہو جائے۔ ایک منکر کے مٹانے کے لئے بعض اوقات عمریں گزر جاتی ہیں اور وہ پھر بھی نہیں مٹتا۔ کہ وہ مٹ بھی جاتا ہے تو وہ صرف ایک مقامی اصلاح ہوتی ہے اور بعض اوقات ایک دوسرا منکر پیدا ہو جاتا

ہے۔ دنیا میں اس وقت صدہا منکرات ہیں، عمریں ختم ہو جائیں تو بھی یہ سب نہیں مٹ سکتے۔ مولانا کے نزدیک صحیح طریقہ یہ تھا کہ ان منکرات سے بحالت موجودہ براہ راست تعرض نہ کیا جائے بلکہ ایمانی شعور اور دینی احساس کو بیدار کیا جائے اور معروفات کی تکثیر اور ترویج کی جائے۔

مولانا مقامی و جزئی اصلاح کے قائل نہ تھے، وہ فرماتے تھے کہ دور سے فضا بنا لئے ہوئے اور معروفات پھیلاتے ہوئے آؤ، یہ منکرات آپ اپنی جگہ پر بغیر کسی جھگڑے کے مضمحل ہو جائیں گے۔ معروفات کو جتنا فروغ ہوگا منکرات کو زوال ہوگا۔

ایک حکیم الفصرت[1] میواتی نے جو مولانا کے خاص تربیت یافتہ ہیں، مجھ سے کہا کہ ایک دن میں چھڑکاؤ کر رہا تھا۔ سب جگہ چھڑکاؤ کیا اور بیچ میں نہ کیا تھا، وہ جگہ خشک رہ گئی۔ سب طرف سے ٹھنڈی ہوائیں آئیں تو وہ جگہ خود بخود ٹھنڈی ہوگئی۔ اس وقت یہ نکتہ میری سمجھ میں آیا کہ اگر میں نے اسی جگہ چھڑکاؤ کیا ہوتا اور اس کے گرد و پیش خشک رہتے تو وہ جگہ بھی ٹھنڈی نہ ہوتی۔ اس وقت مولانا کا یہ اصول پورے طور پر سمجھ میں آیا۔ ایک گاؤں میں جہاں دین کے اثرات نہیں تھے، دین کے اثرات اور دین کی دعوت قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہونے کے لئے اسی طریقہ کے اختیار کرنے کی ایک خط میں ہدایت فرماتے ہیں:

"ان کو براہ راست خطاب کرنا چونکہ خطاب کی ناقدری شروع کر دی ہے، ٹھیک نہیں۔ اس کے پاس دو دو چار چار کوس کے جو جو گاؤں ہیں، ان سب جگہوں کے میواتی صاحبان اور چوہدریوں (سربرآوردہ لوگوں) کے حالات تحقیق کر کے ان کو جماعتیں لے جانے کی تاکید کریں اور ان کی کوشش کے اندازہ دیکھتے رہیں، اس طرح ان کے اندر صلاحیت پیدا ہو جائے گی اور پھر خطاب مفید ہوگا ورنہ پہلے سے بھی زیادہ خطرہ ہے۔"

ہمیشہ آدمی ماحول کا اثر لیا کرتا ہے، یہ ہماری تبلیغ کا خلاصہ ہے۔ عام ہوا کا اور اپنے ماحول کا ہمیشہ آدمی اثر لیا کرتا ہے، اپنے ماحول کے خلاف ہونا بہت مشکل ہے۔ اس لئے زیادہ تر کوشش عام ہوا کے بدلنے میں رکھنی چاہئے[2]۔

۱۔ [illegible] ۲۔ (بنام میاں محمد حسن صاحب فیروزپور جھرکہ)

مولانا اصل دین کی کوشش اور دین کے متفق علیہ اجزاء کی اشاعت و ترویج کو اس زمانے کے تمام فتنوں اور امراض کا علاج سنتوں کے فروغ اور ہر دینی خیر و برکت کے پھیلنے کا سبب سمجھتے تھے۔ آپ کے نزدیک صحیح ترتیب یہی تھی کہ مسلمانوں کی پوری زندگی کو ایمان اور دین کے سایہ کے نیچے لانے کی کوشش کی جائے۔ اسی سے اس کی زندگی کی چولیں بیٹھیں گی۔

ایک دوست کو تحریر فرماتے ہیں:

"ہمت کو اصل دین کے لئے بلند رکھو، ہمت کو چست کرو حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ ﷺ کی روح مبارک اس قدر سرسبز ہوگی کہ خیال و گمان وہاں تک نہیں پہنچ سکتا اور اللہ چاہے ایسی عملی ترقی دیکھو گے کہ کوئی طاقت اس کا ادراک نہیں کر سکتی"۔

ایک دوسرے گرامی نامہ میں تحریر فرماتے ہیں:

"میرے دوستو! میری کوشش کرنے سے سینکڑوں حضور ﷺ کی سنتیں زندہ ہوں گی۔ اور ہر سنت پر سو شہیدوں کا ثواب ملے گا تم خود دیکھو کہ ایک شہید کا کتنا بڑا درجہ ہے۔

ایک دوست کو جو غالباً مسلمان اہل حرفہ و اہل صنعت کی دینی اصلاح و ترقی کے خواہش مند تھے۔ تحریر فرمایا:

"اس بندہ ناچیز کی نظر کے اندر وہ تبلیغ جس کے لئے آپ کو بھی بلایا تھا اور خود بھی کوشاں ہے اس کا منتہا دنیا کے مسلمانوں میں صنعت و حرفت و زراعت و تجارت کو شریعت کے ماتحت اور شریعت کے مطابق کرنا ہے، تبلیغ کی ابجد اور الف، ب، ت عبادات ہے اور عبادات کے کمال کے بغیر ہرگز معاشرت اور معاملات تک اسلامی امور کی پابندی نہیں پہنچ سکتی۔ سو مخلصین کی صحیح اسکیم یہ ہونی چاہیے کہ تبلیغ کی ابجد الف، ب، ت یعنی عبادات کو دنیا میں پھیلانے کی اسکیم شروع کر کے اس کے منتہا پر پہنچانے کی کوشش میں لگ جائیں، معاملات و معاشرت اور باہمی اخلاق کی اصلاح و ترقی کے ذریعہ سیاست عامہ تک رسائی ہوگی، اس کے سوا کسی جزئیات میں پڑ جانا اپنے سرمایہ درد کو شیطان کے حوالے کر دینے کے سوا کچھ بھی نہیں ہے"۔

ترسم نہ رسی بہ کعبہ اے اعرابی
کیں رہ کہ تو می روی بترکستان است

ذکر تعلیم کا عمومی طریق:

اس تحریک کے اصول وارکان میں ذکر وعلم کے لفظ بار آئے ہیں جو مولانا مسلمانوں کو دیتے تھے لیکن مولانا کی تحقیق اور اصطلاح میں ذکر وعلم کے خاص معنی ہیں، اس لئے ان کی مستقل تشریح کی ضرورت ہے۔ مولانا کی اصلاحی وتجدیدی دعوت کا یہ بہت اہم شعبہ ہے۔

سارے ہندوستان اور پورے عالم اسلام میں مدت سے ذکر وتعلیم کی دو خاص اصطلاحیں اور ان کے دو اصلاحی طریقے رائج ہیں۔ ذکر کے لئے مقرر اوراد وظائف اور علم کے لئے کتابوں اور مدارس کا ایک مخصوص نظام ہے جس میں متعدد سال صرف کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، ذکر و حصول علم کو رفتہ رفتہ ان دونوں دائروں میں اس طرح محدود کردیا گیا کہ ان دونوں طریق ونظام کے بغیر ذکر وعلم کا حصول مستبعد اور تقریباً خارق عادت سمجھا جانے لگا۔

مولانا کی دعوت وتحریک کا دوسرا انقلابی وتجدیدی جز یہ ہے کہ دونوں طریقے اور نظام بہت ضروری اور بڑی خیر وبرکت کا باعث ہیں۔ لیکن یہ تکمیلی اور خصوصی درجہ ہے جس سے خواص امت اور عالی ہمت اہل طلب ہی اپنی تکمیل وترقی کرسکتے ہیں۔ لیکن امت کے لئے یہ عمومی طریق نہیں یہ اور اس راستہ سے امت کے مشغول اور عام افراد اور اس کا سواد اعظم ذکر وعلم کے منافع وثمرات اور اس کے مقاصد تھوڑے وقت میں حاصل نہیں کرسکتا، امت کا اصلی اور طبعی طریق حصول علم کا ذکر وہی ہے جو قرون اول میں تھا۔

مولانا نے قرون اول کے مسلمانوں کا بڑی غائر نظر سے مطالعہ کیا تھا، آخر وقت تک صحابہ کرامؓ کے حالات وسیر اور اخلاق وشمائل کا مذاکرہ اور دور رہا اور ان کے حالات پڑھوا کر سنتے رہے۔ صحابہ کرامؓ کے خصائص وامتیازات اور ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور جزئیات پر جتنی عمیق نظر تھی، اس وقت تک کہیں دیکھنے میں نہیں آئی۔ مولانا کا اصلی درد یہی تھا کہ اسی طرز زندگی اور اس طریق کا ذکر وتعلیم کو زندہ کیا جائے، ذکر کے متعلق مولانا کا فرمانا یہ تھا کہ غفلت تو حرام ہے لیکن ذکر، ذکر لسانی اور ذکر لفظی میں محدود نہیں، زندگی کے مختلف احوال اور اعمال واشغال کے بارے میں جو احکام وارد ہوئے ہیں، ودھیان کرتے ہوئے، ان کے مطابق ان اعمال واشغال کو انجام دینا ذکر ہے، اس طرح پوری معاشرت اور پوری زندگی ذکر میں تبدیل ہوسکتی ہے، پھر اس سلسلہ میں "ایمان احتساب" کی صفت کو زندہ کرنا اصلی اور اعلیٰ کام ہے۔ مسلمانوں میں اعمال وعبادات

کی اتنی کمی نہیں جتنی ایمان واحتساب کی ہے۔

"ذکر لسانی ولفظی کو بھی مولانا کے نزدیک دین کی جد وجہد اور حرکت وسعی کے ساتھ ضم کرنے کی خاص ضرورت ہے۔ یہی صحابہ کرامؓ کی زندگی کی ساخت تھی کہ وہ دین کی دعوت وجہاد اور دین کے فروغ کے لئے سعی وعمل کے ساتھ ذکر کو ضم کرتے تھے اور یہی اب بھی ہونا چاہیے۔ ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں۔

"حق تعالیٰ کے قرب اور اس کی کامل وفا کا سہل اور اقویٰ وسیلہ سمجھ کر ذکر میں ہوتے ہوئے اور سر بسجود ہو کر دعاؤں کی کثرت کرتے ہوئے آپ اس کام کو کرتے رہیں اور اسی طرح کرنے کی سب کو تعلیم دیتے رہیں۔ ذکر اور دعا کی کثرت اس کا پہیا ہے اور اس کی روح ہے"۔

ایک کارکن کو تحریر فرماتے ہیں:

"ذکر سے اپنی خلوتوں کو اور خلوص کے ساتھ اللہ کی نہایت عظمت لیتے ہوئے دعوت الی الحق سے اپنی جلوتوں کو مشغول رکھو، بھاری تھکی طبیعتیں مت رکھو، ہشاش بشاش چلتا پھرتا آدمی اللہ کو نہایت محبوب ہے، اور اسی کے مقابل آخرت کی فکر میں ملول بھی اللہ کو پسند ہے، حضور ﷺ کی غالب عادت رنجیدہ رہنے کی تھی"۔

ایک دوسرے خط میں تحریر فرماتے ہیں:

"ہر وقت کے لئے ان کے اپنے وقتوں کی عظمت اور حرمت میں آئی ہوئی تعریفیں اور فضیلتیں معلوم کر کے ان کا اعتقاد کرتے ہوئے کرنا یہی ان کا طریقہ ہے، ہر ایک کی فضیلتیں حدیثوں میں الگ الگ وارد ہیں، اور ہر ایک کے الگ الگ برکات وانوار ہیں، ہم جیسے عامی لوگوں کے لئے بس اتنا ہی کافی ہے کہ ہر وقت کی نماز ادا کرنے کے وقت یہ مانگ لے کہ ہر وقت کے جو برکات اور انوار ہیں ان کا اللہ تعالیٰ ہمیں حصہ نصیب کرے۔"

علم کے متعلق بھی مولانا کی تحقیق یہ تھی کہ دین کے تعلیم وتعلم کو کتابوں کے نقوش اور مدارس کے حدود میں محدود کر دینا قرون متاخرہ کا طریقہ اور امت کے بڑے طبقے کو اس دولت سے محروم کرنے کے مرادف ہے، اس طرح امت کا بہت مختصر طبقہ دین کے علم سے متمتع ہوگا اور وہ بھی

محض نظری اور ذہنی طور پر دین کے تعلیم و تعلم کا فطری اور عمومی طریقہ جس سے لاکھوں افراد بلا کسی ساز و سامان کے تھوڑے وقت میں علم دین نہیں بلکہ نفس دین حاصل کر سکتے ہیں وہ اختلاط و اجتماع، صحبت سعی و عمل میں رفاقت اور اپنے ماحول سے نکلنا ہے جس طرح زبان و تہذیب اہل زبان اور مہذب و شائستہ لوگوں کی صحبت و اختلاط سے حاصل کی جاتی ہے اور یہی ان کے سیکھنے کا فطری طریقہ ہے۔ اسی طرح دین کا صحیح علم اہل دین کی صحبت و اختلاط، رفاقت و اجتماع سے حاصل ہو سکتا ہے اور یہی اس کے حصول کا فطری طریق ہے کہ اس کے بہت سے اجزا ایسے ہیں جو قلم کی گرفت سے باہر ہیں۔ دین ایک جاندار اور متحرک شے ہے، کتابوں کے نقوش جامد ہیں، جامد سے متحرک کا حاصل ہونا قانون فطرت کے خلاف ہے۔ دین کا کچھ حصہ جوارح سے تعلق رکھتا ہے، وہ قلب سے قلب میں منتقل ہو سکتا ہے، کچھ حصہ ذہن سے، وہ بیشک کتابوں سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اسی مضمون کو ایک مرتبہ اس طرح بیان فرمایا۔

> "انسان کا ہر عضو ایک خاص وظیفہ کے لئے مخصوص ہے، آنکھ سے دیکھنے کا کام لیتے ہیں اور اس کام کے لئے وہ مجبور ہے، اس سے سننے کا کام نہیں لیا جا سکتا۔ اسی طرح بیرونی ماحول کا احساس دل کا کام ہے، دل جس چیز کا احساس کرتا ہے، دماغ کا کام اس کی تشکیل کرنا ہے، دماغ دل کے ماتحت ہے اور دل میں احساس ماحول سے پیدا ہوتا ہے۔ دماغ کی تشکیل کا نام علم ہے، دماغ اسی وقت صحیح تشکیل کرے گا یعنی علم حاصل کرے گا جب دل صحیح احساس رکھتا ہو، اور یہ احساس جامد کتابوں کی صحبت سے نہیں پیدا ہو سکتا۔ یہ تو عمل سے حاصل ہوگا، میں یہ نہیں کہتا کہ مدرسے بند کر دیئے جائیں۔ مدرسے تعلیم کی تکمیل کے لئے ہیں۔ لیکن ابتداء کے لئے موزوں نہیں [1]۔"

یہ عمل و تعلیم کے ایک ایسا علمی، مدلل اور محققانہ بیان اور ایک ایسی گہری تقریر ہے جس کو علمی طور پر اہل علم کو اپنے بحث و نظر اور تلاش و تحقیق کا موضوع بنانا چاہیے۔ مولانا کی دعوت کا یہ تعلیمی جز ایسا اہم اور ایسا انقلاب آفریں نظریہ تعلیم ہے جس پر ہمارے تعلیمی اداروں اور اہل علم کو سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا چاہیے تھا اور اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے تھا لیکن مولانا کی دعوت کے سلسلہ میں سب

1 (ارشد صاحب کا روزنامچہ سفرنامہ)

ہے کہ اسی چیز کو سمجھنے کی کوشش اور سب سے کم اسی کی طرف توجہ کی گئی۔

علم کی ترقی کے لئے مولانا کے نزدیک دوسری شرط یہ تھی۔

"یاد رکھو کوئی عالم علم میں ترقی نہیں کر سکتا جب تک وہ جو کچھ سیکھ چکا ہے دوسروں تک نہ پہنچائے جو اس سے کم علم رکھتے ہیں اور خصوصاً ان تک جو کفر کی حد تک پہنچے ہوئے ہیں۔ میرا یہ کہنا حضور ﷺ کی اس حدیث سے ماخوذ ہے (بر وکمراں باش کہ حق بر تو باشد) کفر کی حد تک پہنچے ہوؤں تک علم پہنچانا اصل علم کی تکمیل اور ہمارا فریضہ ہے اور جاہل مسلمانوں تک علم پہنچانا مرض کا علاج ہے"[1]۔

مولانا نے اس نکتہ کو خوب سمجھ لیا تھا کہ جس طرح ہر زمانہ کا ایک خاص فتنہ اور مرض تھا اس زمانہ کا خاص فتنہ اور مرض اپنی دینی حالت پر قناعت وسکون اور دنیا میں شدت انہماک اور مشغولیت ہے جس نے دین کے حصول کے لئے زندگی میں فرصت کا کوئی لمحہ نہیں چھوڑا، یہ مشاغل اور تعلقات اس زمانہ کے "ارباب من دون اللہ" اور "بتان نو" ہیں جو اپنی موجودگی میں کسی اور طرف توجہ کرنے اور اس کے اثرات قبول کرنے کے روادار نہیں، مولانا نے بڑی قوت کے ساتھ اس بات کی دعوت دی کہ دین سیکھنے کے لئے اور دین کے اثرات کو جذب کرنے کے لئے اپنے ماحول سے (عارضی طور پر) نکلنے اور ان بتوں کی گرفتاری سے آزاد ہونے کی ضرورت ہے۔ یہ مشاغل اور تعلقات قلب سے اتنے چسپاں ہو چکے ہیں کہ اگر دین کی حقیقتیں اور اثرات کے قلب میں داخل ہونے کے لئے کوئی جھروکے سے جھوٹا دریچہ بھی نہیں پاتے اور اس کی بالائی سطح سے تل کر گر جاتے ہیں۔

مولانا کے نزدیک مسلمانوں کے ہر طبقے کو دین سیکھنے اور اپنی زندگی میں حقیقی دینداری پیدا کرنے کے لئے نیز دینداروں اور علم حاصل کرنے والوں کو اپنی سطح سے ترقی کرنے کے لئے اپنے مشاغل سے کچھ وقت نکالنے اور اپنے کو اس وقت کے لئے فارغ کر لینے کی ضرورت ہے۔

مولانا کے نزدیک علم دین حاصل کرنا اور دین سے تعلق پیدا کرنا مسلمانوں کی زندگی کا اہم جز ہے جس کے بغیر مسلمان کی زندگی اس ساخت کے مخالف ہے جس پر مسلمان کی زندگی بنائی گئی، محض کھانا کمانا اور دین سے جاہل اور غافل رہنا حقیقتاً مسلمانوں کی زندگی نہیں، اسی طرح مسلمان کی زندگی میں تبلیغ اور دین کے لئے حرکت وسعی اور عملی جدوجہد کا کوئی نہ کوئی حصہ ضرور ہونا

دوسری ضرورت یہ ہے کہ اس وقت میں فضائل و مسائل کا مذاکرہ ہو۔ فضائل دینی زندگی کی روح اور اس کی قوت محرکہ ہیں۔ مسائل ان کے ضوابط و احکام ہیں اور دونوں ضروری ہیں لیکن دونوں میں وہی فرق ہے جو روح اور جسم میں ہے۔

اسی طرح صحابہ کرامؓ کے ان واقعات و حالات کا بھی مذاکرہ ہے جن سے دین کے جذبات اور ولولے پیدا ہوں اور ان کی اقتدا کا شوق ہو۔

مولانا نے تبلیغی سفر میں ان تمام خصوصیات کو جمع کر دیا۔ ان کی آرزو تھی کہ دین کی تعلیم و تعلم کا یہ عام راستہ جس سے مدارس کے شاہانہ مصارف اور وسیع انتظامات کے بغیر امت کے ہزاروں لاکھوں مشغول افراد دین کی ضروری تعلیم اور دینی تعلیم و تربیت کے اعلیٰ نتائج (جن کا اب مدارس میں بھی حصول مشتبہ ہو گیا ہے) حاصل کر سکتے ہیں، عام طور پر کھل جائے اور اس کا رواج پڑ جائے۔ ایک گرامی نامہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

"وہ طرز زندگی اگر رائج ہو جائے اور جانیں جا کر بھی اگر یہ راستہ کھل جائے تو امت محمدی کے نہایت مشغول رہنے والے لوگ اور اپنے مشاغل سے فارغ نہ ہو سکنے والے افراد کو رشد و ہدایت سے پورا پورا حصہ لینے کا طریق زندہ اور پیدا ہو جائے گا"۔

دوسرے گرامی نامہ میں فرماتے ہیں:

"جس طرح مدارس میں تعلیم اور دین سیکھنے کے لئے مستقل طریق اس کے لئے خرچ کی جاتی ہیں اسی طرح بڑے استقلال سے اس طرز سے دین محمدی کی تعلیم کے لئے وقتوں کے فارغ کرنے کی اپنے سے ابتدا کریں اور دوسروں کو دعوت دیں؛ اس کے نئے حوصلوں کو بلند کرنے کی بڑی سخت ضرورت ہے"۔

حقیقت یہ ہے کہ اس مشغول زمانے کے لئے جو غالباً پوری انسانی تاریخ میں اپنے انہماک اور شدت مشغولیت کے اعتبار سے ممتاز ہے، دین سیکھنے کے لئے اس سے زیادہ عام اور آسان عملی طریقہ نظر نہیں آتا کہ پابندی سے یا وقتاً فوقتاً اپنے مشاغل سے وقت نکال کر اور اپنے کو کچھ وقت کے لئے فارغ کر کے ایسے اجتماعات و ماحول میں یا ایسے تبلیغی قافلوں کے ساتھ رہا جائے جو اصول کے مطابق تعلیم و تعلم اور تبلیغ میں مشغول ہوں۔

ایسے سفر میں جو دینی برکات، علمی فوائد، اخلاقی تربیت، اصلاح نفس و قلب و دماغ پر جو اچھے

اثرات ہوتے ہیں، ان کو تحریر میں لانا مشکل ہے کیفیات وجذبات تو قطعاً تحریر میں نہیں آسکتے۔
ایثار، رفقاء کی خدمت، ادائے حقوق، حسن معاشرت، امارت اور دوسری خدمات کے فرائض کی ادائیگی، ذمہ داری کا احساس، مستعدی، حاضر دماغی، مختلف طبیعتوں اور مزاجوں کے ساتھ گزر، یہ سب اسلامی زندگی کے وہ شعبے ہیں جن کے احکام ہم صرف قرآن وحدیث اور فقہ کی کتابوں میں اور ان کے واقعات صرف سیرت اور تاریخ کے اوراق میں پڑھتے ہیں لیکن مدتوں سے ہماری شہری زندگی کی ساخت ایسی بن گئی ہے کہ ان میں سے بعض بعض چیزوں کی عمر بھر نوبت نہیں آتی ہمیں ان کا کوئی عملی تجربہ نہیں ہے اور بعض اوقات جب ان کا کوئی موقع آجاتا ہے تو ہم ان کے بارے میں ناکام رہتے ہیں، بسا اوقات ایک تبلیغی سفر میں ان سے اکثر یا سب چیزوں کی نوبت آجاتی ہے اور ان کی عملی تعلیم ہو جاتی ہے۔

پھر دین کو عملی طور پر برتنے، مختلف لوگوں کے ساتھ معاملہ کرنے خوش سلیقہ دینداروں اور اہل علم کے ساتھ رہنے اور سیرت نبویؐ اور صحابہ کرامؓ کے حالات کا مطالعہ کرنے سے دین کی حکمت اور سلیقہ کے ساتھ عام عقل اور سلیقہ بھی پیدا ہوتا ہے اور آدمی کا فہم اور ذکاوت حس بھی ترقی کرتی ہے۔
بعض دوستوں کو اپنے رفقاء میں اس ترقی کا احساس ہوا ہے اور انہوں نے خطوط میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔

جن اصحاب کو کسی ایسے سفر میں شرکت کا کبھی موقع نہیں ملا، ان کے لئے اس کے تاثرات کا پورا اندازہ کرنا بہت مشکل ہے، ایک سرسری اور معمولی اندازہ کے ایک معمولی سے تبلیغی سفر کی مختصری روداد پیش کی جاتی ہے جو ایک گریجویٹ دوست کے خط سے ماخوذ ہے۔ اشخاص کے نام قصداً حذف کر دیئے گئے ہیں۔

> "4 نومبر ہفتہ کے روز 3 بجے دوپہر جماعت کھڑک پور روانہ ہوئی۔ امیر جماعت ....صاحب منتخب ہوئے، جماعت 22 افراد پر مشتمل تھی جس میں سوائے ایک جماعت کے باقی تمام علاقہ وار جماعتوں کے نمائندے شامل تھے۔ اس جماعت میں دس افراد تو ایسے تھے جو پہلے (ایک تبلیغی) سفر اختیار کر چکے تھے اور باقی 14 اصحاب کا یہ پہلا تجربہ تھا"۔

کھڑک پور کلکتہ سے 72 میل دور ہے۔ تھرڈ کلاس اور وہ بھی بمبئی میل کی تھرڈ کلاس میں

تمام جماعت کا (جنگ کے زمانہ میں) نہ صرف آجانا بلکہ نہایت اطمینان سے سب کو جگہ کا مل جانا اس کام کی خاص برکات سے ہے۔

مغرب سے کچھ قبل کھڑک پور پہنچے۔ پلیٹ فارم پر نماز مغرب باجماعت ادا کی گئی۔ نماز کے بعد جماعت شہر کی طرف روانہ ہوئی۔ شہر میں داخل ہونے سے قبل حسب دستور دعا مانگی گئی، جامع مسجد میں قیام کی اجازت مسجد کے انتظامی انجمن کے صدر صاحب سے حاصل کی جا چکی تھی، کھانے کا بندوبست .... کے سپرد تھا، تمام جماعت نے اکٹھے کھانا کھایا۔ نماز عشاء کے بعد دس پندرہ منٹ تک مختصر الفاظ میں جماعت کا مقصد بیان ہوا اور حاضرین سے گشت میں شمولیت کی استدعا کی گئی۔ سونے سے پہلے تمام جماعت نے "حکایات صحابہ" میں سے چند صفحے سنے۔

تہجد کی نماز میں اکثر افراد شامل ہوئے۔ وظائف اور اشراق سے فارغ ہو کر جماعت نے ذکر کرنا شروع کیا۔ ناشتہ کے بعد ساڑھے بارہ بجے تک مسلسل تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔ اول میں نے "الفرقان" سے مولانا محمد منظور نعمانی کا وہ مضمون جو جنوری میں چھپا تھا پڑھ کر سنایا۔ یہ مضمون تحریک کے تعارف اور جماعت کے لئے ضروری ہدایات کا کافی مصالحہ رکھتا تھا۔ پھر "حکایات صحابہ" سے کچھ پڑھ کر سنایا گیا۔ اس کے بعد ہمارے ساتھ .... کے ایک قاری صاحب تھے، انہوں نے ہر ایک سے سورہ فاتحہ سنی اور تصحیح فرمائی۔ پھر فقہ کی کتاب سے وضو کے فرائض، سنن اور مستحبات یاد کرائے گئے اور سمجھائے گئے۔ اس کے بعد باری باری چند افراد سے جماعت کے چھ نمبر (اصول) سنے گئے اور ضروری تشریح کی گئی، بعد ازاں میں نے اور امیر صاحب نے اپنے سفر دہلی اور میوات کے حالات بیان کئے۔ اس تمام پروگرام میں تقریباً ساڑھے چار گھنٹے صرف ہوئے۔ پروگرام کے ختم ہوتے ہی کھانے کا وقت ہو گیا تھا

کھانے کے بعد نماز ظہر پڑھ کر مسجد میں اچھا خاصا اجتماع ہو گیا تھا۔ ان کے سامنے ایک مختصر تقریر میں میں نے گشت کے اصولوں کی تشریح کی اور جماعت گشت کے لئے روانہ ہو گئی تولیت کلام میرے، امیر صاحب اور .... صاحب کے سپرد ہوئی جماعت کے علاوہ مقامی احباب کی کافی تعداد تھی، ہر جگہ تبلیغ الحمد للہ توقع سے بڑھ کر

کامیاب ہوئی، تمام مسلمانوں نے ہماری گزارشات سنیں، گشت کرتے ہوئے ایک دوسرے محلے میں پہنچ گئے، عصر کی نماز وہاں کی مسجد میں پڑھی، نماز کے بعد مختصر تقریر میں انہیں مبلغات کے انقلاب سے خبردار کیا گیا اور وہاں کے امام صاحب کے تعاون سے جماعت تشکیل پذیر ہوئی۔ اس جماعت کو تبلیغ کا نمونہ دکھاتے ہوئے مغرب کی نماز کے وقت تک جامع مسجد میں پہنچ گئے، مغرب کی نماز میں حاضرین کی کثیر تعداد تھی خصوصاً ان بھائیوں کو دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی تھی جن سے گشت کے دوران میں درخواست کی گئی تھی، وہ نہا دھو کر اجلے کپڑے پہنے اپنی نئی زندگی شروع کرنے آئے تھے۔ اللہ تعالیٰ انہیں استقامت بخشے۔ آمین!

نماز کے بعد امیر صاحب مجھ سے تقریر کرنے کو کہا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اللہ نے مجھ سے کیا کیا کہلوایا لیکن اس کے فضل سے توقع سے زیادہ اثر ہوا، خوب جوش پھیلا اور تقریر کے بعد بغیر کسی مزید تحریک کے 125 صاحب نے اپنے نام تبلیغی جماعت کے لئے پیش کئے۔ انجمن کے صدر صاحب نے بھی اپنا نام پیش کیا اور امیر جماعت منتخب ہوئے۔ الحمد للہ علی ذلک.

چونکہ .... آج کل یہیں مقیم ہیں، انہیں جماعت کو کام پر لگانے اور اصولوں کے مطابق کام کی نگرانی کے لئے مقرر کیا گیا، اجتماع کے بعد دیر تک ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ خداوند کریم ان کے ولولے کو باقی رکھے اور ان کے ارادہ میں استقامت اور برکت دے۔ آمین

کھانے سے فارغ ہو کر جماعت اپنا اپنا سامان اٹھا کر اسٹیشن آئی اور وہیں پڑ کر سو رہے۔ ساڑھے بارہ بجے گاڑی آئی۔ الحمد للہ اس تنگی کے زمانہ میں بھی ایک نیا ڈبہ مل گیا جہاں تمام جماعت نہایت اطمینان سے سما گئی اور ...... 5 کم عمر افراد کے تو سونے کی بھی جگہ نکل آئی، فجر کی نماز ریل میں سب نے ادا کی اور خداوند کریم نے اس کے لئے تمام سہولتیں مہیا کر دیں۔ پونے آٹھ بجے صبح پور کے روز واپس پہنچے۔ پلیٹ فارم پر دعا کرنے کے بعد ایک دوسرے سے مصافحہ کے بعد جماعت کے افراد اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہوئے"۔

''اہل علم کے لئے عربیت، صحابہ کے کلام، اعتصام بالکتاب والسنۃ اور نشر دین کی تحریص کے مضامین جمع کرنے کی خصوصی اور بہت اہتمام سے فوری ضرورت ہے۔ علمی طبقہ کے لئے اس کے تیار ہونے کی بہت شدید ضرورت ہے اس کے بغیر اس تحریک میں لگنے میں عملی تھیس اور ناقابل انجبار شکستگی اور کسر کا قوی خطرہ ہے اور اسی کی خوبی اور کمی پر علمی طبقہ کا نہوض اور تعوذ بنی ہے۔ اس لائن میں بندہ ناچیز کے دماغ میں کچھ ایسے ایسے خیالات ہیں کہ قبل از وقت ہونے کی بنا پر زبان سے نکالنے کو جی نہیں چاہتا''۔

حقیقت میں اس پورے نظام دعوت تعلیم میں بڑی ترقی و تنظیم کی گنجائش ہے اور اس میں زمانے کے ساتھ چلنے اور مخالف دینی تحریکات اور دعوتوں کا مقابلہ کرنے اور عوام کے لئے ان کا بدل بننے کی بہترین صلاحیت ہے، اہل نظر جانتے ہیں کہ اس وقت کی لادینی تحریکات کی سب سے بڑی قوت یہ ہے کہ وہ عوام سے براہ راست رابطہ پیدا کرتی ہیں۔ ان کے اپنے اصول پر تربیت کرتی ہیں۔ ان کے داعی لوگ ہیں، سرگرم و متحرک ہیں، ایثار و قربانی کی روح رکھتے ہیں اپنے مقاصد کی خاطر ہر قسم کی مشقتیں برداشت کرتے ہیں ان کے پاس عوام کو مشغول رکھنے کے لئے کام ہے، یہ تمام پہلو اس وقت کی مضطرب بے چین طبیعتوں کے لئے مقناطیس کی سی کشش رکھتے ہیں۔ ان لادینی تحریکات کا مقابلہ کرنے کے لئے نہ صرف نظری فلسفے موزوں ہیں، نہ کاغذی خاکے، نہ محض دلائل و براہین اور نہ محض وہ دعوتیں جو خواص کے دائرے میں محدود ہیں اور عوام کو خطاب کرنے اور ان کو کام میں لگانے کے لئے انکے پاس کچھ نہیں، (یہ لادینی (یا کم سے کم خالص مادی) تحریکیں تمام دنیا میں آگ کی طرح پھیل رہی ہیں اور ان کی سرنگیں تمام دنیا میں بچھی ہوئی ہیں'' ان تحریکات کا مقابلہ صرف وہ دینی تحریک کرسکتی ہے جو عوام سے ربط و تعلق پیدا کرنا ضروری سمجھتی ہو۔ اس کے کارکن کسی طبقہ کو نظر انداز نہ کریں، وہ غریب کا کوئی جھونپڑا، کسان کا کوئی کھلیان نہ چھوڑیں، کارگاہوں میں جائیں، جنگلوں اور چوپالوں میں بھی اپنا خطاب کریں ان میں سرگرمی و حرکت، جفاکشی اور سخت جانی، کسی دعوت و تحریک کے پُرجوش کارکنوں سے کم نہ ہو اور خیر خواہی و دل جوئی اور سوز و دردمندی ان سے کہیں زائد ہو اس لئے کہ وہ صرف ان کی معاشی حالت بلند کرنا چاہتے ہیں اور ان کو صرف ان کی ظاہری پست حالی کا درد ہے لیکن اس دعوت کے کارکنوں کا کام اس سے کہیں زیادہ بلند اور وسیع ہے، ان کو اس خدا فراموش بہیمانہ زندگی کا درد ہے جس میں اللہ کی یہ مخلوق پڑی ہوئی ہے، انکو ان کی دینی، اخلاقی، روحانی اور ذہنی سطح بلند کرنی ہے۔ ان میں انسانیت، اسلامی شائستگی اور علم کا شوق پیدا کرنا ہے، وہ بالکل بے غرض قسم کے انسان ہوں جو اپنا بار خود اٹھائیں اور کسی پر بار نہ ہوں، ان کے پاس تہذیب و شائستگی، اخلاق اور تعلیم کے

مقاصد و نتائج پیدا کرنے کے لئے زیادہ سہل اور قابل عمل طریقے ہیں جو بغیر کسی صرف کے بہتر نتائج و اثرات پیدا کر سکتے ہیں۔ پھر وہ ان کو وہ کام سپرد کریں جو ان کو مشغول رکھے اور کبھی ختم ہونے والا نہ ہو جتنی دوسروں میں اسی کی کوشش کرتا جو دوسروں سے ان میں کی حالت کے پاس ایسا کام اور نظام ہو جو امت کے مختلف طبقات میں ربط و تعاون پیدا کرے، مقاصد کا اشتراک، ایک جگہ کا اجتماع، سفروں کی رفاقت، باہمی خدمت و اعانت، ایک دوسرے کے لئے ایثار، ان میں الفت و محبت پیدا کرے، کوئی ایسا راستہ ہو جس میں نوجوان اپنی قوت کا صحیح مصرف کر سکیں کہ یہ ان کے لئے فطری طور پر ضروری ہے، اگر ان کو صحیح کام نہ ملا تو وہ غلط راستہ پر پڑ جائیں گے۔

مولانا محمد الیاسؒ نے جو چیز پیش کی ہے اس میں یہ تمام خصوصیات موجود ہیں اور اس کے نفع میں اس سے زیادہ گنجائش ہے، وہ کوئی وقتی دعوت یا تحریک نہیں ہے بلکہ قرآن و حدیث کے فہم، سیرت و صحابہ کرامؓ کے حالات و واقعات کے علم، اصول دین سے گہری واقفیت اور خداداد بصیرت و حکمت دین کے ماتحت انہوں نے اس زمانہ میں کام کا ایک طرز پیش کیا اور قرآن و حدیث کے گہرے مطالعہ اور اپنے طویل تجربہ کی بناء پر اس کے کچھ اصول و ضوابط مقرر کئے جو سب قرآن و حدیث سے ماخوذ ہیں اور تجربہ کے بعد معلوم ہوا کہ صدہا مشکلوں پر حاوی ہیں، اب ضرورت صرف اس کی ہے کہ اللہ نے جن لوگوں کو علم دین، اخلاص اور عقل و فہم کی دولت بخشی ہے اور اس زمانہ سے بھی بے خبر نہیں ہیں وہ اس کی طرف توجہ فرمائیں اور اپنے جوش عمل، قوت تنظیم، سلیقہ، تعداد اور اصول کی پابندی اور اللہ سے ربط و تعلق کے ذریعہ اس کو ترقی دیں۔

خطرات سامنے ہیں، لادینی تحریکات جس قوت اور سرعت کے ساتھ پھیل رہی ہیں اور جو وسعت و عمومیت اختیار کر رہی ہیں اور مذہب اور اہل مذہب کے لئے ان کی طرف سے جو خطرہ ہے وہ اب کسی کے لئے راز نہیں۔ اگرچہ ہمارے دینی اور علمی حلقوں میں ابھی اس خطرہ کا پورا احساس نہیں اور عمومی دعوت، عمومی تعلیم و تربیت اور عمومی حرکت و جد و جہد کی طرف پوری توجہ نہیں۔

جو راز میکدہ میں ہے اک اک زبان پر

افسوس مدرسہ میں ہے بالکل نہاں ہنوز

فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ

اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَاُولٰۗىِٕكَ

هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝